زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890روپے

ایشیا' افریقہ' یورپ......5000روپے

امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا......6000روپے

افسانے

دوشیزہ میگزین

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com

زلزلہ
دکھ......!
غم......!
درد......!
اور
مصیبت......!
کے اس وقت میں ہم اپنے قارئین، لکھاریوں
، ایجنٹ حضرات سمیت ہر اہلِ وطن زلزلہ
متاثرین کے ساتھ ہیں۔
ادارہ اور اراکین ماہنامہ سچی کہانیاں، ماہنامہ دوشیزہ

بڑی خبر چھوٹی ذہنیت

ہم اس قدر بے حس ہو چکے ہیں کہ قہر خداوندی سے بھی خوف زدہ نہیں...... سوچیے ہم اپنے رب کی ناراضگی سے بھی پشیمان نہیں...... ناگہانی آفات قہر خداوندی نہیں تو کیا ہے؟ یہ سیلاب، زلزلے، آگ اور ان سے ہونے والی ناگہانی اموات جو کسی بھی لمحے کسی کو بھی کہیں بھی دبوچ لیتی ہیں۔ زندگی اللہ کی نعمت ہے بہت بڑی نعمت جس کا کوئی نعم البدل نہیں مگر ہم وہ لوگ ہیں جو اللہ کی اس نعمت کی بھی قدر نہیں کرتے ہیں کسی کے دکھ اور پریشانی کی ذرا برابر بھی پرواہ نہیں کرتے۔ جس رات ٹی وی پر زلزلے کی خبر چل رہی تھی۔ اینکر نے کہا پاکستان کے شمالی علاقوں میں زلزلے نے تباہی مچا دی ہے ہلاکتوں کے بڑھنے کا اندیشہ اور دوسری بڑی خبر پاکستان نے کرکٹ میچ میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے اور میں بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح حیران اور پریشان بیٹھی رہی اور اب تک نہیں سمجھ پائی کہ بڑی خبر اور چھوٹی ذہنیت میں کتنا فرق ہے۔

منزہ سہام

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کردیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آئیے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت رابطوں کی دلفریب محفل

بہت پیارے دوستو! آپ سب کو اپنی میزبان رضوانہ پرنس کا سلام قبول ہو۔ کہیے کیسے ہیں آپ سب لوگ۔ دیکھیے ایک ماہ کیسے پلک جھپکتے گزر گیا اور ایک بار پھر خوبصورت تحریروں سے مہکتا ہوا دوشیزہ ڈائجسٹ آپ کے ہاتھوں میں مسکرا رہا ہے ویسے دوستو! اس خوبصورت فیکٹ کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا کہ مسکراہٹ انسان کی شخصیت کو مکمل کرنے میں بہت اہم رول پلے کرتی ہے۔ ایک بے حد سنجیدہ اور بیزار اور منہ بنائے ہوئے شخص کے مقابلے میں ایک مسکراتا ہوا مہربان سا چہرہ خود بخود لوگوں کو اپنی طرف اٹریکٹ کرتا ہے۔

کتنا اچھا لگتا ہے ایک عام سا چہرہ بھی
ایک محبت بھرا تبسم لب پہ لانے سے

تو ڈیئر فرینڈز خود خوش رہیے اپنے اطراف خوشیاں بانٹنے اور چہرے پر ایک پیاری سی مسکان سجا کر لوگوں سے ملیے یقین جانیے زندگی خود بخود خوبصورت لگنے لگی گی اور ہاں جناب دوشیزہ کا سالگرہ نمبر جنوری میں آرہا ہے ہمیں امید ہے کہ اپنی تحریروں کے ذریعے آپ لوگ اس کی سالگرہ میں اپنی شرکت یقینی بنائیں گے۔ اب ہم چلتے ہیں اپنے پیارے سے مہمانوں کی طرف جو پیار اور خلوص کے تحفوں کے ساتھ ہمارے منتظر ہیں۔

ہماری پہلی پیاری مہمان ہیں کراچی سے شگفتہ شفیق ڈیئر اچھی پیاری رضوانہ السلام علیکم بے حد حسین ٹائیٹل کے ساتھ اکتوبر کا دوشیزہ کا شمارہ ملا۔ پڑھ کے دل باغ باغ ہو گیا، بہترین افسانے، ناول اور ناولٹ سے سجا دوشیزہ ہمیشہ سے زیادہ پسند آیا۔ باتیں ملاقاتیں کے تحت سارے موضوعات بہت عمدگی سے سیٹ کیئے گئے تھے دوشیزہ میگزین بھی خوب رہا۔ لیکن منزہ سے شکایت ہے کہ وہ ایسے اموشنل اداریے نہ لکھیں پلیز کہ خوا مخواہ میں دل کو کچھ کچھ ہونے لگے۔ یار کاش کہ ہم سب مل کر ہی کوئی حل نکال سکتے تو کتنا اچھا ہوتا لیکن عام عوام کے مقابلے میں بڑا اسٹیبلیشمنٹ ہے تو ہار ہی فی الحال ابھی اپنا مقدر بنی جا رہی ہے۔ بہر حال منزہ میرے دل میں تو درد جگانے میں کامیاب رہی ہیں۔ دعا ہے کہ حکومت کے کان پر بھی جوں رینگے (آمین) ایک خوشی کی خبر میں اپنے پیارے دوستو اور قارئین وشامل کرنا چاہتی ہوں کہ ۱۸ اکتوبر کو میرے بیٹے کا نکاح میرے تایازاد بھائی کی بیٹی کے ساتھ انجام پایا۔ فی الحال نکاح ہوا ہے رُخصتی کچھ عرصے کے بعد ہوگی انشاء اللہ۔ کنزل کی شادی اور فرخ کے نکاح کا تصویری احوال بھیج رہی ہوں کہ بہت لوگوں نے تصاویر کی فرمائش کی ہے۔ اپنی نئی غزل بالکل تازہ کلام بھی حاضر ہے۔ سارے پیارے دوستو کی مبارک بادوں کا بہت شکریہ اور سلام، دل سے دعا ہے کہ آپ سب کو ہمیشہ اللہ اپنے فضل سے نوازے (آمین) اب اجازت اللہ حافظ۔

ﮬ: پیاری سی شگفتہ! ہمیں اُمید ہے کہ قارئین شادی کی ان پیاری پیاری تصاویر کو بہت پسند کریں گے ہم

سب کی طرف سے اپنے دونوں بچوں کی نئی زندگی کی شروعات پر ایک بار پھر ڈھیر ساری مبارکباد۔

✉: شینا گل راولپنڈی سے ہماری مہمان بن کر آئیں ہیں رضوانہ پرنس جی میں ایک نئی رائیٹر ہوں پاکیزہ میں میرے دو افسانے شائع ہو چکے ہیں اور اب میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں دوشیزہ کے لیے بھی کچھ لکھوں۔ میں نے آپ کے متعلق بہت اچھا سنا ہے کہ آپ نئے رائیٹرز کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں پلیز مجھے بتائیں کہ کیا اسٹوری لکھنے کے لیے آپ کی کوئی ڈیمانڈ ہے مجھے امید ہے کہ آپ مجھے سپورٹ کریں گی۔

ھ: بہت پیاری شینا۔ ارے بھئی اس میں پوچھنے کی بھلا کیا بات ہے۔ بس فٹافٹ اپنے افسانے ہمیں بھجوا دو اور ہر اچھی تحریر اپنا آپ خود منوالتی ہے اسے کسی سپورٹ کی ضرورت نہیں پڑتی بس تم بھی اس شعر کی تفسیر بن جاؤ۔

پھول کو شور مچاتے کبھی دیکھا ہے قمر
تم ہو خوشبو تو بتانے کی ضرورت کیا ہے

✉: دانیہ آفریں امتیاز کراچی سے پہلی بار ہم سے ملنے آئیں ہیں۔ رضوانہ جی السلام وعلیکم پہلی بار آپ کی محفل میں شریک ہو رہی ہوں میں نے ابھی حال ہی میں لکھنا شروع کیا ہے۔ میرے آٹھ افسانے اور ایک ناولٹ دو مختلف ڈائجسٹوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب میں دوشیزہ کے لیے کچھ لکھنا چاہتی ہوں لیکن ایکچو لی میں آپ کو اپنی تحریریں بھجواتے ہوئے کچھ کنفیوز ہو رہی ہوں کیونکہ میں نے سنا ہے کہ دوشیزہ میں رسپانس بہت ہی دیر سے ملتا ہے۔ پلیز جواب ضرور دیجیے گا۔

ھ: ڈیئر رانیہ محفل میں خوش آمدید یقین جانیے ہم نئی رائیٹرز کی دل سے حوصلہ افزائی کرتے ہیں آپ فوراً اپنی تحریریں ہمیں ارسال کر دیں اور ہاں سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کیجیے ہم کتنی جلدی رسپانس دیتے ہیں یہ تحریر بھیجنے کے بعد آپ کو خود ہی پتا چل جائے گا۔

✉: اور یہ ہیں ہماری چھوٹی سی کیوٹ سی دوست ماہین خاور جو سیالکوٹ سے ہمیں لکھ رہی ہیں۔ بہت پیاری رضوانہ باجی میں نے اپنے خط کا جواب پتا نہیں کتنی بار پڑھا اور ہر بار ایک نئی خوشی دل میں اترتی محسوس ہوئی تھینک یو رضوانہ باجی اب میں آپ سے بالکل ناراض نہیں ہوں۔ اس بار دوشیزہ میں فواد خان کا انٹرویو بہت اچھا لگا لیکن کاش یہ کچھ اور تفصیلی ہوتا۔ ناولٹ محبت درد دیتی ہے مجھے پسند آیا اور افسانے تو سب ہی بہترین تھے۔ ندا حسنین کی ایک ملاقات اور ماہ وش طالب کی چال خاص طور پر اچھی لگیں۔ بڑے وہ ہیں والی

زینی کی طرح ایک خاتون کو میں بھی جانتی ہوں بس اللہ معاف کرے ایسے لوگوں کو۔ رضوانہ باجی دیکھے خوشی میں تبصرہ بھی اچھا لکھا ہے نا......؟

ھ: ماہین بیٹا! تمہاری معصوم سی خوشی دیکھو تو سہی پوری محفل میں ایک بہار سی لے آئی ہے۔ جیتی رہو۔

✉: کراچی سے ریحانہ مجاہد مسکراتے ہوئے ہم سے کہہ رہی ہیں ڈیئر رضوانہ پرنس السلام وعلیکم اکتوبر کا شمارہ پوری آب تاب کے ساتھ ملا۔ اس شمارے کی جگمگاہٹ نے بتا دیا کہ آپ لندن سے واپس آ گئیں ہیں۔ ورنہ پچھلے شماروں میں 'کچھ' کمی' کا احساس ہو رہا تھا جواب نہ تھا۔ رفعت سراج اور اُم مریم کے ناولٹ اپنی کشش برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ افسانوں کی سلیکشن نے دل موہ لیا خاص طور پر ندا حسنین کا افسانہ ایک ملاقات بہت عمدہ رہا۔ باتیں ملاقاتیں میں اپنی پسندیدہ اداکارہ اریج فاطمہ اور اداکار فواد خان کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ نئے لہجے کی غیر حاضری محسوس ہوئی خاص طور پر انزا نقوی کی غزل یا نظم کی۔ پیاری رضوانہ آپ کو اور منزہ کو اور تمام اسٹاف کو سلام اور دعا۔

ھ: اچھی ریحانہ! ہماری اور منزہ کی پوری کوشش ہے کہ دوشیزہ خوب سے خوب تر ہو جائے۔ اور تم لوگ اسے اپنے ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھو۔ نئے لہجے کی غیر حاضری پر معذرت اس ماہ تمہیں تمہاری فیورٹ انزا نظر آ رہی ہیں نہ؟

✉: آیئے ملتے ہیں فوزیہ احسان رانا سے جن کے ناول کی آخری قسط آپ اس ماہ پڑھیں گے السلام وعلیکم رضوانہ پرنس آپ کیسی ہیں آپی۔ اکتوبر کا ڈائجسٹ میرے ہاتھ میں ہے۔ ٹائٹل بہت خوبصورت ہے 'محبت درد دیتی ہے' فلزا اور شیزا کی کہانی۔ اُف اتنا متکبرانہ انداز فلزا کا۔ انجام پہلے ہی پتا تھا، نفیسہ سعید ایک بڑا نام ہے نفیسہ کا دوشیزہ میں آنا خوش آئند بات ہے بینا عالیہ ٹوانہ کا ناول اختتام پذیر ہوا اچھی اینڈنگ تھی۔ اُم مریم منجھی ہوئی لکھاری ہیں۔ بہترین انداز بیان کے ساتھ ناول آگے بڑھا رہی ہے۔ رفعت سراج کی تعریف کرنا تو گویا سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے ارج گل رانا کے ناولٹ نے رُلا کر رکھ دیا۔ عمودی چٹان، چال اور بڑے وہ ہیں اچھی تحریریں ہیں۔ ندا حسنین پہلی بار 'ایک ملاقات' کے ساتھ آئی اور چھا گئی سلماں اور کہکشاں کے جذبات کی ان کے جلن اور حسد کی جس طرح ندا نے تصویر کشی کی ویلڈن ڈیئر اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ ہم بہت کچھ کہنا چاہ رہے ہوتے ہیں مگر اپنی مصروفیات کی وجہ سے کہہ نہیں پاتے مجھے آج کہہ لینے دیجیے کہ میں نے سنبل اور رضیہ مہدی کی تحریریں جب جب پڑھیں میں متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی مگر میں سنبل کو کبھی نہیں بتا پائی کہ ان من موہنی سی دوشیزہ کی تحریریں مجھے بہت پسند ہیں۔ مجھے رضیہ مہدی کو بھی بتانا ہے کہ ہمیشہ میں نے وہ درد محسوس کیا جو آپ کی کہانی کی عورت سہتی ہے اللہ آپ کو صحت وتندرستی عطا کرے۔ فریدہ فری ڈیئر بہت شکریہ اتنی محبت کا۔ میں بھلا تم سے کیوں ناراض ہونے لگی۔ صفیہ سلطانہ مغل کیسی ہیں آپ، بیٹے کی شادی بہت بہت مبارک ہو۔ مجھے 'لمحوں نے خطا کی تھی' کے حوالے سے کچھ کہنا ہے یہ میرا دوسرا طویل ناول ہے میرا پہلا ناول ابھی ادھورا ہے تو وجہ ہے کہ 'لمحوں نے خطا کی تھی' میں میری دلچسپی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اُجالا، فاخرہ کا کردار میرا پسندیدہ کردار ہے۔ فاخرہ کے جذبات اس کے دکھ مجھے بھی اتنا ہی آزردہ کرتے رہے جتنا فاخرہ رنجیدہ تھی بنیادی طور پر یہ مکافات عمل کی کہانی تھی کچھ لوگ دوسروں کی زندگیوں کے

فیصلے اپنے ہاتھوں لکھنے لگ جاتے ہیں رحمان بھی ایسا ہی کینہ پرور انسان تھا جس نے اجالا سے سب کچھ چھین لیا مگر بھول گیا کہ تقدیر لکھنا انسان کا نہیں اللہ تعالیٰ کا کام ہے امن ٹھوکر کھا کر گری تو ملال اور پچھتاوں میں گھر گئی فاخرہ کی صورت اُسے مسیحا مل گیا وہ ہدایت پا گئی فروہ غلط راہوں کی مسافر بنی تو اسے ہدایت نصیب ہوئی۔ موت اس کا مقدر بن گئی۔ فاخرہ کی اعلیٰ ظرفی اور وسعت قلبی نے اسے جینی عورت بنا دیا اس نے صبر کیا بہت صبر کیا اللہ نے اس کی اولاد کو نیک اور سعادت مند بنا دیا۔ اس سے بڑا اجر اور کوئی نہیں ہوتا فاخرہ سرخرو ہوئی فاروق ترمذی کو محبت کی آہ لگ گئی۔ محبت نے اُسے معاف کر دیا۔ سب کردار اپنے انجام کو پہنچے۔ میں تہہ دل سے مشکور ہوں دوشیزہ کے مدیر کاشف چوہان کی جنہوں نے میری صلاحیتوں پر بھروسہ کیا میں بہت محبت سے شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ سدرہ مرتضی کا جس نے میری ہر قسط پڑھ کر اسپیشلی مجھے بتایا سراہا۔ رضوانہ کوثر، خولہ عرفان، نفیسہ سعید، فریدہ فری، مسز نوید ہاشمی، نداحسنین، فہیم انجم، فریحہ شبیر، سنبل، فرح عالم، صدف آصف منعم اصغر، جس جس نے بھی اپنا قیمتی وقت نکال کر میری تحریر پڑھی میں ان کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ رضوانہ پرنس اور کاشی چوہان سب پڑھنے والوں کو میرا مودبانہ سلام اجازت چاہوں گی۔

ھ: ڈیئر فوزیہ! آپ کا ناول قارئین نے پسند کیا اس کے لیے مبارک باد۔ اُمید ہے آئندہ آپ کی تحریریں ہمیں موصول ہوتی رہیں گی۔

✉: اور یہ ہیں ہماری بے حد پیاری رائیٹر سعدیہ عزیز آفریدی جو بہت عرصے سے بعد ملنے آئی ہیں۔ ڈیئر رضوانہ پرنس اتنے عرصے بعد ملے تو محسوس ہوا تھا شاید محبت کے انداز میں کچھ نہ کچھ تو فرق پڑا ہوگا لیکن جس طرح تم نے گلے لگایا اور دوشیزہ میں لکھنے کے لیے نئے سرے سے اُکسایا وہ اچھا لگا دوشیزہ سے میرا رشتہ پرانا نہ سہی، لیکن عزت اور ساتھ نبھانے کا ہے۔ اب میں کم لکھ رہی ہوں لیکن دوشیزہ کے لیے ضرور لکھتی رہوں گی۔ سب اپنے پرانے لکھنے والوں کو بہت سلام اور دعائیں میری دعا ہے کہ سہام صاحب اور اب منزہ کا لگایا ہوا یہ درخت ہمیشہ سر سبز و شاداب رہے۔

ھ: بہت پیاری دوست ہم سب تمہیں دل سے خوش آمدید کہتے ہیں اور قارئین کے لیے یقیناً یہ خوشی کی خبر ہے کہ اب انہیں دوشیزہ میں تمہاری تحریریں پڑھنے کو ملا کریں گی اور ہم نے اپنی دوست کو ہی نہیں ایک رائیٹر کو بھی گلے لگایا تھا جو نہ جانے قلم سے کیوں ناطہ توڑے بیٹھی تھی۔

✉: ہماری پیاری مصنفہ شمیم فضل خالق اپنے پیارے سے تبصرے کے ساتھ محفل میں موجود ہیں۔ ڈیئر رضوانہ پرنس سدا خوش رہیے۔ السلام وعلیکم اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گی ہمیشہ تو میں کاشی کے نام خط لکھا کرتی تھی لیکن جب پچھلی بار آپ نے محفل میں میرے خط کا جواب دیا تو میں نے سوچا کہ اب خط آپ کے نام لکھنا چاہیے۔ امید ہے آپ لندن سے آچکی ہوں گی۔ اب ذرا دوشیزہ پر تبصرہ ہو جائے۔ فہد مرزا سے سوال جواب دلچسپ رہے۔ اے آر وائی کے پروگراموں پر ہر ماہ تبصرہ ہوتا ہے۔ رضوانہ...... بے چارے ہم نے کیا قصور کیا ہے اس کے پروگراموں کو کسی مہینے اپنے اوراق کی زینت بنایئے نا......؟ اتنے اچھے ڈرامے ہوئے ہیں اُس کے، رفعت سراج کا ناول 'دام دل' خوبصورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ہر ماہ پڑھنے والوں کو اس کا انتظار رہتا ہے رومیلہ خان کا افسانہ تھینک یو اللہ میاں، بہت اچھا لگا۔ اُم مریم کا ناول رحمان رحیم

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ
آپ کی نظر میں اس ماہ ''دوشیزہ'' کی بہترین تحریر کون سی ہے؟
نومبر 2015
دوشیزہ
عنوان:
قلم کار:
نام:
پتا:
ماہنامہ دوشیزہ کراچی
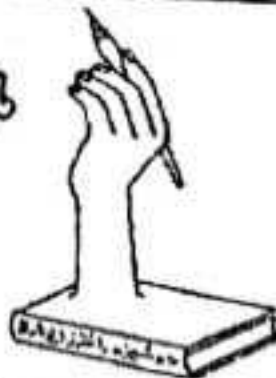
سداسائیں ہر قسط میں اپنی دلچسپی قارئین کے دلوں میں بڑھاتی ہے زمر نعیم ہمیشہ اچھا لکھتی ہیں اس بار بھی بہت اچھا لکھا۔ الماس روحی کا افسانہ، بڑے سرکار، بہت پسند آیا...... کیا سچی تصویر کشی کی ہے مستقبل کی...... واقعی آخر میں بندہ سرکار نہیں رہتا بس بڑا ہوتا ہے۔ حنا بسری کا بحر آگہی، دلچسپ تو تھا لیکن حوریہ کا کردار قدرے کنفیوز کردینے والا تھا۔ وہ حمزہ پر ویسی سختی نہیں کررہی تھی جو کرنی چاہیے تھی، راحت وفا راجپوت کا افسانہ پاگل آنکھوں والی لڑکی میں محبت کی خوبصورتی نمایاں ہے۔ تیرے عشق نچایا زبردست ناول تھا جو دوشیزہ کے ہر شمارے کی جان ہوا کرتا تھا میرے سمیت ہر پڑھنے والے کو ہر ماہ دوشیزہ کا انتظار اس ناول کی وجہ سے ہوا کرتا تھا۔ اس ناول کا تعیم زبردست تھا۔ یعنی کے بندے پر خدا کا یقین مضبوط ہونے لگتا ہے اور یہ صرف بینا صرف اور صرف تمہارے قلم کی جادوگری ہے۔ اگر تم تنقید کے ڈر سے لکھنا چھوڑ و گی تو یہ تمہاری ہار ہوگی...... تم لکھو...... اپنی قلم کی خوبصورتیاں بکھیرو...... تنقید سے مت گھبراؤ۔ باقی افسانے رہ گئے ہیں، معذرت۔ مکمل ناول بھیج رہی ہوں پلیز جلدی شائع کردیجیے۔ شکریہ۔ رخسانہ سہام مرزا، منزہ سہام، کاشی چوہان سب کو میرا سلام۔

ھ: شمیم جی! آپ کا یہ تبصرہ ایک ماہ پرانا ہے اس ماہ کے رائیٹرز کو منانا اب آپ کا کام ہے آپ کا مکمل ناول بہت ہی جلد دوشیزہ کی زینت بنے گا۔

✉: منعم اصغر ڈیرہ غازی خان سے لکھتے ہیں دوشیزہ کے پورے اسٹاف رضوانہ آپی اور دوشیزہ کی محفل میں موجود تمام لوگوں کو میرا سلام اس بار دوشیزہ بارہ کو ملا۔ ٹائٹل خوبصورت تھا سب سے پہلے دوشیزہ کی محفل میں قدم رکھا جہاں سب کے محبت ناموں نے محفل کو آٹھ چاند لگائے ہوئے تھے۔ خاص کر زمر نعیم، فرحین اظفر، (آپ کو دوشیزہ میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی آئندہ بھی آتی رہے گا) پیاری آپا نفیسہ سعید، رُخ چوہدری، رضوانہ کوثر (آپ کی دعاؤں کے لیے میں تہہ دل سے مشکور ہوں۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے) پیاری رائیٹر بینا عالیہ اور ندا حسنین کی آمد نے سچ مچ خوش کردیا۔ باقی تبصرے بھی خوب تھے۔ نفیسہ آپا اپنے لیٹر میں میرا دل خوش کردیا۔ آپ ہمیشہ سلامت رہیں آمین۔ اب کہانیوں کی طرف آؤں گا۔ فہرست میں نفیسہ سعید اور ندا حسنین کو دیکھ کر خوشی ہوئی سب سے پہلے بھی انہی کو پڑھا۔ 'محبت درد دیتی ہے' فلزا اور شیزا کے گرد گھومتی ایک دلچسپ تحریر جس میں کئی سبق پوشیدہ تھے۔ ماں باپ کو شروع ہی سے اولاد کو برابر رکھنا چاہیے۔ خیر ہادی اور شیزا کو ملا کر فلزا کو عقل دلا کر بہت خوبصورت اینڈ کیا۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا مبارک باد آپا نے مجھے ہر ماہ آپ کی ایسی تحریریں دوشیزہ میں چاہیے امید ہے اپ اپنے چھوٹے سے دوست کا کہا نہیں ٹالیں گی اب آتے ہیں 'ایک ملاقات' کی طرف یہاں بھی ندا نے کمال کردیا میں نے اپ کو تو زیادہ پڑھا ہی نہیں مگر ایک دو تحریروں نے ہی مجھے آپ کا فین بنا ڈالا۔ اس ایک افسانے میں وہ سب کچھ تھا جو ایک کہانی میں ہونا چاہیے۔ بیسٹ الفاظ کا چناؤ، منظر کشی، مکالمے اور سب ایک سے بڑھ کر ایک سبق آموز، ویلڈن ندا اپ میدان مار لیا۔ اُف تبصرہ لمبا ہوگیا مختصر یہ ہے کہ 'مورے پیا بھی ایک خوبصورت ناولٹ تھا دام دم اور تیرے عشق نچایا کا اینڈ خوبصورت تھا۔ اگلے ماہ کوئی نیا ناول ہوگا۔ افسانے بھی تینوں خوب تھے۔ میرا ناولٹ اس ماہ بھی نہیں تھا پانچ ماہ ہو گئے بھیجے ہوئے، اب تو لگتا ہے کہ کبھی آئے گا ہی نہیں، میری درخواست ہے کہ جواب میں مجھے اپنے ناولٹ کے بارے میں آگاہ کردیا جائے کہ قابل اشاعت ہے یا نہیں اب اجازت دیں اس دعا کے ساتھ کہ اللہ دوشیزہ کے ہر

قاری ولکھاری کو اپنی حفظ و امان میں رکھے دوشیزہ یوں ہی ترقی کرتا رہے، جنوری میں دوشیزہ کی برتھ ڈے مبارک۔

ھ: ڈیئر منعم! اگر اس ماہ تمہارا ناولٹ نہیں چھپا تو ہرگز دل چھوٹا مت کرو۔ جانتے ہو مایوسی انسان کی صلاحیتوں کے لیے زہر قاتل کا درجہ رکھتی ہے۔ بس تم فٹافٹ ہمیں ایک اور اچھا سا افسانہ لکھ کر بھیجو ہم منتظر ہیں تمہارے اندر لکھنے کی صلاحیت موجود ہے پلیز اُسے ضائع مت کرنا۔

✉: سعدیہ عابد کراچی سے ہماری محفل میں آئی ہیں۔ ماہ اکتوبر کے پرچے پر تبصرہ حاضر ہے۔ تمام مستقل سلسلے (دوشیزہ گلستان سے لے کر بیوٹی گائیڈ تک) ہمیشہ کی طرح خوبصورت ترین تھے۔ رفعت سراج اور بینا عالیہ کے سلسلے وار ناول بڑی خوبصورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں مگر جہاں تک اُم مریم کے ناولٹ کی بات ہے خوبصورت تحریر مگر جمود کا شکار بڑھتی ہوئی فضول طوالت کا احساس ہوتا ہے اس تحریر میں مصنفہ کے قلم کی جادوگری کے علاوہ کوئی خاص کشش محسوس نہیں ہوتی۔ اس دفعہ تمام ناولٹ ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ نفیسہ سعید کی درد یلی محبت اور فوزیہ رانا کی لمحوں کی خطا دونوں ناولٹ بہترین تھے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ہو۔ افسانوں کے ذکر خیر کے بنا تبصرہ نامکمل ہی ٹھہرے گا ایک ایک افسانہ لکھاری کی محبت کا ثبوت ہے تمام افسانے خوب سے خوب تر روبینہ شاہین اور منزہ ہاشمی سب افسانوں میں بازی لے گئیں دعا ہے کہ دوشیزہ یونہی دن بدن ترقی کی منازل طے کرتا قارئین کے دل میں ہمیشہ اپنا مقام قائم رکھے آمیں۔ اب اجازت چاہیں گے زندگی بخیر اگلے پرچے پر تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گے بالفرض اس ناچیز کا یہ تبصرہ دوشیزہ کی زینت بن جائے۔

ھ: پیاری سعدیہ! خوش آمدید ہمیں اُمید ہے کہ اس ماہ کے شمارے کے لیے بھی آپ کا تبصرہ بروقت آئے گا۔

✉: ہماری نئی رائیٹر تنزیلہ زاہد نے کراچی سے ہمیں تبصرہ بھیجا ہے۔ رضوانہ جی کیسی ہیں آپ دوشیزہ اس بار جلدی ملا۔ زمر نعیم کو اکتوبر کا ایوارڈ جیتنے پر بہت مبارک باد ان کی تحریر عمدہ ہوتی ہے اور وہ اس ایوارڈ کے مستحق ہیں مہوش طالب نئی افسانہ نگار ہیں چال کی کہانی میں انہوں نے اچھا میسج دیا ہے۔ فوزیہ احسان کا ناولٹ اچھا جا رہا ہے۔ اب دیکھیے اجالا کے ساتھ آگے کیا ہوتا ہے۔ نفیسہ سعید کی کہانی بھی اچھی تھی اور ہاں فواد کا انٹرویو پڑھ کر اچھا لگا۔ اب اجازت چاہوں گی انشاء اللہ اگلی بار افسانے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔

ھ: ڈیئر تنزیلہ! یہ تو اچھی خبر ہے کہ اگلے ماہ آپ افسانے کے ساتھ آئیں گی۔ لکھنا شروع کر دیا نہ......؟

✉: ایمان علی ہماری نئی مہمان ہیں اور ہم سے پوچھ رہی ہیں۔ میں آپ کے پرچے میں افسانہ ارسال کرنا چاہتی ہوں آپ کے ادارے کے اصول و شرائط کیا لازم ہیں۔

ھ: ایمان! آپ افسانہ ضرور بھیجیں اس سے پہلے ایک بار آپ دوشیزہ میں چھپے افسانوں اور ناولٹ کو ضرور پڑھ لیجیے گا تو آپ کو خود بخود اصول و شرائط کا علم ہو جائے گا ہم نے نئے رائیٹر کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی ہے اور معیاری تحریروں نے خود اپنی جگہ بنائی ہے۔

✉: پیاری سی رضوانہ کوثر ہماری دیرینہ ساتھی نے لاہور سے ہمیں تبصرہ بھیجا ہے۔ ڈیئر رضوانہ اکتوبر کا

دوشیزہ...... سرورق خوبصورت محفل عروج پہ۔ دام دل بہت خوب، بینا عالیہ کا ناول بہترین ان کو مبارک باد، رحمان رحیم سدا سائیں اچھا ہے، فوزیہ احسان کا ناول خاصا دلچسپ صفیہ سلطانہ کی تحریر بہت خوب رہی نگہت اعظمی کا نام خاص ہے۔ مہوش اور ندا اچھا اضافہ ہیں قلم قبیلہ میں، تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔

ھ: پیاری سی رضوانہ! آپ کے خط میں اس بار سب اچھا اچھا رہا ہم جانتے ہیں کہ آ کل آپ کی طبیعت ناساز چل رہی ہے تب ہی تبصرہ جلدی میں لکھا نظر آ رہا ہے اللہ آپ کو جلدی سے صحت یاب کرے۔ (آمین)

✉: لاہور سے ہماری پیاری سی رائیٹر زمر نعیم اپنے تبصرے کے ساتھ ہماری محفل میں تشریف لا رہی ہیں ڈیئر رضوانہ اس بار دوشیزہ معمول سے ہٹ کر لگا۔ منزہ کا اداریہ نمکین پانی آنکھوں میں بھر لایا۔ محفل میں آ کر بہت خوشی محسوس ہوتی ہے اس بار صفیہ سلطانہ مغل کا تبصرہ اور رنگ کائنات میں ان کی تحریر بہت پسند آئی آپ لوگوں نے انٹرویو کا جو نیا سلسلہ شروع کیا ہے وہ زبردست ہے شگفتہ شفیق کو بیٹے کا نکاح اور بینا عالیہ کو کامیاب ناول لکھنے کی ڈھیروں مبارک باد۔ افسانوں میں عمودی چٹان اور چال زیادہ پسند آئے ویسے سارے ہی افسانے بہت اچھے رہے۔ 'محبت درد دیتی ہے' پڑھ کر محسوس ہوا جیسے یہ پہلے بھی کہیں پڑھا تھا کبھی کبھی کہانیوں میں کافی مطابقت بھی ہو جاتی ہے شاید یہ بھی ایسا ہی کوئی اتفاق ہے اپنا نیا ناول جلد ہی روانہ کروں گی۔

ھ: اچھی زمر! آپ کے تبصرے کا سب ہی کو انتظار رہتا ہے آئندہ ذرا جلدی بھیجیے گا ہم آپ کے ناول کے منتظر ہیں۔

✉: کراچی سے ندیا مسعود جو ابھی حج کی سعادت حاصل کر کے لوٹی ہیں۔ خوشی سے جگمگاتے چہرے کے ساتھ ہمیں بتا رہی ہیں کہ ڈیئر رضوانہ حج ایک بہت بڑی سعادت ہے۔ جس کو ادا کرنے کے بعد انسان اپنے اندر بہت بڑی تبدیلی محسوس کرتا ہے مجھے اس لمحے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اللہ کے بہت قریب ہوں یقین جانو اللہ سے دل کی گہرائیوں سے معافی مانگتے ہوئے اپنی بہت چھوٹی چھوٹی سی خطائیں بھی بے اختیار یاد آتی گئیں۔ جن کی میری نظر میں کوئی اہمیت ہی نہیں تھی جب ہم حج پر جا رہے تھے تو دل میں کچھ ڈر تھا 50 ڈگری ٹمپریچر کا خوف دامن گیر تھا لیکن وہاں جا کر ذرا سی بھی پریشانی نہیں ہوئی۔ اگر قافلے کا گائیڈ اچھا ہو تو پھر کوئی مشکل نہیں ہوتی اور ہر کام آسانی سے ہوتا چلا جاتا ہے۔

ھ: بہت پیاری ندیا! سب سے پہلے تو ہم سب کی طرف سے حج کی بے شمار مبارکباد قبول کرو۔ تمہاری باتوں نے محفل میں بڑا مقدس سا اجالا بکھیر دیا ہے۔

✉: اور یہ ہیں ہماری ثمینہ عرفان جن کے مزاج میں کچھ گرمی نظر آ رہی ہیں ڈیئر رضوانہ پرنس کس میں ہمت ہے جو سچی بات سنے۔ محترمہ نفیسہ سعید کی خدمت میں عرض ہے۔

کسے معلوم تھا اس شے کی تجھ میں کمی ہوگی
گماں تھا تیرے طرز جبر میں شائستگی ہوگی

محترمہ لفظ 'آٹو' آپ کے ذہن کی اختراع نہیں سمجھا تھا بلکہ ہندی زبان سے متاثر ہونا سمجھ کے لفظ آٹو لکھنے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا مجھے نہیں پتا کہ آپ عمر کے کون سے حصے میں ہیں آج کل کے نوجوان نسل اور اس نسل کے لکھاری اپنی اردو زبان میں ہندی الفاظ و آمیزش بڑے فخریہ انداز میں کرتے ہیں آپ کو مجھے

"آپ کی رائے اہم ہے"

دوشیزہ اپنے پڑھنے والوں کی رائے کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنے دوشیزہ ڈائجسٹ میں کیا دیکھنا چاہتے ہیں، ہمیں بتائیں۔ وہ کون سے سلسلے ہیں جن کی آپ کمی محسوس کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ ہر ماہ پابندی سے دوشیزہ کی زینت بنیں۔

دوشیزہ اپنے پڑھنے والوں کی بے انتہا قدر کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ آپ ہر لمحے ہماری رہنمائی کریں تاکہ دوشیزہ کو مزید نکھارا جاسکے۔

بتانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے لفظ آٹو رکشہ کے لیے استعمال ہوتا ہے پاکستان میں ہمیشہ سے رکشہ کہا گیا ہے اور ہندوستان میں آٹو اور آپ کا تعلق پاکستان سے ہے۔ آپ نے فرمایا میں اپنے الفاظ لکھنے میں آزاد ہوں تو محترمہ خدا کا شکر ادا کیجیے کہ آپ کو ایک آزاد وطن میسر آیا، جہاں آپ اپنے الفاظ لکھنے میں آزاد ہیں دیکھ رہی ہیں آپ پڑھ رہی ہیں ناشیو ینا والے کیسے مسلمانوں کی آزادی کو ختم کرنے کے در پے ہیں۔ محترمہ تنقید برداشت کرنا بڑے لوگوں کا کام ہوتا ہے میرا جو خط دوشیزہ کے ستمبر کے شمارے میں شائع ہوا ہے جس کے بارے میں رضوانہ پرنس نے کہا کہ 'کچھ چیزیں' پالیسی میں آجاتی ہیں۔ ورنہ آپ کا مکمل تبصرہ شائع کرتے یہ یقیناً رضوانہ پرنس کا بڑا پن تھا کہ اتنی سخت تنقید کے بعد میرے تبصرے کو اچھا کہا میرے خط کا کچھ حصہ شائع کیا ورنہ وہ بھی اپنے ادارے میں آزاد ہیں۔ پیاری رضوانہ ہوسکتا ہے میرا یہ خط بھی پالیسی کی نظر ہوجائے اور ہاں یاد آیا ہم نے تو بڑے مان سے 5 اکتوبر کو اپنی تاریخ پیدائش بتائی کہ اتنے لوگوں کے دنیا میں آنے کی مبارک باد دی جاتی ہے تو شاید ہم کو بھی چاہے باتوں میں۔ چاندی جھلملائے ہم تو ہر چیز کا بہت شوق رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آسٹریلیا، سعودی عرب امریکہ اور پاکستان سے لاتعداد فون آئے 5 اکتوبر یعنی ہماری سالگرہ پر لیکن آپ نے بذریعہ دوشیزہ یاد نہ کیا تو تھوڑا سا نمکین پانی آتے آتے رہ گیا کہ شاید پچھلا خط اس کی وجہ ہو۔ میں اس 'آٹو' کی وجہ سے ہم تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں۔ اجازت۔

ھ: مائی ڈیئر ثمینہ۔ آپ نے ٹھیک کہا ہمیں آپ کا آٹو نامہ کافی ایڈیٹ کرنا پڑا ہے۔ محبت اور خلوص سے مہکتی اس محفل میں محض ایک آٹو کی وجہ سے کوئی بدمزگی نہیں ہونی چاہیے۔ ایسا کرتے ہیں ہم اسے آٹو رکشہ کر دیتے ہیں۔ چلیے اب اسی بات پر ہنس دیں اور ثمینہ ہمیں اکتوبر میں آپ کا کوئی خط نہیں ملا پھر بھلا ہمیں آپ کی سالگرہ کا کیسے پتا چلتا چلیے اب ہم سب مل کر اپنی ثمینہ جی کے لیے ہپی برتھ ڈے گاتے ہیں ہمیشہ سلامت رہیے۔

✉ ہماری محفل کی ہر دل عزیز خولہ عرفان محفل میں شریک ہیں۔ محترم وعزیز رضوانہ پرنس صاحبہ مدیرہ ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ السلام وعلیکم۔ امیدوں اور دعاؤں کے ساتھ آپ کی محفل میں مختصری جگہ لینے آرہی ہوں کیونکہ آج انیس اکتوبر کا دن اللہ حافظ کہہ چکا ہے اور ہم دوشیزہ کے فراق میں مبتلا دیدہ و دل فرشِ راہ کیے بیٹھے ہیں کہ کب میاں جی کے وہ مبارک قدم آئیں گے جب ان کے ہاتھوں میں دوشیزہ نظر آئے گا۔ تبصرہ لکھنے کا انتظار کرنے میں ساعت شمولیت محفل دوشیزہ گزر جائے گی اس لیے اس امید کے ساتھ کہ ماہ اکتوبر کا دوشیزہ بھی مہکتا ہوا ہی ملے گا اس کا تبصرہ ادھار رکھتے ہیں۔ پرنسز ایک افسانہ نظر دوشیزہ کررہی ہوں اگر پسند آئے تو ضرور حوصلہ افزائی فرمایئے گا فی الحال اس تھوڑے کو بہت سمجھ لیں کہ کل انشاء اللہ اس خط اور افسانے کو نظر محکمہ ڈاک کردوں گی۔ دوشیزہ اہلیان، کاشی صاحب اور پرنسز کے لیے ہردم دعا گو۔

ھ: پیاری خولہ! آپ کا افسانہ مل گیا ہے اس پرچے سے فراغت پاکر جلدی ہی اسے پڑھ لیں گے اور آپ کے لیے تو اس محفل میں جگہ ہی جگہ ہے۔ اور پیاری خولہ اپنے میاں جی سے کہہ کر اس بار دوشیزہ جلدی منگوالینا کہ تبصرہ ضروری ہے آپ کا۔

✉ محترمہ رضوانہ پرنس السلام وعلیکم امید کرتی ہوں آپ اور آپ کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا تمام پڑھنے والوں کو آداب عرض ہے۔ اکتوبر کا شمارہ کافی تاخیر سے ملا ٹائٹل پر بنی کیوٹ سی لڑکی پر تعریفی نگاہ ڈالتی

ہوئی آگے بڑھی دوشیزہ کی محفل میں سب کے تبصروں نے لطف اندوز کیا۔ نفیسہ سعید کی تحریر پر فلزا کے ساتھ بہت سی فلزا جیسی لڑکیوں کے لیے سبق تھا۔ ارج گل رانا کی تحریر مزا دے گئی۔ نگہت اعظمی کی تحریر بہت اچھی تھی سچ ہے اللہ کا راستہ آسان نہیں ہوتا بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔ ماہ وش طالب کی تحریر بھی سبق آموز تھی مکمل ناول اُم مریم کا زبردست چل رہا ہے۔ تمام لکھاریوں نے اپنے قلم سے بھرپور انصاف کیا۔ میم رضوانہ پرنس آپ سے کال پر بات کر کے بہت اچھا لگا۔ خاص طور پر ماشاء اللہ آپ کے بولنے کا انداز بہت اچھا ہے۔ اپنی ایک تحریر بھیج رہی ہوں جرم محبت کے نام سے ہوسکتا ہے اچھی لگ جائے ہوسکتا ہے اچھی نہ لگے۔ جو بھی ہو آپ اور کاشی بھائی حوصلہ افزائی بہت اچھی کرتے ہیں جو ہر کوئی نہیں کرسکتا۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ اجازت چاہتی ہوں۔

ھ: بہت اچھی فرح آپ کا افسانہ یقیناً اچھا ہوگا۔ بس ہمیں پڑھنے کے لیے تھوڑا سا وقت دیجیے اور ایسے ہی ہمیں محبتوں کے ساتھ ہمیشہ یاد کرتی رہیے۔

✉: ہماری نئی لکھاری حنا مہر ہم سے پوچھ رہی ہیں۔ ڈیئر رضوانہ آپی السلام وعلیکم اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ آپی جی میں دوشیزہ ڈائجسٹ میں اپنی اسٹوری بھیجنا چاہتی ہوں مجھے ایک فرینڈ نے کہا کہ میں پہلے آپ کو خط لکھ کر پوچھ لوں لیکن میں نے آپ کے جواب کا انتظار کیے بغیر افسانہ آپ کو بھیج دیا ہے پلیز آپ مجھے بتا دیں کہ یہ قابل اشاعت ہے کہ نہیں۔

ھ: مائی ڈیئر حنا! سچ ہمیں بہت خوشی محسوس ہورہی ہے کہ آپ جیسی پیاری پیاری سی نئی رائیٹرز ہمارے قبیلے میں شامل ہورہی ہیں۔ انشاء اللہ اس شمارے سے فرصت پا کر سب کی تحریروں کو پڑھیں گے بس ڈیئر افسانہ بھیجنے کے بعد تھوڑا سا صبر بھی ضروری ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟

✉: ہماری دوشیزہ کی بہت پرانی اور گم شدہ رائیٹر آج اتنے عرصے کے بعد ہم سے ملنے آئی ہیں اور یہ ہی ہیں ہماری مایہ ناز رائیٹر آسیہ رزاقی پیاری رضوانہ آج نہ جانے کیوں تمہیں بطور ایڈیٹر دوشیزہ میں دیکھ کر بہت سی پرانی یادوں نے آگھیرا اور میں خود بخود اس محفل میں چلی آئی تم سے فون پر بھی بات ہوئی ہے اور تمہارے پرزور اصرار پر میں نے ایک افسانہ شروع کیا تو کیا ہے لیکن دیکھتے ہیں کہ کب پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے کہ ایک عرصہ ہوگیا ہے قلم سے بچھڑے ہوئے منزہ کو میرا اسلام کہنا۔

ھ: بہت پیاری پیاری سی آسیہ! قسم سے تم اپنی صلاحیتوں کے ساتھ بہت بڑا ظلم کر رہی ہو تمہارے کتنے ہی فینز ہیں جو تمہیں پڑھنا چاہتے ہیں بس ہم کچھ جانتے سالگرہ نمبر کے لیے فٹافٹ اپنا افسانہ مکمل کرو۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔

✉: برمنگھم سے صبا اے خان ہمیں لکھتی ہیں۔ السلام وعلیکم ڈیئر آپی آپ لندن آئیں اور آپ سے ملاقات نہیں ہوسکی جس کا افسوس ہے آپی میں دوشیزہ میں کہانیاں بھیجنا چاہتی ہوں وہ شائع ہوجائیں گی۔

ھ: بہت پیاری صبا تمہارا نام ہی ہمیں ایک رائیٹر جیسا نام لگ رہا ہے۔ یقیناً تمہاری تحریر میں بھی اس کا اثر ہوگا۔ تو بس جلدی سے اپنی کہانیاں بھیج دو اگر اچھی ہوئیں تو تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

✉: لاہور سے ہماری محفل میں تشریف لائے ہیں شامی احتشام السلام و علیکم رضوانہ آپی۔ میں نے آپ کا ناول اک نئے موڑ پر، ایک ہی نشت میں پڑھ ڈالا۔ بہت ہی اچھا لگا آپ کی کہانی نے شروع سے

Email : pearlpublications@hotmail.com

پراسرار نمبر 1 اور 2 کی پذیرائی کے بعد پراسرار نمبر 3

ایک ایسا شاہکار شمارہ جس میں دل دہلا دینے والی وہ سچ بیانیاں شامل ہیں جو آپ کو چونکنے پر مجبور کردیں گی۔

آپ کے اُن پسندیدہ رائٹرز کے قلم سے، جو آپ کی نبض شناس ہیں۔

جن کی کہانیوں کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

جنوں، بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا کردیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے......

ایسی ناقابلِ یقین، دہشت انگیز اور خوفناک کہانیاں شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرالیں۔

ایک ایسا یادگار شمارہ، جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

سچی کہانیاں کا ماہِ دسمبر کا شمارہ پراسرار نمبر 3 ہوگا

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں

آخر تک جکڑے رکھا۔ آپی میں نے اپنا ایک اور افسانہ 'ابا کی بختاور' کافی پہلے بھجا تھا اس کے متعلق کچھ بتائیں گی۔

ھ: اچھے شامی! ناول کی پسندیدگی کا شکریہ۔ 'ابا کی بختاور' فی الحال ہماری نظر سے تو نہیں گزری لیکن فکر نہیں کرو فرصت پاتے ہی اسے ڈھونڈ نکالیں گے پلیز ہمیں مزید تحریریں بھی بھیجو نہ۔

✉: آسیہ مظہر چوہدری لاہور سے ہمیں لکھتی ہیں السلام وعلیکم رضوانہ کیسی ہیں آپ رضوانہ میں نے دوشیزہ میں اپنا ناولٹ کی پہلی اپی سوڈ بھیجی تھی میں چاہتی ہوں کہ پہلے آپ سے کنفرم کرلوں کہ آپ قسط وار ناولٹ لگا بھی رہیں ہیں یا نہیں پلیز مجھے جلدی بتادیں اور یہ بھی بتادیں کہ اگر پسند آیا ہے تو یہ کب تک لگ جائے گا۔

ھ: آسیہ ڈیئر! بھئی ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی نہیں ہورہی کاش آپ آ کر دیکھ سکتیں کہ ہمارے آس پاس افسانوں اور ناولٹ کا کتنا بڑا ہجوم ہے جس میں ہم گھرے ہوئے ہیں بس دوست آپ سے نہیں اپنے سب لکھاریوں سے گزارش ہے کہ اپنی تحریر بھیجنے کے بعد ہمیں تھوڑا سا وقت ضرور دینے کی کوشش کیا کریں۔ آسیہ آپ ہمیں آفس کے نمبر پر فون کریں۔

✉: اسلم شہزاد رحمانی پہلی بار سیالکوٹ سے ہماری محفل میں تشریف لائے ہیں۔ محترمہ رضوانہ پرنس میں نے اتفاق سے پہلی بار دوشیزہ ڈائجسٹ کا مطالعہ اپنے ٹرین کے سفر کے دوران کیا اور میرا سفر یقیناً بغیر کسی بوریت کے گزرا۔ افسانے ناولٹ سب ہی بہت دل چسپی سے پڑھے۔ دوشیزہ گلستان کے لطیفے اپنے ساتھ بیٹھے ہم سفر کو بھی سنائے یعنی ہمارا ڈبہ قہقہوں سے بھی گونجا۔ محفل بھی پڑھی اور اسی وقت دل میں سوچ لیا کہ گھر پہنچ کر میں بھی دوشیزہ کے لیے ضرور کچھ لکھوں گا بس ڈر یہ ہے کہ آپ میرا خط چھاپتی بھی ہیں یا نہیں اس لیے فی الحال کسی کو اپنے خط کے بارے میں نہیں بتایا اگر چھپ گیا تو پھر سب کو بتاؤں گا۔ اللہ آپ کو مزید عزت اور کامیابی سے نوازے۔

ھ: اسلم صاحب! ہمارے دوشیزہ ڈائجسٹ نے ٹرین میں آپ کے ساتھ سفر کیا اور آپ کے دل میں بھی گھر کرلیا یہ ہمارے لیے بہت خوشی کی بات ہے ہمیں اُمید ہے کہ اب آپ اس کے مستقل قاری بن جائیں گے۔ اب تو خط چھپ گیا نہ۔ بس یہ رسالہ سب کو دکھادیں۔

دوستو! محفل کے اختتام پر ہمیں اپنی رائیٹرز اور قارئین سے ایک گزارش بھی کرنی ہے کہ وہ پرچے کے متعلق یا اپنی تحریر کے بارے میں کوئی بھی سوال پوچھنا چاہیں تو پلیز آفس کے نمبر پر فون کرکے یا خط لکھ کر ہم سے پوچھ لیا کریں کیونکہ میسیجز پر فرداً فرداً سب کو جواب دینا ہمارے لیے بالکل ممکن نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر آپ کا خط محفل میں شامل نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے وہ ہمیں ملا ہی نہیں۔ پلیز اسی وجہ سے آپ ہم سے خفا مت ہوا کریں۔ ہمیں اپنا ہر قاری دل سے عزیز ہے۔

اچھا ساتھیو! آپ سب کی نذر یہ شعر کرتے ہوئے ہم آپ سے اجازت چاہتے ہیں۔

یہ دور آشوب دوستی ہے، مگر میرا حوصلہ سلامت
میں سب کے بارے میں سوچتا ہوں، مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے

دعاؤں کی طالب

رضوانہ پرنس

سوہائے علی

شوخ و چنچل اداکارہ

ذیشان فراز
سے ایک ملاقات

آیئے آج آپ کی ملاقات سوہائے علی سے کروائیں۔

ہم: یوں تو کسی خاتون سے ان کی عمر پوچھنا نہایت غیر اخلاقی بات ہے مگر آپ لاکھوں دلوں کی دھڑکن ہمارے پڑھنے والے بھی آپ کی Date of Birth جاننا چاہیں گے؟

سوہائے: ادائے بے نیازی سے بالوں کو جھکا دیتے ہوئے مجھے کوئی اعتراض نہیں عمر چھپانے میں May 13 اور سال 94 لاہور میں پیدا ہوئی۔

ہم: اس کا مطلب ہوا کہ آپ کا تعلق برج جوزا سے ہے یعنی آپ دوہری شخصیت کی مالک ہیں......؟

: سوہائے: زور سے ہنستے ہوئے...... کون دوہری شخصیت کا مالک نہیں ہوتا گھر میں کچھ باہر کچھ دوستوں کچھ دشمنوں میں کچھ...... ییے اگر اس کو پوزیٹیو لی لیا تو اس کو Diplomacy کہتے ہیں۔

ہم: آپ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہیں Beauty With the Brains آپ ہی کے لیے کہا گیا ہے؟

سوہائے: جی بالکل اور مجھے ناز ہے کہ میں خوبصورت بھی ہوں اور ذہین بھی۔

ہم: اچھا بتایئے شوبز کی طرف کیسے آنا ہوا؟

سوہائے: میں نے جیو سے آنے والے ڈرامے سات پردوں میں کام کیا یہ میرا پہلا قابل ذکر ڈرامہ تھا بس یہیں سے ابتدا ہوئی اس کے بعد ہم ٹی وی سے تنہائی، کھویا کھویا چاند، رشتے کچھ ادھورے سے اور پھر جیو میں سے پیارے افضل۔

ہم: ابتدا آپ نے ڈراموں سے کی......؟

سوہائے: نہیں سب سے پہلے میں نے ماڈلنگ کی اور یہ بات ہے 2012 کی پہلی فلم میری یاسر نواز کی انجمن تھی جس پر مجھے ترنگ ایوارڈ ملا۔

ہم: اور اس کے بعد آپ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا؟

سوہائے: (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں آپ کہہ سکتے ہیں...... مجھے ابھی بہت سارا کام کرنا ہے بہت

آگے جانا ہے۔

ہم: لوگ آپ ڈانس کے معترف ہیں کیا باقاعدہ کہیں سے سیکھا ہے؟

سوہائے: میں بہت پریکٹس کی قائل ہوں باقاعدہ سیکھا تو نہیں کہہ سکتے لیکن مجھے جنون ہے ڈانس کرنے کا اور شاید اس لیے میرا کوئی ثانی نہیں۔

ہم: اچھا سوہائے کسی زمانے میں آپ کا نام فواد خان اور آج کل پروڈیوسر یاسر نواز کے ساتھ لیا جارہا ہے ان افواہوں میں کتنی سچائی ہے؟

سوہائے: (بلیک کشن سے منہ چھپاتے ہوئے) آپ کہاں سے یہ معلومات لاتے ہیں......

ہم: یہ چھوڑیں کہ معلومات کہاں سے آتی ہے آپ بتائیں یہ سچ ہے؟

سوہائے: (سنجیدگی سے) دیکھیے جب آپ کسی کے ساتھ کام کرتے ہیں تو انہی لوگوں کے ساتھ دیکھے بھی جاتے ہیں یہ دونوں لوگ شوبز سے ہی تعلق رکھتے ہیں تو اگر میرا ان کے ساتھ نام لیا جارہا ہے تو کوئی حرج نہیں ہاں کسی کھلاڑی کے ساتھ لیا جائے تو پھر حیران ہونا چاہیے۔

ہم: سوہائے یہ بتایئے آپ نے اپنی look بالکل بدل لی ہے اس میں کس کا ہاتھ ہے۔

سوہائے: جی یہ آپ نے ٹھیک کہا کہ میں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر Change کرلیا ہے اور اس میں نبیلا کا بہت ہاتھ ہے اور ڈریسز مجھے Sana safi naz کے پسند آتے ہیں۔

ہم: سوہائے سنجل آپ کی بہن ہین تو کیا مقابلے کی فضا رہتی ہے کیونکہ آپ دونوں ہی بہترین ایکٹنگ کرتی ہیں؟

سوہائے: جی مقابلہ اپنی Correction کی حد تک تو ضرور کرتے ہیں سچی بات تو یہ ہے کہ پھر دونوں کو ایک دوسرے کی بہت Support ہی رہتی ہے۔

ہم: جوانی پھر نہیں آنی کی میگا ہٹ کے بعد کیسا محسوس کرتی ہیں......؟

سوہائے: بہت اچھا اور پھر جو ریسانس ہمیں لوگوں نے دیا ہے اس نے تو دل خوش ہی کر دیا اس کامیابی نے اور فلمیں کرنی کی ہمت دی۔

ہم: سوہائے ہماری بھی دعا ہے کہ اللہ آپ کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی دے۔ آپ نے ہمیں وقت دیا اس کا بہت شکریہ۔

پاکستان انڈسٹری کی اس حسین اور کمسن اداکارہ سے انٹرویو تمام ہوا۔ اس شرط کے ساتھ کہ انٹرویو کی جگہ راز میں رکھی جائے۔

☆☆......☆☆

سُریلا فنکار

عاطف اسلم

پاکستان کی جانب سے تمغہ امتیاز حاصل کرنے والا نوجوان فنکار

مونی خان

عاطف اسلم 12 مارچ 1983 کو وزیر آباد میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم لاڑکانہ کے کمبرلی اسکول سے حاصل کی اس کے بعد سینٹ پال کیمبرج اسکول راولپنڈی سے 0 لیول کا امتحان پاس کیا اور F C کالج لاہور سے بیچلر کیا۔ عاطف اسلم نے پی اے ایف اسکول کی طرف سے کرکٹ کے لیے میچز کھیلے موسیقی کی ابتدا 'جل' بینڈ سے عاطف نے اپنی دوست

سارہ سے 30 مارچ 2013 کو لاہور میں شادی کی...... عاطف اسلم نصرت فتح علی خان کے بہت بڑے فین ہیں۔

عاطف اسلم نے پاکستان اور بھارت میں ہی

> عاطف کی آواز، بولی وڈ فلمز کے لیے جیسے ضروری ہوگئی ہے، اس سے زیادہ سویٹ اور رومینٹک آواز اس وقت کسی اور سنگر کی نہیں مانی جاتی! حال ہی میں عاطف نے صابری برادران کی تاج دارِ حرم......، کوری فریش کر کے اس میدان میں بھی کامیابی پالی ہے

نہیں، اپنے فن کی بدولت امریکہ میں بھی جھنڈے گاڑھے ہیں، مین پُش کارٹ، میں عاطف کے تین گانے شامل ہیں، جنہیں کریٹکس نے بہت پہلے سراہا پھر میرا نائر کی فلم میں بھی دو گانے گائے! عاطف کی آواز، بولی وڈ فلمز کے لیے جیسے ضروری ہوگئی ہے، اس سے زیادہ سویٹ اور رومینٹک آواز اس وقت کسی اور سنگر کی نہیں مانی جاتی! حال ہی میں عاطف نے صابری برادران کی تاج دارِ حرم......، کوری فریش کر کے اس میدان میں بھی کامیابی پالی ہے! شعیب منصور کی بول، میں بطور ہیرو کیمرے کے سامنے آ کر بھی خود اعتمادی اور کامیابی کو برقرار رکھا! عاطف کو پانچ لکس اسٹائل ایوارڈز مل چکے ہیں، اس کے علاوہ حکومت پاکستان کی جانب سے تمغہ امتیاز بھی

ملا ہے! بھارت کے سب سے بڑے فلم ایوارڈز میں تین مرتبہ نامزدگی کا اعزاز بھی عاطف کے پاس ہے۔

ہمیں اپنے اس سپوت پر فخر ہونا چاہیے جس نے پاکستان کا نام دنیا بھر میں اپنی خوبصورت گائیکی اور غیر معمولی شخصیت کی وجہ سے روشن کیا۔

☆☆......☆☆

انڈین فلم نگری کی سحر انگیز شخصیت

سدھارتھ ملہوترا

بھارتی فلم نگری کا ابھرتا ہوا یہ ہیرو 16 جنوری 1985 کو دہلی میں پیدا ہوا۔ سدھارتھ نے اپنے فن کیریئر کی ابتدا ماڈلنگ سے کی۔ پہلی فلم اسٹوڈنٹ آف دا ایئر پر تھی جو بڑی ہٹ ثابت ہوئی۔ فلم فیئر ایوارڈ حاصل کرنے والے اس ہیرو کی دو اور فلمیں اس وقت شائقین سب سے بے حد مقبول ہیں پہلی ہنسی تو پھنسی اور دوسری ایک ولن ان دونوں فلموں میں بھی سدھارتھ نے

بہت جان دار اداکاری کی ہے۔ عالیہ بھٹ کا نام سنتے ہی Sid کا چہرہ لال ہو جاتا ہے غصے سے نہیں جناب محبت سے۔ Sid اور عالیہ بھٹ کے معاشقے کے آج کل بہت چرچے ہیں...... دونوں اکثر ساتھ دیکھے جاتے ہیں۔ 6 فٹ لمبے اس ہینڈسم اداکار کے فینز کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ خاص طور سے لڑکیاں سدھارتھ کو بہت پسند کرتی ہیں۔ انتہائی پڑھے لکھے

خاندان سے تعلق رکھنے والے Sid کی دو بہن اور بھائی ہیں۔ Sid شاہ رخ کا فین ہے اور فٹ بال کا شیدائی۔ نیلا رنگ بہت پسند ہے اور میٹھے میں گلا جامن اور جلیبی پسندیدہ ہیں۔ Sid کو اپنے Oscar پالتو کتے سے بہت پیار ہے اور فارغ وقت میں وہ بہت شاپنگ

کرتا ہے۔ خبریں ہیں کہ فلم Bang Bang 2 میں

> 6 فٹ لمبے اس ہینڈسم اداکار کے فینز کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ خاص طور سے لڑکیاں سدھارتھ کو بہت پسند کرتی ہیں۔ انتہائی پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھنے والے Sid کی دو بہن اور بھائی ہیں۔ Sid شاہ رخ کا فین ہے اور فٹ بال کا شیدائی۔

اب لیڈ رول رتیک کے بجائے Sid کرے گا۔ اس کے علاوہ کپور اینڈ سنز بھی تیاری کے مراحل میں ہے۔

☆☆......☆☆

اے آروائی کے خوبصورت پروگرام

م ش خ

ناظرین گرامی ARY ڈیجیٹل کے ڈرامہ سیریل اور سوپ کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ہماری کوششیں ہوتی ہے کہ ہم اچھے ڈرامے آپ ناظرین کے لیے تخلیق کریں وہ شائقین طنز و مزاح اور مزاحیہ پروگراموں کو جس طرح ARY ڈیجیٹل نے اجاگر کیا ہے اسے بین الاقوامی سطح پر شہرت ملی ہے جس کی تازہ مثال مزاحیہ کھیل بلبلے اور گڈ مارننگ پاکستان قابل ذکر

ARY کے پروگرام ''دل پذیر شو'' میں حنا دل پذیر

کا شوق و ذوق رکھتے ہیں ان کے لیے اے آروائی کے پروگرام 'دل پذیر شو' بے وقوفیاں اور تماشے ست کام واقعی اپنی مثال آپ ہیں دنیا کی تلخیوں اور الجھنوں سے بچنے کے لیے ذہن کو خوبصورت پروگراموں کی ضرورت ہوتی ہے اچھے ڈراموں ہیں اے آروائی کے ناظرین کے چاہنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے یہ واحد چینل ہے جسے ہر عمر کے لوگ دیکھتے ہیں نوجوانوں کا دل مچلتا ہے تو وہ دی میوزک کے پروگراموں سے محظوظ ہوتے ہیں، معصوم بچے نیک چینل سے کارٹون دیکھ کر

مستفید ہوتے ہیں۔ سنجیدہ حضرات جو انگریزی پر عبور رکھتے ہیں وہ H.B.O چینل دیکھ کر اچھی انگلش کا انتخاب کرتے ہیں، خواتین ڈراموں، سوپ، سٹ کام اور دیگر پروگراموں سے دل بہلاتی ہیں اسلامی روایات کے شیدائی باقاعدگی سے کیو ٹی وی دیکھتے ہیں، یہ پاکستان کا واحد چینل ہے جو باقاعدگی سے پانچ اوقات کی اذان نشر کرتا ہے یہ اعزاز کسی اور چینل کو نہیں جبکہ ARY نیو آج

ہیں اس کے علاوہ ایک چڑیل کا خوبصورت کردار ادا کر رہی ہیں جس میں معاشرے کے مختلف شعبوں پر روشنی ڈالی رہی ہیں یہ بہترین شو اتوار کی شام 5:30 بجے اے آر وائی ڈیجیٹل سے دکھایا جا رہا ہے ڈرامہ سیریل 'وصال یار' مقبولیت کی جانب گامزن ہے کہانی کا مرکزی خیال مشرقی معاشرے کی ایسی عورت کی عکاسی کرتا ہے جسے اپنے جائز رشتے کو قائم رکھنے کے لیے معاشرے کی لعن طعن

ARY ڈیجیٹل کے سٹ کام ''بے وقوفیاں'' میں شہری شاہ

بھی نمبر 1 ہے جس کا خبرنامہ اور کرنٹ افیر کے شو ناظرین بہت توجہ سے دیکھتے ہیں آیئے ناظرین اب آپ کو لے کر چلتے ہیں ARY ڈیجیٹل نیٹ ورک کے پروگراموں کی طرف ''دل پذیر شو' آج کل لوگوں کی توجہ کلا مرکز بن رہا ہے۔ اس میں حنا دل پذیر اپنے شو کے بارے میں بتاتی ہیں اور حالات حاضرہ جو کامیڈی پر مبنی ہوگا اس پر روشنی ڈالتی ہیں۔ جس میں طنز و مزاح کا پہلو بہت زیادہ ہوتا ہے اس کے علاوہ آج کل جو مارننگ شو ہو رہے ہیں ان پر بھی خوبصورت مزاحیہ گفتگو کرتی

برداشت کرنا پڑتی ہے اور حق پر ہونے کے باوجود اسے غلط ٹھہرایا جاتا ہے۔ اور دوسری جانب ایسے مردوں پر بنی ہے جو پیسے کے حصول اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے عورت کے جذبات کو کچلنے سے بھی گریز نہیں کرتے اس کہانی کا مرکزی کردار مناہل اور عدلیہ بیگم ہیں جبکہ اس سیریل میں جذبات و احساسات کے اتار اور چڑھاؤ پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کو تحریر کیا ہے آمنہ ریاض نے جبکہ ہدایت عاصم علی کی ہیں اس کے فنکاروں میں عائشہ خان، شہزاد شیخ، مریم نواز، ماہی

وارثی، حسن نیازی، وسیع فاطمہ، زینب قیوم، طاہرہ امام اور بہروز سبزواری قابل ذکر ہیں۔ سیریل ' وصال یار' ہر پیر کی رات ڈیجیٹل سے رات 9 بجے دکھائی جا رہی ہے سوپ 'دل برباد' ناظرین کی توقعات پر پورا اتر رہا ہے یہ دو بہنوں ہانیہ اور رانیہ کی کہانی ہے جن کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہاں سے ہانیہ اور رانیہ کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے معروف مصنف نزہت سمن کسی بھی تعارف کی محتاج نہیں خوبصورت تحریریں تو لکھتی ہیں اس سوپ کی ہدایت

ARY ڈیجیٹل کی سیریل ''وصال یار'' میں عائشہ خان

شاہد یونس کی ہیں جبکہ فنکاروں میں سنگیتا، فرح علی، مریم انصاری انعم تنویر، عمران اسلم، اور فضیلہ قاضی قابل شکر ہیں سوپ ' دل برباد پیر سے لے کر جمعرات تک روزانہ رات 7:30 بجے ڈیجیٹل سے دکھایا جا رہا ہے اب چلتے ہیں مزاحیہ اور دل کو

ARY ڈیجیٹل کے سٹ کام ''بتاشے'' میں گل رعنا

چھو لینے والے سٹ کام...... بے وقوفیاں'' اور بتاشے کی طرف سٹ کام ' بے وقوفیاں' ایک خوبصورت ہلکی پھلکی مزاحیہ تحریر ہے جس میں میاں بیوی کی روز روز کی نوک جھونک پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بیوی سخت مزاج خاتون ہیں جبکہ میاں غیر حاضر دماغ ہیں بیوی اصول پسند جبکہ شوہر غیر سنجیدہ شخصیت ہیں۔ اس سریز کو تحریر کیا ہے رضوان حسن نے جبکہ ہدایت سلمان عباس نومی کی ہیں اس سریز کے فنکاروں میں شگفتہ اعجاز، شہری شاہ، حماد فاروقی اور دیگر شامل ہیں سیریز ' بے وقوفیاں' ہر ہفتہ کی رات 7:30 ARY ڈیجیٹل سے دکھائی جا رہی ہے۔ علی عمران کا تحریر کردہ مزاحیہ کھیل ' بلبلے'

نے اپنی چاہت ناظرین میں برقرار رکھی۔ یہ مزاحیہ ڈرامہ اے آر وائی ڈیجیٹل سے ہراتوار کی رات 7 بجے دکھایا جائے گا۔ مزاحیہ سٹ کام 'بتاشے' مزاحیہ کہانیوں پر مبنی پروگرام ہے یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے میں دلچسپی رکھتے ہیں جس کے والد پروفیسر ہیں اور اس پروفیسر کے دو شاگرد اس لڑکی میں دلچسپی رکھتے ہیں جبکہ لڑکی ان دونوں میں سے کسی میں دلچسپی نہیں رکھتی اس سٹ کام کی کہانی روزمرہ کے دلچسپ اور مزاحیہ واقعات پر مبنی ہے اسے تحریر کیا ہے اجو بھائی نے جبکہ ہدایت قیصر خان اور شاہد خواجہ کی ہیں اس کے فنکاروں میں خواجہ اکمل، گل رعنا، اروبا مرزا، علی گل پیر، اور ایاز سومرو قابل ذکر ہیں سٹ کام بتاشے ہر ہفتہ کی رات شام 7 بجے اے آر وائی ڈیجیٹل سے دکھائی جا رہی ہے جیتو پاکستان کو فہد مصطفےٰ بہت ہی خوبصورتی سے پیش کر رہے ہیں اور یہ خوبصورت پروگرام مقبولیت کے لحاظ سے پاکستان کے آن ایر ہونے والے تمام چینل پر نمبر 1 کی پوزیشن پر مسلط ہے اس کامیاب پروگرام کے ہدایت کار کامران خان جبکہ اگزیٹیو پروڈیوسر عبید خان ہیں نیوز سے آن ایر ہونے والے پروگرام 'سرعام' نے مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیے ہیں جسے اقرار خوبصورتی سے کر رہے ہیں وسیم بادامی کاشف عباسی اور ڈاکٹر دانش کے خوبصورت پروگرام اپنی مثال آپ ہیں QTV کے ھیڈ نوید زیدی اس سال حج کی سعادت حاصل کر کے پاکستان خیریت سے آ گئے ہیں انہوں نے کیو ٹی وی کے پروگراموں کے حوالے سے بتایا تھا کہ لا جواب پروگراموں میں بصیرت پیر سے لے کر جمعرات تک صبح 9 بجے شجاع الدین شیخ پیش کر رہے ہیں جبکہ لائیو پروگراموں میں '...... کتاب اور صاحب کتاب' ہر منگل کی رات 8 بجے ڈاکٹر طاہر مصطفےٰ کتاب کے مصنف کو بلا کر اس سے تفصیلی بات چیت کرتے ہیں۔ پروگرام 'روشنی سب کے لیے' رئیس احمد پیر سے لے کر جمعرات تک رات دس بجے پیش کر رہے ہیں۔ پروگرام 'احکام شریعت' ہفتہ اور اتوار رات 9 بجے دکھایا جائے گا پروگرام 'صبح بخیر' سیرا خان ہر اتوار کی صبح 10 بجے پیش کر رہی ہیں پروگرام ' میری پہچان' میزبان سحرش شیخ پیر اور منگل کو رات 7 بجے پیش کر رہی ہیں ہم ARY ڈیجیٹل نیٹ ورک کی ویب کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے ARY کی ویب کو پاکستانی چینلز میں یہ اعزاز حاصل ہے کہ اسے لاکھوں ناظرین دیکھتے اور پڑھتے ہیں سیاسی آرٹیکل اپنی مثال آپ ہوتے ہیں ویب کے ھیڈ اشرف صاحب نے ویب کو جدید طریقوں سے روشناس کرایا ہے جس کی مثال نہیں ملتی نیوز میں اگر آپ سے کوئی پروگرام مس ہو گیا ہے تو آپ اسے ویب سائٹ پر سرچ کر سکتے ہیں ویب پر آپ کو اسپورٹس کے حوالے سے تازہ خبریں بھی مل جاتی ہیں جبکہ شوبز کے حوالے سے آپ خوبصورت انٹرٹینمنٹ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ARY ویب سے آپ من پسند چیزیں سرچ کر سکتے ہیں۔ ناظرین گرامی معاملہ دل کا ہے جو دل چاہے آپ خوبصورت سے خوبصورت ہر شعبے سے وابستہ پروگرام ویب پر دیکھ سکتے ہیں۔ واقعی ARY کی ویب باکمال ہے اس سال حج کے موقع پر جو المیہ ہوا اس کی ویب نے جس طرح کوورنج اپنے چاہنے والوں کو پیش کی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ یہ ARY ویب کا کمال ہے جو اپنے قارئین اور ناظرین کو ہر وقت آگاہ رکھتا ہے۔

☆☆......☆☆

شادی مبارک

آنگن میں بارات

شگفتہ شفیق

فرخ اور رباب

شگفتہ اپنے شریک حیات ' بہو' بیٹے' بیٹی کنزل اور چھوٹے بیٹے شہریار کے ساتھ

منزہ سہام' رضوانہ پرنس' فرخ' شگفتہ اور کنزل

دلہن کنزل اپنے والد اور والدہ کے ہمراہ دُلہا تابش کے ساتھ

کنزل، تابش، شگفتہ، شفیق صاحب، فرخ اور شہریار

میری کامیابی، لائف بوائے کے ساتھ

لائف بوائے... آئیڈیل ملائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

سدرہ بیگم کو بس شوق تھا تو یہی کہ دونوں بیٹوں کی بہوئیں لائیں تو لمبے لمبے بالوں والی ہوں۔ سیاہ، چمکتے، لانبے بال اُن کی کمزوری تھے۔ خود اُن کے بال بچپن میں کسی بیماری کے سبب بہت روکھے، پھیکے اور بے جان ہوگئے تھے۔ اُن کے پڑوس میں اُن کی سہیلی صفیہ نے غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر اپنی محنت سے بیوٹیشن کا کورس کیا اور پھر جلد ہی دو ایک بیوٹی پارلرز میں کام کر کے انہوں نے اپنے گھر ہی میں اپنا بیوٹی پارلر کھول لیا۔ بیس برس میں ترقی کرتے کرتے بیوٹی پارلر جم گیا اور عزت کے ساتھ گھر بیٹھے صفیہ بیگم حلال رزق کمانے لگی تھیں۔

سدرہ بیگم سادگی پسند خاتون تھیں۔ میاں کی اپنی فرم تھی۔ خدا کا دیا ہوا سب کچھ تھا۔ لیکن اُن کی سادگی بے مثال تھی۔ وہ اپنی اس ایک خواہش پر ذرا پیچھے ہٹنے کو راضی نہ تھیں۔ بڑے بیٹے کی شادی کردی لیکن بہو...... بہو ہی تھی، اُن کی خواہش پوری نہ ہوئی تھی۔ وہ خدا کی رضا پر راضی بہ رضا ہوگئیں۔ قانع ہوگئیں۔ صفیہ سے اکثر چھوٹے بیٹے کی بابت بات ہوتی رہتی تھی۔ وہ بھی تلاش میں سرگرداں تھیں مگر خدا کی مرضی...... لڑکیاں تو بہت تھیں۔ مگر سدرہ بیگم کو گھر ہستی بنانے والی چاہیے تھی، اجاڑنے والی نہیں۔ سو بات بننے اور تلاش رشتہ پر دونوں ہی امید افزا تھیں۔

سدرہ بیگم کی صفیہ سے دوستی دو چند اُس زمانے میں ہوئی جب سدرہ اپنے بالوں کی وجہ سے از حد پریشان تھیں۔ صفیہ نے اُن کے دو موتے بال بہت سارے شیمپو استعمال کرا کر ٹھیک کرنا چاہے لیکن شیمپو بے کار رہے اور بال اپنی رہی سہی صورت بھی کھو بیٹھے۔ آخری حل کے طور پر لائف بوائے شیمپو استعمال کرایا گیا۔ پہلے ہفتے تو نتیجہ صفر رہا لیکن پھر رفتہ رفتہ جادو ہوگیا اور سدرہ بیگم اپنے بالوں کی تکالیف سے نجات حاصل کرنے لگیں۔ ایسا جادو دیکھ کر ہی صفیہ نے اپنے پارلر کا نام Life Beauty Parlour رکھا تھا۔ لائف بوائے شیمپو ان کی استعمال کردہ سب سے کامیاب پراڈکٹ تھی۔ جس کے بنا وہ بیوٹی کو نامکمل سمجھتی تھیں۔

☆......☆......☆

آج کل سدرہ بیگم کی طبیعت ناساز چلی آ رہی تھی۔ وہ چاہ رہی تھیں کہ جلد از جلد چھوٹے بیٹے کے لیے اپنی پسندیدہ بہو لے آئیں۔ ایک جگہ پھر سے لڑکی دیکھی گئی۔ ثناء ایک میلاد کی تقریب میں اُن کی نظر میں آئی تھی۔ لانبے، سیاہ چمکدار بالوں والی اس لڑکی پر اُن کا دل آ گیا اور جھٹ اس کی بھابی رفعت کے آگے دستِ سوال دراز

کردیا۔ وہ لوگ عظیم کو بھی دیکھ گئے تھے۔ اب انہوں نے فائنل جواب دینا تھا۔

☆......☆......☆

فون کی بیل بجی تو سدرہ بیگم چونک پڑیں۔ ایک انجانی مسرت کے تحت ان کے لب مسکرا اٹھے اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ تو صبح ہی سے فون کا انتظار کررہی تھیں اس لیے فون اٹھاتے ہی چہک کر بولیں۔

''ہیلو!''

''آداب آنٹی!'' دوسری جانب ثناء کی بھابی رفعت بول رہی تھیں۔

''جیتی رہو' خوش رہو۔'' انہوں نے حسب عادت خوش دلی سے دعا دی۔ ''اور سناؤ سب ٹھیک ہیں' کیا خبر سنا رہی ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

سدرہ بیگم کی پرمسرت آواز اور لہجے کو سن کر رفعت چپ سی ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ انہیں کس طرح سے یہ خبر سنائے جب کہ اسے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ کسی اچھی خبر کا انتظار کررہی ہیں۔

سدرہ بیگم نے بھی اس کی گمبھیر خاموشی کو محسوس کرلیا اور ان کا دل انجانے خدشے سے دھڑک اٹھا۔

''بولو نا بیٹی' کیا بات ہے' تم چپ کیوں ہو؟'' انہوں نے آہستہ سے کہا۔

''آئی ایم سوری آنٹی! میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کس طرح سے کہوں' اصل میں ہمارے ہاں سب گھر والوں کی مرضی سے ہر فیصلہ کیا جاتا ہے' آپ یوں سمجھ لیں کہ سب لوگ ایک رائے پر متفق نہیں ہوسکے۔'' اس نے کہا اور پھر خاموش ہوگئی۔

''اچھا!'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ''جیسی آپ لوگوں کی مرضی مگر انکار کا سبب تو بتادو۔'' انہوں نے مردہ لہجے میں کہا۔

''نہیں' کوئی خاص وجہ بھی نہیں ہے۔ شاید اللہ نے جوڑ ابنایا ہی نہیں تھا۔ اچھا خدا حافظ!'' اس نے کہا اور فون بند کردیا۔

سدرہ بیگم ایک بار پھر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بار بار انہیں ایک ہی جواب سننے کے لیے کیوں مل رہا ہے۔ آخر ان میں' ان کے گھر میں' ان کے ہونہار بیٹے میں ایسی کون سی خرابی ہے کہ کہیں سے بھی ہاں میں جواب نہیں آرہا۔ اس مرتبہ تو وہ بہت پرامید تھیں۔ دو روز قبل جب ثناء کے گھر والے عظیم کو دیکھنے کے لیے آئے تھے تو جاتے ہوئے بہت خوش اور مطمئن تھے بلکہ ان لوگوں نے تو آپس میں منگنی پر بھی ڈسکس کیا تھا اور ایک دوسرے کے رسم ورواج کے متعلق بھی پوچھا تھا پھر آج فون کرکے جواب دینے کا وعدہ کیا تھا اور آج جب جواب آیا تو انہوں نے انکار ہی کردیا۔ وہ بہت دل برداشتہ ہورہی تھیں۔

سدرہ بیگم کے شوہر علیم خان اپنی فرم کے مالک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کی صورت میں دو بیٹے ہی عطا کیے تھے۔ سب کے سب لائق' ہونہار اور فرمانبردار تھے۔ سدرہ بیگم بھی نہایت خوش مزاج' سادہ اور دریا دل مشہور تھیں۔ عموماً انہوں نے لوگوں کو یہ کہتے بھی سنا تھا کہ آپ کے گھر آنے والی بہو بہت خوش قسمت ہوگی۔ نہ نندوں کا بکھیڑا نہ کام کاج کی فکر' کیوں کہ کام کاج کے لیے گھر میں نوکر موجود تھے اور پھر خود سدرہ بیگم بہت منکسر المزاج تھیں۔ غصہ کرنا یا لڑائی جھگڑا کرنا تو وہ جانتی ہی نہیں تھیں۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی مگر ان کے رہن سہن اور اطوار سے کہیں بھی بناوٹ اور تکبر نہیں چھلکتا تھا۔ وہ انتہائی حد تک سادگی پسند تھیں۔

بڑے بیٹے کی شادی وہ خاندان میں کرچکی تھیں مگر بہو مزاج کی تنک چڑھی تھی۔ اسے سدرہ بیگم کی سادگی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ ایک روز انہوں نے اپنے کانوں سے سنا ان کی بہو فون پر اپنی امی سے بہت تپے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''پتا نہیں امی' اتنی ڈھیر ساری دولت کو جمع کرکے کیا کریں گی؟ نہ تو گھر میں اور نہ ہی ان کی شخصیت میں وہ چمک دمک دکھائی ہی نہیں دیتی جو نظر آنی چاہیے' بس ہر وقت سادگی سادگی کی رٹ لگائے رہتی ہیں۔''

سدرہ بیگم بت سی بن گئی تھیں۔ اگرچہ انہوں نے بہو پر کبھی بلاوجہ روک ٹوک نہ کی تھی بلکہ انہوں نے تو سارا گھر بہو پر یہ کہہ کر چھوڑ دیا تھا کہ بیٹا' یہ تمہارا گھر ہے' جس طرح چاہو' اس کو سجاؤ اور سنوارو اور جتنے پیسوں کی ضرورت ہو' مجھ سے لے لو۔'' مگر بہو اس گھر کو اپنا سمجھتی تب نا' اس کا کہنا تو یہ تھا کہ یہ اس کا گھر نہیں ہے' یہ تو

ساس کا گھر ہے' پھر وہ کیوں اتنی محنت کرے۔ اتنی محنت تو بس اپنے ہی گھر کے لیے کی جاتی ہے۔

عظیم ان کا لائق بیٹا تھا۔ وہ چائلڈ اسپیشلسٹ تھا اور امریکا سے تعلیم حاصل کر کے آیا تھا۔ اچھی شکل و صورت تھی مگر پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی کہ ہر بار لڑکی والے انکار کر دیتے۔ انہیں یاد تھا کہ ایک مرتبہ جب وہ ایک لڑکی کو دیکھنے گئیں اور انہوں نے اپنے شوہر اور بیٹوں کے متعلق بتایا تو لڑکی کی ماں نے حیرت سے انہیں اوپر سے نیچے تک دیکھا اور منہ بنا کر بولیں۔

''آپ کو دیکھنے سے لگتا تو نہیں کہ آپ کے شوہر اپنی فرم کے مالک ہوں گے اور بیٹے بھی اتنا کماتے ہوں گے۔''

''کیا مطلب؟'' انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' لڑکی کی ماں نے کہا اور پھر وہاں سے بھی انکار آ گیا۔

اس روز صفیہ جب ان سے ملنے کے لیے آئیں تو انہوں نے تمام حالات بیان کر کے اس سے پوچھا۔

''صفیہ! تم مجھے صاف صاف بتاؤ کہ لوگ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ کیا اپنے بیٹے کے ہر رشتے کے انکار کی وجہ میں ہوں؟''

''ایسا ہو سکتا ہے۔'' صفیہ نے جواب دیا۔ ''کیوں کہ تم آج کل کے زمانے اور لوگوں کی سوچ سے واقف نہیں ہو۔ لوگ چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ کر اپنے آپ کو عقل مند تصور کرتے ہیں۔ یہاں تو لوگوں کا حال یہ ہے کہ ادھر چار پیسے ہاتھ میں آئے نہیں اور لوگوں نے اپنا رنگ ڈھنگ اور حلیہ بدلا نہیں' چاہے ڈھنگ سے پیٹ میں روٹی نہ جائے مگر جسم پر لباس اتنا قیمتی ہوگا کہ دوسرا انہیں کچھ سے کچھ سمجھ لے' ڈرائنگ روم اتنے شاندار طریقے سے سجا لیں گے چاہے سارا گھر بھنڈار ہی پڑا رہے اور پھر تم ذرا اپنی جانب نگاہ ڈالو' تمہارے ہاں ماشاء اللہ ماہانہ لاکھوں کی آمدنی آ رہی ہے اور تم سر میں کالے خضاب کی جگہ مہندی استعمال کرتی ہو۔ سادے کپڑے پہنتی ہو' ڈھیروں گولڈ ہونے کے باوجود نمائش نہیں کرتیں۔ نہ ہی اب تم پارلر جاتی ہو۔ بس اِدھر تمہارے بال لائف بوائے شیمپو نے ٹھیک کیے، اُدھر تم نے پارلر سے ناتا توڑ ڈالا۔ شاید تمہیں دیکھ کر لوگ یہی سوچتے ہوں گے کہ پیسا پاس تو ہے مگر تم جاہل گنوار ہو' معاف کرنا' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے تمہیں جاہل گنوار کہہ دیا۔'' صفیہ نے کہا۔

''مگر صفیہ! میں تو شروع ہی سے ایسی ہوں۔ مجھے تو کبھی ان سب باتوں کا خیال ہی نہیں آیا۔ میں تو یہ سمجھتی تھی کہ سادگی اللہ کو پسند ہے۔ نمود و نمائش کو تو رب پیارے نے بھی پسند نہیں کیا اور رہی گھر کو جدید طریقے سے سجانے کی بات تو میں تو ایک طرف ہو گئی ہوں۔ بس بالوں کے مسئلے پر میں خدا سے شکوہ کناں تھی مگر وہ بھی تم نے ہی لائف بوائے شیمپو کے ذریعے حل کر دیا اور یہ گھر میں نے بہو کو سونپ دیا تھا کہ اپنی پسند اور مرضی سے سجا لو اس لیے کہ میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ بہویں گھر میں ساس کا زیادہ عمل دخل پسند نہیں کرتیں مگر وہ تو یہ کہہ کر پیچھے ہٹ گئی کہ اپنا گھر وہ ہوتا ہے جہاں کا بلا شرکت غیرے بندہ خود مالک ہوتا ہے اور میں تو جیسی ہوں' ٹھیک ہوں' اب میں اپنے آپ کو اس عمر میں تو بدلنے سے رہی۔'' سدرہ بیگم نے کہا۔

''تم رشتے بھی تو اچھے گھرانوں میں ڈھونڈ رہی ہو۔ ذرا نچلے طبقے کی طرف جا کر دیکھو۔ جھٹ ہاں ہو جائے گی۔'' صفیہ کا مشورہ برا نہیں تھا مگر ان کا دل کسی طرح نہ مانتا تھا۔

''کیوں' کیا میرا بیٹا پڑھا لکھا نہیں ہے؟ میرا سارا سسرال تعلیم یافتہ ہے تو میں رشتہ بھی ایسے ہی لوگوں میں دیکھوں گی اور خاندان کی تو میں ایک بہو لے ہی آئی ہوں۔ دوسری لانے کو اب دل آمادہ نہیں ہوتا دوسری بہو تو مجھے لمبے چمکدار، بالوں والی چاہیے باقی بالوں کی خوبصورتی میرا لائف بوائے شیمپو پوری کر دے گا۔'' سدرہ بیگم نے صاف گوئی سے کہا۔

''تو پھر تمہیں اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔ ذرا ٹپ ٹاپ سے بڑے لوگوں کی بیگمات کی طرح رہنا سیکھو پھر دیکھو لڑکی والے کیسے تمہارے آگے پیچھے پھریں گے۔ اب یہ انکساری دوسروں سے جھک کر ملنا چھوڑ دو' ان باتوں کی کوئی قدر نہیں ہے آج کل' ٹھسے سے جاؤ گی تو لوگ تمہیں کچھ سمجھیں گے۔'' صفیہ نے نئی راہ دکھائی تھی۔

''نہیں صفیہ! میں خدا کی ذات سے پُر امید ہوں۔ اس دنیا میں کوئی تو میرے جیسے مزاج کا ہوگا جو مجھے قبول کرے گا۔''

سدرہ بیگم نے کہا تو صفیہ بھی خاموشی سے اٹھ گئیں۔

☆......☆......☆

شام کو عظیم گھر آئے تو انہوں نے امی کا اداس چہرہ دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ ایک بار پھر انکار میں جواب آیا ہے۔ انہوں نے ماں سے کچھ بھی نہیں پوچھا اور خاموشی سے ڈائننگ ٹیبل پر آ بیٹھے مگر سدرہ بیگم آج بالکل خاموش تھیں۔ عظیم ان کے چہرے کے گہرے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہے تھے۔

''کیا سوچ رہی ہیں امی؟'' وہ مسکراتے ہوئے سالن کا ڈونگا اپنے نزدیک کرتے ہوئے بولے۔

''کچھ نہیں! مجھے کیا سوچنا ہے سوائے اس کے کہ آخر ہم میں ایسی کیا خرابی ہے جو ہر رشتہ ہی سے انکار ہوا جا رہا ہے۔'' انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''آپ ناحق پریشان ہو رہی ہیں۔ ابھی اس کام کا وقت ہی نہیں آیا ہے۔ جب وقت آ جائے گا' پھر کہیں سے انکار نہیں ہوگا۔''

عظیم نے سالن پر نگاہ ڈالی اور امی کا دھیان بٹانے کے لیے بولے۔

''یہ کوفتوں کا سالن یقیناً آپ نے بنایا ہے۔ اس کی خوشبو تو یہی بتا رہی ہے۔''

سدرہ بیگم بیٹے کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا دیں۔

☆......☆

سبین کے دروازہ ناک کرنے پر اندر سے فوراً ہی یس کمنگ کی آواز آئی تھی اور پھر دروازہ کھولتے ہی اس کی نگاہ بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھے اس بارعب شخص پر پڑی تو اس کے ہاتھ لرزنے لگے مگر اپنے آپ کو سنبھال کر اس نے ایک بار پھر بڑے سے دوپٹے کو درست کیا اور بااعتماد اور پروقار طریقے سے چلتی ہوئی آگے بڑھی اور کرسی پیچھے کر کے بیٹھ گئی۔

''آپ کا نام سبین ہے اور تعلیم......؟'' انہوں نے ایک نگاہ سامنے رکھی ہوئی فائل پر ڈالی اور گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''جی میں نے بی ایس سی کیا ہے۔'' اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے صاف ستھرے لہجے میں کہا۔

''اور عمر......؟'' پھر پوچھا گیا۔

اس کا دل چاہا کہ جھٹ کہہ دے کہ سامنے سب کچھ لکھا موجود تو ہے۔

''انیس سال۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے لبوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''واقعی؟''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟ میرے خیال میں آپ نے میرے برتھ سرٹیفکیٹ کو تو ضرور دیکھا ہوگا پھر بھی شاید آپ یہ اندازہ لگانا چاہتے ہیں کہ میں کس قدر جھوٹ بول لیتی ہوں' یا بول سکتی ہوں۔'' اس نے بنا کسی گھبراہٹ کے صاف گوئی سے کہا۔

''محترمہ آپ شاید یہ سمجھ رہی ہیں کہ اس قدر اعتماد اور صاف گوئی کا مظاہرہ کر کے مجھے امپریس کر لیں گی۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں ہے اور شاید آپ کو یہ جان کر افسوس بھی ہوگا کہ اس جاب کے لیے فائنل سلیکشن تو ہو چکا ہے کیوں کہ آج کے انٹرویو کی آپ آخری امیدوار تھیں اس لیے میں نے سوچا کہ وقت گزاری کے لیے آپ سے بھی تھوڑی سی ملاقات اور بات چیت کر لی جائے۔'' اس شخص کا انداز تمسخر آمیز تھا۔

''چلیں' اچھا ہی ہوا کہ آپ نے پہلے ہی فائنل سلیکشن کر لیا۔ اگر آپ مجھے سلیکٹ کر بھی لیتے تو میں آپ جیسے شخص کے ساتھ کام کرنا قطعی پسند نہیں کرتی جو آفس میں کام سے زیادہ صرف ملاقاتوں اور بات چیت میں ٹائم ضائع کرتا ہو۔'' اس نے شدید تپے ہوئے لہجے میں کہہ کر اس شخص کے سامنے رکھی ہوئی اپنی فائل تیزی سے اٹھائی اور جانے کے لیے مڑ گئی۔

''ارے' آپ تو ناراض ہو گئیں' ایک منٹ پلیز! دیکھیں' ہو سکتا ہے کہ میں اس امیدوار کو جس کا سلیکشن ہوا ہے' ریجیکٹ کر دوں اور آپ کو منتخب کر لوں۔'' وہ اس کی اس حرکت کے باوجود چہرے پر فرحت سی مسکراہٹ سجا کر بولا۔

''بہت شکریہ' میں نے ابھی کہا نا کہ میں آپ جیسے لوگوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتی۔ مجھے تو آپ بہت ہی کمزور ذہن کے مالک لگتے ہیں۔ جلدی میں فیصلے بھی کر لیتے ہیں اور اپنے ہی فیصلوں کو بدلنے میں ذرا بھی ٹائم نہیں لگاتے۔'' اس نے تنک کر کہا۔

''آپ جا سکتی ہیں۔'' اس بار اپنی بے عزتی پر وہ بھی تپ کر بولا تو سبین تیزی سے باہر نکل آئی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس نے ایک اچھی ملازمت جو اسے مل سکتی تھی، کھو دی ہے مگر کیا کرتی۔ اس نے اس شخص کی آنکھوں اور رویے میں جو گھٹیا پن دیکھا تھا' اس کے بعد کہاں ممکن تھا کہ اس کا دل آمادہ ہوتا۔ وہ اک ٹھنڈی سانس لے کر اسٹاپ پر کھڑی ہو گئی اور اپنے مطلوبہ روٹ کی بس کا انتظار کرنے لگی۔

☆......☆......☆

وہ جب گھر میں داخل ہوئی تو تھکن اور گرمی سے برا حال تھا۔ اس نے ہاتھ میں تھامی ہوئی فائل اور پرس چارپائی پر پھینکا اور خود بھی چارپائی پر ڈھے گئی۔

''کیا ہوا بیٹی' کوئی امید بندھی؟'' اماں ہاتھ میں پانی کا گلاس لے کر اس کے قریب آتے ہوئے بولیں۔

''نہیں اماں!'' اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

''مل جائے گی نوکری بھی۔'' اماں نے اس کا ہاتھ آنکھوں سے ہٹایا اور اس کے سامنے پانی کا گلاس کر دیا۔ اماں کو دیکھ کر وہ اٹھ گئی اور پانی پی کر اپنے خشک حلق کو تر کرنے لگی۔

''مجھے تو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ اب کیسے گزارہ ہو گا؟ چند روپے پڑے ہیں' آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں رہا اور تم ہو کہ سارے پیسے میری دواؤں میں ضائع کر دیتی ہو۔'' اماں اس کے قریب بیٹھتے ہوئے فکر مند لہجے میں بولیں۔

''آپ پریشان نہ ہوں اماں! اللہ مسبب الاسباب ہے' وہ آمدنی کا کوئی نہ کوئی ذریعہ نکال ہی لے گا اور کچھ نہیں تو میں گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دوں گی اور آپ نے یہ کیا بات کی کہ آپ کی دواؤں میں پیسے ضائع ہوتے ہیں؟ میری پیاری اماں! آپ ہیں تو سب کچھ ہے' ذرا میرے بارے میں تو سوچیں' ابا نہیں رہے اور اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میرا کیا ہو گا۔'' اس نے محبت سے اماں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو اماں نے سر ہلا دیا۔

سبین کو شدید بھوک کا احساس ہوا تو وہ کھانے کے ارادے سے اٹھی اور بولی۔

''اماں! آپ نے کھانا کھا لیا؟''

''نہ میری بچی! بھلا یہ کیسے ممکن ہے' میری بچی تو بھوکی پیاسی سڑکیں ناپے اور میں گھر میں مزے سے بیٹھ کر کھانا کھا لوں۔'' اماں نے دکھی لہجے میں کہا۔

''اماں! دو تین روز پہلے آپ بتا رہی تھیں کہ زینت آنٹی اپنے بچوں کے ٹیوشن پڑھانے کے لیے کوئی ٹیوٹر تلاش کر رہی ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ ان کے بچوں کو میں پڑھاؤں گی۔'' سبین نے اچانک ایک خیال آتے ہی سر اٹھا کر اماں سے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا' جیسی تمہاری مرضی۔'' اماں نے پھر ایک گہری سانس لی اور برتن اٹھا کر کچن میں جانے لگیں۔

''ارے اماں! آپ رہنے دیں' میں برتن سمیٹ لیتی ہوں۔ آپ زیادہ کام مت کیا کریں۔ آرام کریں۔ خدا خدا کر کے تو آپ کی طبیعت تھوڑی بہتر ہوئی ہے۔'' اس نے اماں کو روکنا چاہا پھر اس نے اماں کے چہرے پر مسلسل فکر مندی کے تاثرات دیکھے تو انہیں سمجھانے لگی۔

''اماں! آپ کو پتا ہے آج کل ٹیوشن پڑھانے میں بڑی کمائی ہے۔ لوگ ٹیوشن ہی کے ذریعے ہزاروں روپے کما رہے ہیں۔''

''پھر بھی بیٹا! خالی صرف پیٹ بھرنے کا تو سوال نہیں ہے۔ میرے آگے سب سے بڑا مسئلہ تمہاری شادی کا ہے' کیا کمی ہے میری بچی تیرے اندر؟ حسین ہے' سگھڑ ہے' پڑھی لکھی ہے' نہیں ہے تو دولت اور بڑا گھر نہیں ہے اور لوگ آج کل تو صرف اونچے گھرانوں میں ہی جاتے ہیں۔'' اماں نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں نے کہا ناں کہ آپ ناحق یہ ساری باتیں سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی ہیں۔ سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے' وہ جو کام کرنا چاہتا ہے' اس کے لیے ہر سبیل پیدا کر دیتا ہے۔'' اس نے کہا اور چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

☆......☆......☆

سبین نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو اماں اور ابا کی پُر شفقت سائے تلے پایا۔ وہ اکلوتی تھی اس لیے اماں ابا کا سارا پیار اس کے حصے میں آیا۔ اللہ تعالیٰ نے حسن کی دولت سے اسے جی بھر کر نوازا تھا۔ دودھ اور شہد میں گھلی شہابی رنگت' ستواں ناک' بڑی بڑی غلافی آنکھیں اور اونچے لمبے قد کے ساتھ بال بھی خوب دراز تھے۔ اماں آج تک اس کے بالوں میں اپنے ہاتھوں سے

تیل ڈالا کرتی تھیں اور باقی خوبصورتی لائف بوائے شیمپو پوری کر دیتا تھا۔ ابا ایک کمپنی میں کام کرتے تھے۔ وقت بہت اچھا نہیں تو برا بھی نہیں تھا۔ وہ بی ایس سی کے فائنل ایئر میں تھی کہ ابا اچانک ہی چل بسے۔ اماں نے اپنے سلیقے سے جو تھوڑی بہت رقم پس انداز کی تھی، وہ کچھ ابا کے کفن دفن وغیرہ میں اٹھ گئی، باقی بیٹھے بیٹھے ختم ہونے لگی۔

بی ایس سی کا رزلٹ آیا تو اس نے جاب کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ اس بھرے پرے شہر میں جہاں لاکھوں نوجوان اپنی ڈگریاں ہاتھوں میں اٹھائے خوار ہو رہے تھے، وہاں وہ بھی اس دوڑ میں شامل ہو گئی مگر ہر جگہ تجربہ مانگتے تھے، وہ تجربہ کہاں سے لاتی، ایک آدھ جگہ بات بنتی دکھائی دی مگر ان لوگوں کی آنکھوں سے چھلکتی ہوس کی اس سے چھپی نہ رہ سکی، سو جاب کی تلاش کا یہ سلسلہ ہنوز جاری تھا مگر آج تو وہ بہت ہی بددل ہو کر واپس آئی تھی۔ اس نے باہر جا کر جاب تلاش کرنے کا فیصلہ موقوف کر دیا تھا۔ اس کے آگے پیچھے کون تھا۔ نہ باپ نہ بھائی، وہ تنہا زمانے کے سرد و گرم کا کہاں مقابلہ کر سکتی تھی۔

☆......☆......☆

وہ بس میں بیٹھی اسی مسئلے پر مستقل سوچ رہی تھی۔ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اچانک اس کے پاس بیٹھی خاتون نے اُسے مخاطب کیا۔

''کیا بات ہے بیٹی؟ بہت پریشان دکھ رہی ہو۔''

وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ ''نہیں آنٹی بس ایسے ہی۔''

وہ شفقت سے مسکرائیں۔ ''کیا کرتی ہو، پڑھتی ہو یا جاب کرتی ہو؟''

''آنٹی بی ایس سی ہوں۔ جاب کے لیے تلاش جاری ہے مگر......''

''مگر کیا...... یقیناً وجہ یہی ہوگی کہ لوگ ضرورت مندوں کو پورا کیش کر کے پیسہ دینا چاہتے ہیں۔ آہ! کب بدلے گا نظام۔ کب نوکری ایمانداری سے ہر بندے کو ملے گی۔''

''انشاء اللہ آنٹی! مجھے ضرور نوکری ملے گی۔ میں اپنے خدا پر پورا بھروسا رکھتی ہوں اور پھر اپنی محنت پر۔''

''اللہ تمہارے مان کو سلامت رکھے۔ بیٹی یہ بتاؤ کہ پڑھائی کے علاوہ بھی کوئی کورس وغیرہ کیے ہیں تم نے۔''

''نہیں آنٹی مجھے پڑھنے کے علاوہ دوسرا کوئی شوق نہیں تھا۔ سو بس پڑھائی، پڑھائی اور بس پڑھائی......'' وہ مسکرائی۔

''چندا! پڑھنے کے علاوہ بیوٹی پارلر، سلائی کڑھائی وغیرہ سے متعلق بھی کام آنا چاہیے لڑکیوں کو۔''

''میری امی بھی یہی کہتی ہیں امی بہت اچھی بیوٹیشن اور ہیئر ایکسپرٹ بھی رہ چکی ہیں لیکن خاندان کی حد تک مگر آنٹی امی کی بیماری نے انہیں کسی قابل نہیں چھوڑا۔''

''اللہ کرم کرے گا۔ تم میرا کارڈ رکھ لو۔ میرا پارلر ہے۔ میں وہاں لڑکیوں کو بیوٹیشن کے طور پر ایکسپرٹ بھی کرتی ہوں اور میرا دعویٰ ہے کہ میرے پارلر میں کام کرنے والی لڑکی قسمت بنا جاتی ہے۔'' انہوں نے 'لائف بیوٹی پارلر' کا کارڈ پرس سے نکال کر اُسے دیا۔

''لائف بیوٹی پارلر'' اس نام پر وہ حیران ضرور ہوئی۔

''ارے تعجب کس بات کا ہو رہا ہے۔ سب کچھ لائف ہی کے ساتھ تو ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولیں اور اس نے بھی کارڈ اپنے پاس رکھ لیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن وہ Life Beauty Parlour کے سامنے کھڑی تھی۔ صفیہ نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ اور پھر اُس چھوٹے مگر چلتے ہوئے پارلر میں اُس کی ٹریننگ اسٹارٹ ہو گئی۔

کہتے ہیں جس کام میں دل لگا کر محنت کی جائے اُس کا نتیجہ بھی بہت بہتر سامنے آتا ہے۔ دو ماہ کی محنت میں سین بہترین بیوٹیشن بن گئی تھی۔

☆......☆......☆

کئی دنوں سے سدرہ بیگم کا بی پی ہائی ہو رہا تھا۔ سر میں درد اور چکر بھی بہت آ رہے تھے۔

''امی! آپ آج ڈاکٹر کو دکھانے ضرور چلی جائیے گا۔ میں گاڑی اور ڈرائیور کو بھیج دوں گا۔ میں آپ کو خود لے جاتا مگر آج کل کلینک میں مریضوں کا بہت رش ہوتا ہے۔ چھوٹے بچوں میں ڈائریا کی وباء پھیلی ہوئی ہے۔'' عظیم نے صبح ہاسپٹل جاتے ہوئے کہا۔

''ارے چھوڑو بیٹا! تم خود کیوں نہیں دوا لکھ دیتے میں بہت الجھتی ہوں مریضوں کی لائن میں بیٹھنے سے۔'' سدرہ بیگم نے کہا۔

''نہیں امی' ڈاکٹر انیل شوگر کے اسپیشلسٹ ہیں اور وہی آپ کا علاج کر رہے ہیں تو آپ کو ان ہی کے پاس جانا چاہیے۔ میں ان سے فون پر بات کر لوں گا۔'' عظیم نے کہا اور انہیں تاکید کرتے ہوئے نکل گئے۔

صبح گیارہ بجے ڈرائیور گاڑی لے کر آ گیا تو سدرہ بیگم کو مجبوراً ڈاکٹر انیل کے کلینک جانا پڑا۔

وہی ہوا جس بات سے انہیں کوفت ہوتی تھی۔ مریضوں کا اچھا خاصا رش تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ عظیم نے فون کر کے ٹائم لے لیا تھا۔ وہ وہاں پہنچیں تو ریسپشن پر انہیں ان کا نمبر بتا دیا گیا۔ کلینک میں ڈاکٹر کے روم کے باہر صوفے اور کرسیاں رکھی تھیں۔ صوفے بھر چکے تھے کرسیاں خالی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گئیں اور وقت گزاری کے لیے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگیں۔ اچانک ان کی نگاہ قریبی صوفے پر بیٹھی سبین پر پڑی تو ان کی نگاہیں تو جیسے ہٹنا ہی بھول گئیں۔ اتنی حسین اتنی دلکش اور اتنی ہی معصوم صورت اور گھنیرے لانبے بال!! وہ ایسی لڑکی ہی تو چاہتی تھیں۔

نہ جانے کون ہے' کس گھر کی بیٹی ہے کیا خاندان ہے' وہ سوچتے ہوئے ٹکٹکی باندھے اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

اچانک سبین کی نگاہ سدرہ بیگم پر پڑی اور اس نے جو انہیں یوں اپنی جانب محویت سے تکتے دیکھا تو جھینپ گئی۔ سدرہ بیگم بھی اپنی چوری پکڑے جانے پر شرمندہ سی تھیں۔ اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے وہ دھیرے سے مسکرا دیں۔

''السلام علیکم!'' اس نے بھی جواباً دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ مترنم لہجے میں کہا۔

''جیتی رہو!'' انہوں نے خوش ہو کر کہا پھر قدرے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا تم اپنے چیک اپ کے لیے آئی ہو؟''

''جی نہیں آنٹی میری اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کل تو وہ آئی تھیں مگر آج ان کی طبیعت کافی خراب ہے اس لیے میں تنہا ہی آئی ہوں تاکہ ڈاکٹر صاحب کو اماں کی کنڈیشن بتا سکوں۔''

''اچھا' اچھا!'' انہوں نے بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔

''کیا نام ہے تمہارا اور کہاں رہتی ہو؟'' وہ جلد از جلد اس لڑکی کا پتا جان لینا چاہتی تھیں اس لیے موقع ملتے ہی جھٹ نام و پتا پوچھ ڈالا۔

''سبین' اور میں نارتھ کراچی سے آئی ہوں۔ کافی دور ہے مگر کیوں کہ ڈاکٹر اچھے ہیں اس لیے آنا پڑتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''نارتھ کراچی میں۔'' انہوں نے مایوسی سے دہرایا پھر پوچھا۔ ''تمہارے بہن بھائی کتنے ہیں اور والد صاحب کیا کام کرتے ہیں؟''

''گھر میں صرف میں اور اماں ہی ہیں۔ بہن بھائی کوئی ہے نہیں اور والد صاحب کا چند ماہ پیشتر ہی انتقال ہوا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو کیا گزر بسر کرنے کے لیے تم کوئی جاب کرتی ہو یا والد صاحب بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں؟'' انہوں نے مزید پوچھا۔

''جاب بہت تلاش کی مگر نہیں مل سکی' بس اب میں ایک پارلر میں جاب کرتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

اتنے میں اس کا نمبر پکارا گیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور سدرہ بیگم اس کے پارلر کا نام پوچھتی پوچھتی ہی رہ گئیں۔

☆......☆......☆

سدرہ بیگم اس رات دیر تک سبین کے بارے میں سوچتی رہیں۔ اس لڑکی میں وہ ساری خوبیاں موجود تھیں جیسی وہ اپنے عظیم کی دلہن میں چاہتی تھیں مگر وہ اتنے غریب گھرانے میں اپنے عظیم کی شادی نہیں کر سکتی تھیں۔ آخر اس کا کوئی اسٹیٹس ہے' وہ اپنے ملنے جلنے والوں سے کیا کہے گا کہ اس نے ایسے گھرانے میں شادی کیوں کی ہے اور شاید یہی ٹینشن تھی کہ ان کا بی پی نارمل نہیں ہو رہا تھا حالانکہ وہ ڈاکٹر کی بتائی ہوئی تمام دوائیں پابندی سے لے رہی تھیں۔

اس روز عظیم نے کہا کہ آپ آج اور جا کر ڈاکٹر سے ملیں اور انہیں اپنی ساری کیفیت بتائیں اور اس بار بھی جب وہ ڈاکٹر کے کلینک پہنچیں تو سبین کو وہاں پہلے سے موجود پایا۔ وہ اس سے کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ ان کی نگاہ اس کے ساتھ بیٹھی خاتون پر پڑی اور وہ بری طرح چونک پڑیں۔ گھڑی کی چوتھائی میں وہ پچیس سال پہلے اپنے ماضی میں پہنچ گئیں۔ وہ اور کوئی نہیں' ان کی اسکول کی دوست حلیمہ تھیں۔

''تم حلیمہ ہو ناں؟'' انہوں نے حیرت انگیز پرمسرت لہجے میں پوچھا۔

''ہاں' میں حلیمہ ہوں اور تم سدرہ؟'' انہوں نے کہا۔

''آج کتنے عرصے کے بعد تمہیں دیکھا ہے۔ کیسی

ہو؟ کہاں رہتی ہو؟ کتنے بچے ہیں؟'' انہوں نے ایکسائیٹڈ ہوکرایک ساتھ کئی سوالات کرڈالے۔

''ارے' آرام سے بھئی'ایک ایک کر کے پوچھو۔ اچھا ٹھہرو میں تمہارے پاس آجاتی ہوں۔'' انہوں نے سدرہ بیگم سے کہا اور اٹھ کر ان کے برابر میں جا بیٹھیں پھر بولیں۔ ''کیسی ہوں' یہ تم دیکھ ہی رہی ہو' شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ ہوں اس لیے تمہیں یہاں دکھائی دے رہی ہوں۔ نارتھ کراچی میں رہتی ہوں اور میری ایک ہی بیٹی ہے۔ شوہر کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں تمہیں اپنی بیٹی سے ملواتی ہوں' دیکھو سبین!'' حلیمہ نے سدرہ بیگم کے سوالات کے جوابات دینے کے بعد سبین کو مخاطب کیا توانہیں خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

''ارے' یہ تمہاری بیٹی ہے؟ ماشاء اللہ' بہت پیاری بیٹی ہے' کل میری اس سے ملاقات ہوئی تھی اور بھئی' میں سچ کہوں کہ تم بہت ہی خوش نصیب ہو جو اتنی پیاری بیٹی اللہ نے دی ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہوسدرہ! واقعی یہ بہت ہی پیاری بیٹی ہے' بس تم یوں سمجھ لوکہ اب تو یہی میرا کل سرمایہ ہے۔ اللہ اس کا نصیب اچھا کرے۔'' حلیمہ نے محبت پاش نگاہوں سے سبین کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جو نہایت دلچسپی سے بچھڑی ہوئی سہیلیوں کی اس ملاقات کو دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

جب سے سبین کے منہ سے سدرہ بیگم نے Life Beauty Parlour کا سنا تھا۔ اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُڑ کر صفیہ کے پاس پہنچ جائیں۔

گھر آتے ہی انہوں نے صفیہ کے پارلر میں دوڑ لگائی۔

''خیریت تو ہے؟''

''ہاں بس...... اللہ کا شکر ہے۔''

''اتنی بھاگم بھاگ آنے کی وجہ تو بتادو۔''

''صفیہ مجھے یہ بتادو کہ لائف تم نے اپنے پاس چھپا رکھی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ارے بہن تم نے میری لائف، میری سبین کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ اور......''

''اوہ...... اچھا تو یہ بات ہے۔ تو تمہیں اپنے لائف بوائے شیمپو والی بہو...... جس کے لمبے، سیاہ، لہراتے بال ہوں۔ یعنی عظیم کی دلہن مل ہی گئی۔''

''بالکل بالکل! بھئی میں تو سچ میں خدا کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتی۔''

☆......☆......☆

دوسرے دن سدرہ بیگم اپنے بیٹے عظیم اور صفیہ کو لیے اپنی سہیلی حلیمہ کے گھر موجود تھیں۔ عظیم نے سبین کو سدرہ بیگم کی طرف سے ایک گفٹ پیک دیا تھا۔

''بیٹی تم اسے کھولوتو ذرا ہمارے سامنے۔'' سبین نے سدرہ بیگم کے کہنے پر گفٹ پیک کھولا۔ اندر سے لائف بوائے شیمپو کے تین بڑے شیمپو نکلے۔

''اس کا مطلب جانتی ہو۔'' صفیہ بیگم نے سبین کو ٹہوکا دیا۔

''اس کا مطلب میں بتاتا ہوں آپ کو۔'' عظیم کھل کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''میری ماں کی خواہش ہے کہ ان کی بہو لہراتے ہوئے بالوں والی ہو۔ گھنے سیاہ چمکدار بال ان کی کمزوری ہیں۔ آپ جب یہ لائف بوائے شیمپو استعمال کریں گی تو ان کی فیورٹ بہو بن کر ہماری ہو جائیں گی۔''

''ارے واہ...... ہم سے تو پوچھا نہیں اور بہو بھی بنالی۔'' اب حلیمہ بیگم بولی تھیں۔

''تم سے بھی اگر پوچھ کر بیٹی کو بٹی بنایا تو کیا فائدہ...... یہ تو لائف نہ ہوئی......'' سدرہ بیگم نے حلیمہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''آج سے آپ کی لائف ہماری لائف ہوئی۔'' صفیہ نے کہا تو اچانک سبین بول اٹھی۔

''ایک منٹ...... میری امی مجھے لائف بوائے شیمپو ہی بچپن سے استعمال کراتی ہیں۔ اگر آج لائف بوائے نہ ہوتا تو آنٹی بہو کے سلسلے میں اس قدر ایکسائٹڈ نہ ہوتیں اور میں ان کی بہو نہ بنتی۔ Thank You تو لائف بوائے کا ہوانا۔''

''Thank You Life Bouy Shampoo۔ تم نے آئیڈیل ملادیے۔''

سب کے مشترکہ قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے تھے۔

☆☆......☆☆

قسط 10

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں
بے ترتیب کردیں گی، رفعت سراج کے جادوگر قلم سے

یاور کو کسی سے کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جس شوہر کی بیوی لیبر روم میں ہو اسے لیبر روم سے باہر کھڑے خیر خواہوں کے چہروں سے اپنے ہر سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ اگر وہ تاخیر سے پہنچا ہو تیسری بار رحمت برسنے کی خبریں سنائی گئی ہو جیسے زمانہ جاہلیت کا دور اپنی جگہ موجود ہو اور صدیوں کا سفر
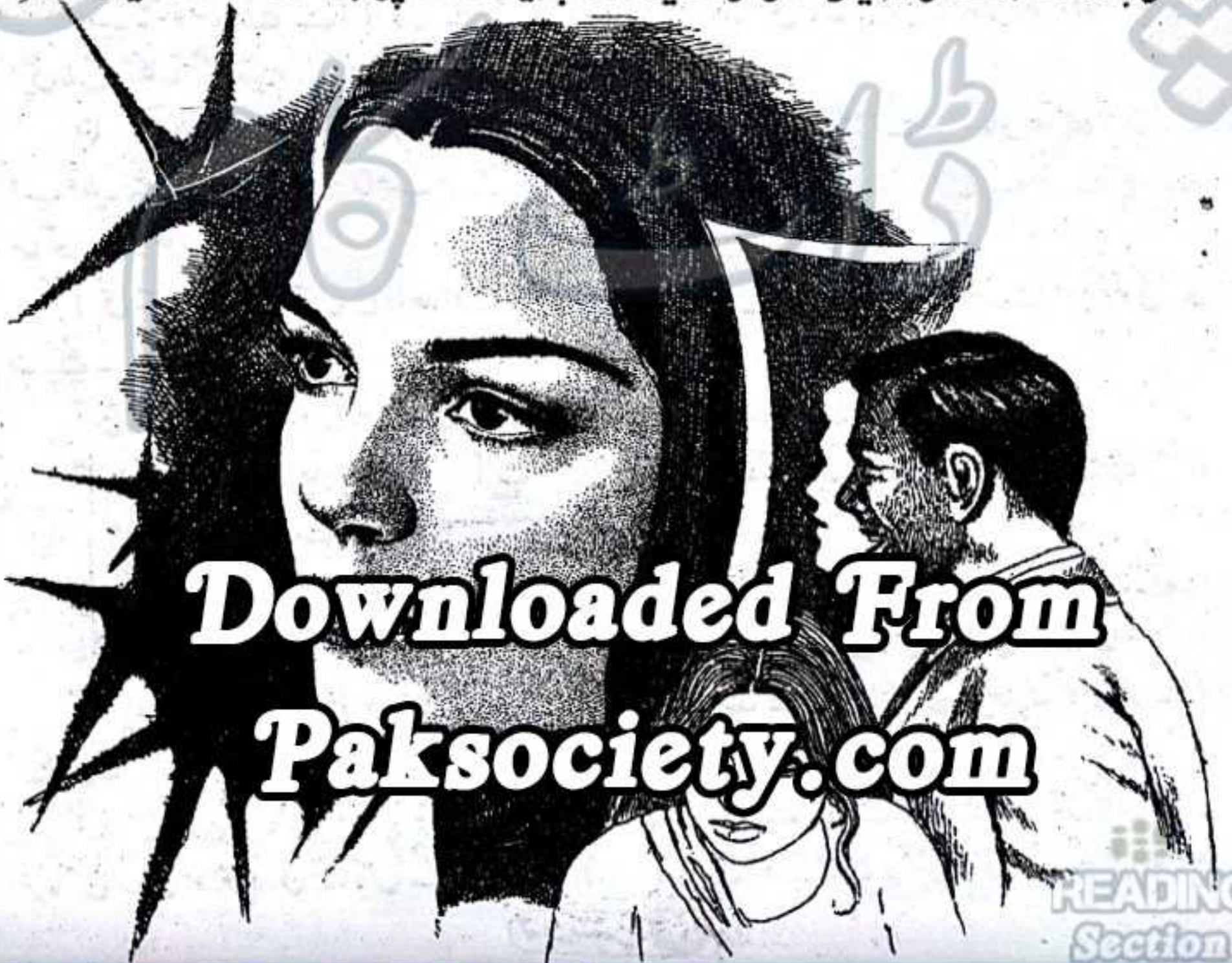
کسی تبدیلی کے بغیر طے ہوتا رہا ہو۔
حامد حسین تو طنز کے نشتر برسا کر پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے چلے گئے مگر فردوس کو تو دل کی بھڑاس نکالنا باقی تھا۔
سر پر رکھ کرنا جو اپنی بیٹی اور اس کی تین بیٹیوں کو......
ایسے نہ کہیں ایمن میری بیٹی ہے مگر اس کی تین بچیاں تو آپ کا اپنا خون ہیں...... عطیہ بیگم اخلاقیات نہیں پڑھا رہی تھیں بلکہ فردوس کا منہ بند کرنے کی بے ساختہ سی کوشش کر رہی تھیں جس کے منہ کے آگے خندق تھی...... مبادا وہ کچھ سننے کو ملے جس کی تاب لانا مشکل ہو۔
ارے پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان...... ہم بھر پائے دور تک صرف خرچہ ہی خرچہ ...... فردوس غرانے لگی۔
بیٹے بھی بغیر خرچے کے نہیں پلتے...... ان کا خرچ تو زیادہ ہوتا ہے...... زیادہ کمانے کے لیے ماں باپ کو چھوڑ کر بھی چلے جاتے ہیں...... خدمت تو بس بیٹی ہی کرتی ہے آخر تک ماں باپ کا ساتھ دیتی ہے عطیہ بیگم نے فردوس کو ٹھنڈا کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔
بیٹے خرچہ کرواتے ہیں...... بھولا کھوں کا جہیز بھی لاتی ہے۔
لڑکا قابل ہو تو بڑے سے بڑا رئیس اسے اپنا داماد بنانا چاہتا ہے...... اب زیادہ تقریر کرنے کی ضرورت نہیں......
عطیہ بیگم کو صدمے سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ یاور ابھی تک بالکل خاموش کھڑا تھا اس نے اپنی ماں کو تکلفاً بھی خاموش کرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔
بیٹا...... تم تو کچھ بولو...... جو روح دنیا میں آئی ہے وہ تو تمہارے جگر کا ٹکڑا ہے...... ماں کو سمجھاؤ بیٹا......
اب عطیہ بیگم کے پاس یاور کو مخاطب کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ فردوس نے کڑے تیور کے ساتھ یاور کو گھورا۔
آنٹی میں اپنے پیرینٹس کی واحد اولاد ہوں...... میری کوشش ہوتی ہے کہ میری وجہ سے ان کو کوئی دکھ نہ پہنچے۔
آج میں جو کچھ بھی ہوں جو کچھ بھی میرے پاس ہے ان ہی کی وجہ سے ہے۔"
میں امی کو لے کر گھر جا رہا ہوں...... آپ ایمن کا خیال رکھیے۔ یہ کہہ کر یاور نے فردوس کو چلنے کا اشارہ کیا...... عطیہ بیگم دکھ وحیرت سے پتھر ہونے لگیں۔
بچی کو نہیں دیکھو گے......؟ وہ بمشکل پوچھ رہی تھیں۔ آنسوؤں کے پھندے حلق میں اٹک رہے تھے۔
ماشاءاللہ...... نانا...... نانی...... خالہ، خالو...... رشتے دار محلے والے ہیں ناں...... جی بھر کر دکھاؤ......
چلو یاور میری تو بلڈ پریشر کی گولی بھی جلدی میں رہ گئی۔ اب مجھے یہ تھوڑی ہی پتا تھا کہ منحوس خبر سننے کو ملے گی۔
فردوس نے یاور کا بازو دبوچا اور یوں کھینچتی ہوئی آگے بڑھی جیسے بچے نے بھرے بازار میں ایسی چیز کی فرمائش کر دی ہو جو پوری کرنا ماں کے بس میں نہ ہو اور وہ روتے ہوئے بچے کو کھینچتی ہوئی لے جا رہی ہو۔

عطیہ بیگم دونوں کو اس وقت تک دیکھا جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گئے......
چار قدم کے فاصلے پر جنت کا تازہ پھول باپ کا منتظر ہی رہ گیا...... جس نے اسے جنت سے زمین پر بلانے کے لیے بڑی اونچی آواز میں پکارا تھا۔

☆......☆......☆

چمن ماہ وش کو نوڈلز کھلا رہی تھی۔ برابر میں ماہ پارہ خود ہی کھا رہی تھی۔ چمن کے کان فون کی رنگ پر یوں لگے ہوئے تھے......
جیسے مرغی چوزوں کے ساتھ دانہ چگتے ہوئے چوکس رہتی ہے اور اپنے روحانی راڈار پر چیل کی آمد کا سگنل وصول کر لیتی ہے۔
ماہ وش کو کھلاتے کھلاتے یونہی نظر موبائل پر پڑ جاتی تھی جیسے اس کی چھٹی حس نے مطلع کر دیا تھا کہ فون ملانے کی نوبت آ گئی ہے فون کی گھنٹی کے ارتعاش نے ماحول میں نئے سرے سے زندگی کی اہمیت کو اُجاگر کیا۔
خالہ...... مما کا فون ہے...... مما سے پوچھیں...... بھائی کو لے کر آ رہی ہیں ناں......
چمن نے باؤل رکھ کر لپک کر فون اٹھایا۔ کال کے نام پر امی کا نمبر Blink ہو رہا تھا۔
عطیہ بیگم ہی کال کر سکتی تھیں...... اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال ریسو کی۔
مہ پارہ قریب آ کر سر اٹھا کر چمن کی طرف دیکھ رہی تھی۔
السلام و علیکم امی...... خیریت ہے ناں...... بس آپ کے فون کا ہی انتظار کر رہی تھی۔
خالہ نانو سے پوچھیں بھائی زیادہ مہنگا تو نہیں ہے......؟ مما کے پاس بہت سارے پیسے ہیں...... پاپا نے دیے تھے...... میں نے خود دیکھا تھا۔
ایک طرف مہ پارہ بول رہی تھی...... دوسری طرف عطیہ بیگم......
چمن...... بیٹا...... تمہیں اللہ نے ایک اور بہت پیاری سی بھانجی سے نوازا ہے...... اللہ نیک نصیب کرے آمین۔
میں ایمن اور بچی کو لے کر گھر چلی جاؤں گی تم دونوں بچیوں کو لے کر میری طرف ہی آ جانا......
امی...... چمن کے پتھریلے وجود نے بمشکل زندگی تھرکی......
ایمن میں زیادہ بات نہیں کر سکتی...... خدا حافظ بیٹا......
یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آ رہا تھا...... ایمن بیٹی کو جنم دیتی پھر دو تین مہینے ماں کے گھر گزارتی۔
پہلی بار تو اس لیے ہوا کہ پہلی زچگی تھی...... دوسری بار اس لیے کہ الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے پتا چل گیا تھا کہ دوسری بھی بیٹی ہے۔
تیسری بار...... اگر بیٹی ہوئی تو وہی ہونا چاہیے جو دوسری بار ہوا تھا خالہ نانو نے فون بند کر دیا......؟
بھائی نہیں ملا......؟ نانو سے بولیں پاپا اور پیسے دے دیں گے...... پاپا کے پاس بہت سارے پیسے ہیں......
چمن نے اپنے اندر آنسوؤں کے طوفان کی زبردست ہلچل محسوس کی مگر معصوم بچیوں کی خاطر قیامت کے ضبط سے گزری......

جھک کر مہ پارہ کو گلے سے لگالیا اس کے گال پر بوسہ دیا۔
میری جان...... بھائی پیسوں سے نہیں ملتے......
بھائی پیسوں سے ملتا تو کسی کو کبھی بہن نہ ملتی۔
اللہ میاں نے آپ کے لیے ایک بہت پیاری باربی ڈول جیسی بہن جنت سے گفٹ کی ہے۔
بہن......؟ تو پھر بھائی کو لینے۔بعد میں جائیں گے......؟ مہوش نے پہلی بار اپنی معصومانہ مایوسی کا مظاہرہ کیا کیوں کہ وہ تو اپنی کلاس فیلوز کو بھی مطلع کر چکی تھی کہ اس کی ماما بھائی لینے گئی ہیں۔
ہاں بیٹا...... بھائی کو لینے بعد میں جائیں گے۔
خالہ...... کیا کل جائیں گے...... مہوش نے بڑی بے صبری سے پوچھا تھا بہت دنوں کے بعد...... ماما بہت تھک گئی ہیں بیٹا......
اب چمن سے ضبط کا محال تھا کہ وہ بچیوں کو چھوڑ کر جلدی سے واش روم میں گھس گی...... واش بیسن کا Tap کھولا اور منہ پر چھینٹے مارنے لگی...... آنسو اور پانی دونوں چہرہ ساتھ ساتھ دھل رہا تھا۔ وہ زمانہ جاہلیت کی عورت کی طرح بیٹی کی خبر سن کر نہیں رو رہی تھی رونا تو بے قصور بہن کی بے کسی پر آرہا تھا۔
جو اس وقت خیمہ زن ضرور ہوگئی تھی۔
مگر شب خون کے خطرے سے تو نجات نہیں تھی۔

☆......☆......☆

تھوک کر چاٹا تھا...... منہ کی کھا کر واپس آئی تھیں...... آتے ہی بہن کا بچہ پیدا کروانے واپس چلی گئیں۔
خیر سے تیسرا بچہ پیدا ہو رہا ہے خوش فہمی یہ ہے کہ تخت پاکستان کے لیے ولی عہد پیدا ہو رہا ہے...... بانو آپا کی راج دلاری دوست بس میں چنگاریاں چھوڑنے صبح ہی آدھمکی تھیں اور آتے ہی حسب ذائقہ ڈش بھی تیار ملی تھی۔
ارے اب دھرے ہیں تخت و تاج...... جن کے پاس ہیں وہی یوں سنبھال رہے ہیں جیسے سیلاب کے پانی میں بہتے اپنے چار برتن بچانے کی کوشش کر رہے ہوں......
رخسانہ نے اپنے مخصوص اکل کھرے انداز میں دوست کی حالات پر حاضرہ پر عملی کوتاہی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔
ارے میں نے تو مثال کے طور پر کہا تھا...... بانو آپا نے خفت مٹائی بہو کی بہن تو تیسری مرتبہ ماں بن رہی ہے...... اپنی بہو کی سمجھاؤ رخسانہ نے بی جمالو کی روح کو عقیدت مندانہ سلام ارسال کیا۔کیا سنائیں...... نہ ساون سوکھے نہ بھادوں ہرے...... ارے بیٹا ہی پٹھے ہاتھ دھرنے نہیں دے رہا...... میں تو آج ہی اس کی دوسری شادی کر دوں...... لڑکی بھی دیکھ لی ہے...... خود ہی دیکھ لی...... بیٹے کو بھی دکھا دو...... مرد ذات کو پھسلتے دیر نہیں لگتی۔
رخسانہ نے بانو آپا کی بار درمیان میں جو اچک لی جیسے بھوکا دونوں ہاتھوں سے دستر خوان پر ٹوٹا پڑ رہا ہو۔

بھیا...... کیا جتن نہیں کیے...... کسی پھونک جھاڑ میں اثر نہیں...... مجھے تو اپنی بہو ہی کوئی بدروح لگتی ہے جو پنجے گاڑ کر میرے بیٹے سے چمٹ گئی ہو۔

شکست خوردہ بانو آپا کے زہریلے لہجے نے چند ثانیے کے لیے رخسانہ کو بھی گومگو سا کر دیا۔

پھنس گئی ہوں گی کسی دو نمبر عامل کے پاس...... شہداد پور میں میری پھوپھو رہتی ہیں ان کے پڑوس میں ایک پیر صاحب ہیں دور دور سے لوگ آتے ہیں...... مگر اب تم کہو گی کہ شہداد پور تو بہت دور ہے۔

ارے میرے اندر جو تڑپ ہے آگ برابر ہے۔ چین نہیں ہے، ایک پل شہداد پور چھوڑو...... میں تو شکاگو بھی چلی جاؤں گی۔ بانو آپا نے بے صبری سے تلخ کلامی کی تھی۔ اچھا تو پھر...... رخسانہ نے بانو آپا کے کان میں کالی کا منتر پڑھنا شروع کر دیا۔

حالانکہ اونچا بھی بولتیں تو دیواریں ہی سنتیں مگر عادت سے مجبور تھیں۔

☆......☆......☆

بچی نرسری میں اور ایمن ICU میں پہنچ گئی تھی۔

بچیاں مشکور احمد کے پاس تھیں۔

چمن پریشان حال ماں کی دلجوئی میں مصروف تھی۔

امی آپ کو ہمت سے کام لینا ہوگا...... یاور بھائی وقتی شاک اور ماں کے تاثرات کی وجہ سے چلے گئے ہوں گے گھر جا کر آرام سے سوچیں گے تو احساس ہوگا کہ دنیا میں آنے والی بچی انہی کے وجود کا حصہ ہے۔ آپ ٹینشن نہ لیں ابھی تو سارا دھیان اپنی بچی کی طرف ہے...... جیسے ابھی تک ہوش نہیں آیا......

عطیہ بیگم کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

انشاء اللہ...... آپا کو ہوش آجائے گا...... کمزور بھی تو بہت ہوگئی ہیں...... دن رات کڑھتی رہتی ہیں...... آپ دعا کریں...... چمن نے عطیہ بیگم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پیار سے دبایا۔

دعا کے علاوہ میرے پاس اور کیا ہے......؟ کن درندوں میں پھنسا دیا تھا میں نے اپنی بیٹی کو...... تم تو پھر بھی بول پڑتی ہو اس کے منہ میں تو زبان ہی نہیں ہے...... ایک آہ سرد عطیہ بیگم کے سینے سے آزاد ہوئی۔

بس یہی تو کمزوری تو ان ظالموں کے ہاتھ لگ گئی...... ظالم کو بے بسی اور بے زبانی بہت اچھی لگتی ہے امی...... مگر ظالم اللہ کی مدد اور رحمت سے محروم ہوتا ہے...... جب اس کا برا وقت آتا ہے تو اس کی دعائیں اثر سے خالی ہوتی ہیں...... اس سے زیادہ بدنصیب اور کون ہوگا جس کے پاس دعا کا بھی سہارا نہ رہے۔

چمن نے ماں کا ہاتھ چوم لیا......

ٹھیک کہا میری بچی...... اللہ تمہیں استقامت دے...... بڑا حوصلہ ہے۔

تم میں آج ماں کی لاٹھی بن رہی ہو...... ورنہ میں تو جیسے اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کے قابل بھی نہیں ہوں۔

حوصلہ امی...... حوصلہ بس...... اچھا سوچیں...... اپنی بیٹی کا سوچیں...... دنیا کو بھول جائیں...... دنیا تو ہنستے بستے لوگوں کا ساتھ دیتی ہے۔

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مُدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

بیٹا دنیا کو ایک طرف کرو...... یاور کیسے منہ پھیر کر ماں باپ کے ساتھ چلا گیا...... خون کے رشتوں کے لیے خون سفید ہونا بولتے ہیں باپ کا خون کا رشتہ ہی نہیں ہوتا...... اولاد تو اس کے وجود کا حصہ ہوتی ہے میری بیٹی بے ہوش ہے اور بے ہوشی اس کے لیے نعمت بن گئی ہے ورنہ یاور کے اس طرح چلے جانے سے اس پر کیا قیامت ٹوٹتی۔

اب عطیہ بیگم کو ضبط کا یارانہ رہا...... پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں چمن نے بڑے بے ساختہ انداز میں عطیہ بیگم کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

امی جو ہونا طے ہو چکا...... اس سے آنکھیں ملائیں ...... ہر اس خوف سے گزر جائیں جو صرف خوف ہوتا ہے موت نہیں...... امی موت سے پہلے کون مرا ہے...... یہ خوف تو ہمیں روز مارتے ہیں مگر ہم پھر بھی زندہ ہیں......ایک نئی مشکل ایک نئی آزمائش سے لڑنے کے لیے......

وہ ماں کو اس وقت بچوں کی طرح بہلا رہی تھی......

کب ختم ہوگی آزمائش...... ایک کے بعد ایک نیا سلسلہ...... عطیہ بیگم نے سسکی لی......

کبھی تو ختم ہوگی...... اس نے عطیہ بیگم کے آنسو اپنے آنچل سے پونچھتے ہوئے بہت یاسیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

امی...... یہ راستے ہیں ہم ان سے گزر رہے ہیں...... چلتے رہتے ہیں...... رک رک کر کیوں سوچیں کہ کتنا چل سکے...... کتنا رستہ باقی ہے...... ہیں نا امی...... بس چلتے رہتے ہیں رک رک کر سوچیں گے تو سفر مزید بڑھ جائے گا۔

تم اس وقت بالکل اپنے باپ کی طرح باہمت نظر آ رہی ہو ماشاء اللہ تمہیں ہمت و استقامت دے۔

عطیہ بیگم کو بیٹی کے حوصلے سے نئی قوت مل رہی تھی۔

امی آپ نے ایک مرتبہ ایمن آپا کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ تم کیوں پریشان ہوتی ہو ہمارے بچے ہیں ہم پالیں گے......

تو امی آج میں آپ سے کہہ رہی ہوں ہمارے دکھ ہیں......ہم خود ہی نمٹ لیں گے۔

عطیہ بیگم نے بے اختیار چمن کی پیشانی چوم لی......

جیتی رہو میری بیٹی...... تم تو دس بیٹوں پر بھاری ہو......اللہ تمہارے ہر مسئلے میں آسانی پیدا کرے......آمین......ثم آمین......

ہم دونوں بہنوں کو بس آپ کی دعائیں چاہیں امی...... چمن نے ماں کے کندھے سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

ماں کا قرب، جنت کی نقرئی دودھیا فضاؤں کی جھلکیاں دکھا رہا تھا۔ جو آزمائشوں کا ایمان و ثابت قدمی سے مقابلہ کرنے والوں کی دائمی اور حتمی منزل ہے۔

☆......☆......☆

آپ کے نانا جان کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے یہ بہت بڑی خوش خبری ہے مگر ابھی آپ کو آفس نہیں آنا چاہیے...... وہ بہت کمزور اور بوڑھے ہیں۔ خدانخواستہ اکیلے میں چلتے ہوئے گر سکتے ہیں...... اس

وقت ان کو آپ کی ضرورت ہے۔ ثمر بہت نرمی اور ہمدردی سے ندا کو سمجھا رہا تھا۔

لیکن سر...... ہم بہت مشکل میں ہیں...... ہم پر بہت قرض چڑھ چکا ہے ماموں تو تین چار مہینوں کے بعد 1000 ڈالر بھیجتے ہیں......

1000 ڈالر ثمر جیسے اپنی سیٹ سے اچھل ہی پڑا بوقت تمام اپنی حیرانی کو لگام دی۔

جی سر...... 1000 ڈالر...... اب اتنی مہنگائی کے دور میں کیا صرف 1000 ڈالر میں گزارا ہو سکتا ہے۔ ندا اپنی ازلی حماقتیں چہرے پر سجا کر پٹر پٹر بول رہی تھی ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔

آپ کو پتا ہے 1000 ڈالر کے پاکستانی روپے کتنے بنتے ہیں......؟

جی...... پتا ہے ایک لاکھ Some thing...... ندا نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا۔

تو آپ صرف دو ہی تو ہیں...... تین مہینے تک آرام سے کھانا پینا اور Billing وغیرہ ہو سکتی ہے

اور وہ...... جو...... حکیم صاحب کو نذرانے دینا ہوتے ہیں۔

تین تین ہزار کے معجون اور کشتے کھلاتے ہیں نانا جان کو......

Last month میں نے حساب لگایا تھا...... بارہ ہزار کے تو نانا جان نے صرف کشتے کھائے ہیں......

ان کشتوں نے تو ہمیں مقروض بنا دیا ہے اور مجھے Job کرنی پڑ رہی ہے...... چار مہینے ہم نے بجلی کا بل نہیں بھرا...... تو ہماری لائٹ کٹ گئی تھی تب ہی تو مجھے Job کے لیے نکلنا پڑا...... ندا نے اس سانس میں سالوں کا خلاصہ پڑھ لیا۔

دیکھا جائے تو ندا کو حاذق حکیم کے کشتوں کی خاطر Job کرنا پڑ رہی تھی...... ورنہ ہر تین مہینے بعد آنے والے 1000 ڈالرز میں ٹھیک ٹھاک گزر بسر ہو سکتی تھی۔

اس نے ترحم بھر نظروں سے بے وقوف اور حالات کی ماری لڑکی کی طرف دیکھا...... چند ثانیے کچھ سوچا پھر گویا ہوا......

آپ فی الحال ایک ہفتے کی چھٹی لے لیجیے...... نانا جان کی دل لگا کر خدمت کیجیے...... اور ایک بہت ضروری کام کیجیے اور یہ کام آپ جیسی باہمت، بہادر، عقل مند اور خود اعتماد لڑکی بڑی آسانی سے کر سکتی ہے۔

ثمر اس کی اتنی کھل کر تعریف کر رہا تھا اس کی خوبیاں گنا رہا تھا ندا کی آنکھیں تو مارے حیرت کے پھٹی جا رہی تھیں...... یہ تو اسے پتا ہی نہیں تھا کہ وہ اتنی ڈھیر ساری خوبیوں کی مالک ہے۔

جلدی سے بتائیے سر میں ضرور کروں گی...... ویسے بھی بہادر تو میں بہت ہوں...... اللہ کا شکر ہے...... ندا کی رگوں میں سرگرمی دوڑنے لگی۔

حکیم صاحب کو گھر کے اندر داخل ہونے سے روکیے...... کچھ ایسا کیجیے کہ وہ آپ کے گھر کے گیٹ کے سامنے سے گزرنا چھوڑ دیں اور آپ کو دیکھ کر اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا کریں...... ان کو آپ کے ڈالرز کی چاٹ لگ گئی ہے۔

آپ کے ڈالرز بچیں گے تو آپ کو Job کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ثمر نے بہت سے ضروری کام

سائیڈ میں کر کے آج ندا کے مسئلے سے نمٹنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔
کیونکہ وہ ایک ہی کام تھا یا تو ندا کو سمجھائے یا اسے Job سے فارغ کر دے۔
کیونکہ وہ ایک ذمہ دارانہ عہدے پر فائز تھا اس کے اپنے بہت مسائل تھے...... اتنا فالتو وقت نہیں تھا کہ اپنے کولیگز کے لیے ہمدرد دواخانہ کا نعم البدل بن جائے۔
ٹھیک ہے سر...... انشاء اللہ...... آج ہی میں ان کا جلوس نکالتی ہوں...... آپ کا آئیڈیا بہت اچھا ہے کاش یہ آئیڈیا مجھے خود ہی آ جاتا...... پیسے تو بچ جاتے...... وہ مارے تاسف کے بڑبڑانے لگی۔
اب آپ جائیں...... جب تک مرضی چھٹی کریں آپ کی سیلری سے Decution نہیں ہوگا۔ پوری سیلری ملے گی۔
ندا نے خوشی سے بے حال ہو کر ثمر کی طرف دیکھا...... بنڈل آف تھینکس سر...... آپ بہت نیک انسان ہیں۔
No Comments...... ثمر نے اب Boss کے ٹون سے اسے ٹوکا ندا ایک دم جامے میں واپس آ گئی اور چپ چاپ باہر نکل گئی ثمر نے یوں آنکھیں بند کیں جیسے سر سے کوئی پہاڑ اترا ہو۔
ایک ہفتہ سکون کی ضمانت تو بہر حال مل گئی تھی۔

☆......☆......☆

ایمن کی حالت میں بہت جلدی جلدی تغیرات برپا ہو رہے تھے مگر ابھی گھر والوں کو اس سے ملنے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ڈاکٹرز نے بتایا تھا کہ اسے چند منٹ کے لیے ہوش آیا ہے اور اس نے صرف اپنے بچے کے بارے میں اشارے سے پوچھا تھا جو اسے بتا دیا گیا تھا کہ بچی بالکل ٹھیک ہے اس کے بعد وہ دوبارہ بے ہوش ہو گئی اور تا حال بے ہوش تھی۔
ثمر نے فون کر کے چمن سے اپ ڈیٹ لی تھی بھانجی کی مبارک باد بھی دی تھی اس کے بعد کوئی فون نہیں کیا تھا۔
بچی کی حالت بہتر ہوتے ہی اسے نانی کے سپرد کر دیا گیا۔ ہاسپٹل میں بچی کو سنبھالنا بہت مشکل ہو رہا تھا چمن نے عطیہ بیگم سے کہہ دیا کہ وہ فی الحال بچی کو اپنے گھر لے جائے گی کیونکہ جن حالات میں وہ گھر سے دور ہے وہ اسے مزید دور رہنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ثمر کا فون نہ آنا اور نہ اس کے آنے کے بارے میں کوئی فکر مندی ظاہر کرنا چمن کے لیے بڑا اعصاب شکن مرحلہ تھا۔
لہذا اس نے بڑی جرأت سے بچی کو گھر لے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اس کی ایک وجہ تھی کہ بچی کی ماں سے دوری اور ایمن کا ICU میں ہونا ثمر کے دل میں لازمی ہمدردی اور تعاون کا جذبہ پیدا کرنے کی وجہ بن سکتا تھا۔ اور وہ زیادہ اعتماد و سکون سے اپنی ماں اور بہن کا ساتھ دے سکتی ہے۔
جبکہ عطیہ بیگم متردد تھیں۔
بیٹا...... ثمر سے پہلے اجازت لے لو...... تمہاری تو اپنی زندگی اس وقت بہت مشکل میں ہے وہ اندیشہ ہو کر کہہ رہی تھیں۔
امی میں کون سا آپا کی بچی کو گود لے رہی ہوں جب تک آپا کی حالت نہیں سنبھلتی تب تک کی بات ہے

چمن نے تسلی دی۔

پھر بھی بیٹا...... تمہاری ساس۔

امی ...... بس آپ چھوڑیں...... حالات اب بھی مخالف ہیں اور شاید آئندہ بھی حق میں نہیں ہوں گے ...... جو میں کر سکتی ہوں وہ ضرور کروں گی...... امی اور ثمر کو خوش کرنے کے لیے جو کچھ کرتی رہی ہوں وہ سب بے کار ہی رہا ہے...... اب کوئی سچ مچ اچھا کام کر کے دیکھ لوں......

اس نے ماں کو لا جواب کر دیا۔ اس کی ہمت، جرأت، اعتماد دیکھ کر عطیہ بیگم کے پاس سوائے خاموشی کے کوئی چارہ نہ تھا۔

☆......☆......☆

مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ رات شام سے سرگوشیاں کرنے کچھ زیادہ ہی جھک آئی تھی۔

چمن بچی اور اس کے لوازمات کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو پورچ میں ثمر کی کار نہیں تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی گھر نہیں پہنچا۔ ایک انجانے اندیشے سے لحظہ بھر کو دل دھڑکا تھا......

ثمر کی موجودگی باعث تقویت بن سکتی تھی...... اب ساس صاحبہ کے بارے میں وہ متردد تھی...... پتا نہیں وہ اس سے کلام بھی کریں گی یا نہیں۔

کئی دن بعد گھر آئی تو بس رات گزاری اور اس سے سامنا ہونے سے پہلے یاور کا فون سن کر پھر گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔

آہستہ آہستہ محتاط قدموں سے اس نے لاؤنج کا رُخ کیا۔

وہی ہوا جس کا دھڑکا تھا۔ بانو آپا سامنے ہی بیٹھی نظر آ گئیں کوئی مشہور انڈین ڈرامہ دیکھ رہی تھیں جس میں ساس نندوں اور بہو کے فسادات کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

چمن کے لیے تو وہ تہیہ کیے بیٹھی تھیں کہ اب مرتے دم تک اس سے کلام نہیں کریں گی یا وقتیکہ سر دوسری شادی کر کے سوت اس کے سر لا کر بٹھا دے۔

مگر چمن کی گود میں بچہ دیکھ کر تو ہسٹری بھول کر حالات حاضرہ پر آ گئیں، زمین قدموں تلے کانپ رہی تھی۔ پورا وجود طیش کی وجہ سے بید کے مصداق سے لرز رہا تھا۔

یہ کیا ہے......؟ چمن کے سلام کے جواب میں ارشاد ہوا تھا چمن نے میٹھی نیند سوئی ہوئی بچی کی طرف بہت پیار سے دیکھا تھا۔

یہ کوئی چیز نہیں ہے امی جان...... انسان کا بچہ ہے چمن نے بانو آپا کی Setting ابھی کے ابھی کرنا تھی۔ ورنہ چار دن گزارنا مشکل ہو جاتے۔

اچھا ہمیں سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں کہاں سے اٹھا کر لائی ہو؟

بانو آپا...... شعلہ بانظروں سے بچی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

اٹھا کر نہیں لائی...... اجازت سے لائی ہوں...... آپا کی حالت خطرے میں ہے وہ مستقل بے ہوش ہیں۔ ابو جان دونوں بچیوں کو سنبھال رہے تھے۔ امی آپا کے پاس ہیں...... اب اس معصوم بچی کو بھی تو سنبھالنا ہے...... چمن نے بڑی رسانیت سے جواب دیا۔

اوہ...... تو یہ نیا تحفہ دیا ہے تمہاری بہن ہے...... بانو آپا نے طنزیہ مسکرا کر کہا۔
اللہ نے دیا ہے...... ایسے تحفے انسان کے بس کی بات نہیں جسے اللہ دے اسی کو ملتے ہیں...... چمن نے صوفے پر بیٹھ کر بچی کو احتیاط سے سنبھالا۔
دینا کو پتا ہے تم تو فارغ ہو۔ کھانے سونے کے علاوہ کوئی کام نہیں...... ورنہ دادی بھی ہیں...... دو دن بچی پوتی کو نہیں سنبھال سکتیں...... دیکھو بی بی ہفتہ دس دن برداشت کر لیں گے مگر اس سے زیادہ نہیں...... ہمارے آنگن میں پرائے بچے نہیں کھیلیں گے......
اور ہاں اس کی چیخ پکار کی آواز میں نہ سنوں...... اسے اپنے کمرے میں ہی رکھنا...... یہ کہہ کر وہ اپنے حساب سے پاؤں پٹختی اپنے کمرے کی طرف بڑھیں۔ عین اسی وقت گیٹ پر ثمر کی کار کا ہارن سنائی دیا۔ گیٹ تو چوکیدار نے کھولنا تھا...... مگر چمن اور بانو آپا دونوں ہائی الرٹ ہو گئیں۔
ثمر کو بتایا ہے اس کا......؟ بانو آپا نے بچی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا چمن نے نفی میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

ثمر اس سے پیشتر گاڑی پورچ میں لاتا گیٹ وا ہوتے ہی ندا کی کال آ گئی...... پہلے تو ثمر نے سوچا کہ اٹینڈ نہ کرے۔ فریش ہو کر کال بیک کرے یا اس کی دوسری کوشش پر ردعمل کرے۔ پھر عجیب سی بے چینی نے مغلوب ہو کر اس نے کال ریسو کر ہی لی۔
ہیلو......؟ اس کا انداز بلا کا محتاط تھا...... جیسے کوئی عظیم کام سر پڑنے کا خطرہ ہو۔ اور ہوا بھی یہی دوسری طرف ندا روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
سر مجھے لگتا ہے نانا جان کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ اب میں انہیں اٹھا کر بیڈ پر کیسے ڈالوں......؟ بس یہی بتانا تھا۔ خدا حافظ۔ شاید شدت گریہ سے وہ بول نہیں پا رہی تھی۔
ثمر نے چند ثانیے اپنے سیل فون کو گھورا پھر غائب دماغی کی کیفیت میں ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔
چوکیدار جو بڑھاپے کی انتہائی منزلیں طے کر رہا تھا۔ چندی آنکھیں کر کے ثمر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کہ آخر صاحب گاڑی اندر کیوں نہیں لاتے۔
ثمر نے بابا کو اشارے سے گیٹ بند کرنے کا کہا اور گاڑی بیک کر کے دوبارہ روڈ پر ڈال دی......
عجیب ہے یہ دنیا...... روز ہی کچھ نیا ہو جاتا ہے؟ وہ تھکے ہوئے اعصاب کو سنبھالتے ہوئے سوچ رہا تھا۔
ساتھ کام کرنے والوں کا بھی ایک دوسرے پر حق ہوتا ہے اس وقت وہ اپنی توانائی کے آخری قطرہ بھی استعمال کر کے گھر کی طرف پلٹا تھا اگر ندا اپنی کسی وقتی پریشانی کا ذکر کرتی شاید وہ کوئی بہانہ بنا دیتا...... کل پہ رکھتا......
مگر بات تو کسی کے گھر میں تکفین و تدفین تک جا پہنچی تھی جو نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی۔
اب وہ اندازوں سے کھیل رہا تھا کہ اندازاً اسے ندا کے ہاں کتنا وقت دینا ہو گا ساتھ ہی سوچ رہا تھا کہ وہاں پہنچ کر صورت حال کا جائزہ لے کر آفس کے دوسرے لوگوں خاص طور پر جونیئر ایمپلائز کو بھی فون کر دے گا......

اکیلی لڑکی اس سچویشن کو کیسے سنبھال سکتی تھی...... اس کے ساتھ آفس میں کام کرنے والوں کا فرض بنتا تھا کہ اس دکھ کے موقع پر اس کے ساتھ کھڑے ہوں۔

☆......☆......☆

چمن تو ثمر کی گاڑی کا ہارن سن کر بچی کو لے کر فوراً اپنے بیڈروم میں آ گئی تھی آخر اسے اس بچی کو چند دن اپنے ساتھ رکھنا تھا اس لیے ضروری تھا کہ ثمر کو قائل کر کے گھر کا ماحول متوازن رکھے۔ بانو آپا کو کنٹرول کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اسے ثمر کی مکمل حمایت ہو۔

بانو آپا اپنی جگہ ہارن سننے کے بعد اپنے بہترین تاثرات جو انہیں زیادہ سے زیادہ غمزدہ اور مظلوم ثابت کر سکیں چہرے پر سجا کر مستعد اور چوکس ہو کر بیٹھ گئی تھیں تاکہ بیٹا اندر آتے ہی ان کی خیریت پوچھے اور وہ نئی افتاس کا ذکر زوروشور سے شروع کریں۔

مگر یہ کیا...... پانچ منٹ...... دس منٹ...... گزر گئے باہر سے کوئی آہٹ اندر نہیں آ رہی تھی۔

چمن اپنے بیڈروم میں حیران و پریشان تو تھی مگر وہ سوچ سکتی تھی کہ ثمر کو بانو آپا نے لاؤنج میں ہی گھیر لیا ہوگا۔ حیرانی و پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ کان لگا کر سننے کے باوجود لاؤنج سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

بانو آپا کی بس ہوگئی تو بلبلا کر اپنی جگہ سے اٹھیں اور لگیں باہر جھانکنے پورچ میں ثمر کی گاڑی نہیں تھی۔

اب تو مزید حیران ہوئیں اور غور کرنے لگیں کہ کہیں ان کے کان تو نہیں بجے تھے۔ اب رکنا محال تھا۔ تیز تیز قدموں سے چلتی گیٹ کی طرف آئیں چوکیدار انہیں دیکھ کر کرسی سے کھڑا ہو گیا اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

ارے شیر خان...... ثمر کی گاڑی کا ہارن سنا تھا...... گاڑی باہر کھڑی ہے......؟ انہوں نے باہر جھانکنے کی بھی کوشش کی تھی۔

بیگم صاحب...... صاحب آیا تھا...... پر واپس چلا گیا۔

ہیں......؟ بانو آپا ہونق سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگیں واپس چلا گیا......؟ ارے کچھ تو کہہ کر گیا ہوگا......؟

کچھ نہیں بولا...... اس کو فون آیا تھا...... فون پر بات بول پھر واپس چلا گیا...... شیر خان نے لاپرواہی سے جواب دیا اور اپنی دانست میں بہترین اردو میں جواب دیا۔

اچھا......؟ بانو آپا سوچتی ہوئی پھر اندر کی طرف چل پڑیں۔

فون کر کے پتا کرتی ہوں اب کدھر نکل گیا ہے۔

اس کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی کہ بیگم صاحبہ پرایا بچہ لے کر اس کا انتظار کر رہی ہیں......

اَئے ہئے...... کہیں بگڑ کر تو نہیں چلا گیا...... اب بانو آپا کو طرح طرح کے اندیشے ستانے لگے۔

جی میں آئی جا کر چمن سے پوچھیں کہ تھوڑی دیر پہلے کیا تمہاری ثمر سے بات ہوئی تھی۔

پھر بڑے تکبر سے سر جھٹک کر خود ہی ارادہ بدل لیا۔

ہونہہ...... کون اس منحوس کے منہ لگے......

☆......☆......☆

ندا نے پڑوس سے مدد طلب کی تھی...... نانا جان فرش پر ڈھیر ہو چکے تھے اسے تو ان کی نبض ہی نہیں ملی اور کچھ ٹھنڈے بھی لگے تھے اسی لیے وہ بھاگ کر پڑوس میں گئی پھر واپس آ کر ثمر کو فون کر کے رحلت کی خبر سنائی۔

پڑوس کے لوگ جانتے تھے کہ ایک حاذق حکیم صاحب شبیر حسن کے معالج ہیں لہذا وہ دوڑ کر انہی کو بلا لائے۔

حکیم صاحب کے گھر میں داخل ہوتے ہی ندا دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی کیونکہ وہ بہت دیر سے اپنے آنسو روکے ہوئے تھی رہ رہ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا کہ اب اس کا کیا ہوگا...... اکیلی اتنے بڑے ڈھندار گھر میں کیسے رہے گی......؟

شدید غم پر عظیم غصہ غالب آ رہا تھا...... کہ کل حکیم صاحب کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے...... اگر نانا جان ہاسپٹل جاتے تو Survie کر سکتے تھے۔ وہ گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی...... ساتھ ہی حیران ہو رہی تھی کہ محلے والے آ کر اسے دلاسہ کیوں نہیں دے رہے......؟

صبر کی تلقین کیوں نہیں کر رہے پڑوسن بھی جانے کیا کرتی پھر رہی تھیں۔

بے چارے بے ہوش ہو گئے...... ایک تو بڑھاپا دوسرے بیماری کی وجہ سے کمزوری...... پڑوسن غالباً حکیم صاحب سے مخاطب تھیں...... بے ہوش ہیں...... یعنی زندہ ہیں یا اللہ تیرا شکر ہے کہ نانا جان زندہ ہیں...... مگر مجھے تو وہ بالکل ٹھنڈے Feel ہو رہے تھے...... سر کیا سوچیں گے' مجھے اپنے نانا جان کو مارنے کی جلدی ہے...... ندا بری طرح حواس باختہ وہ کر نانا جان کے کمرے میں آ گئی...... پنڈتوں جیسی توند والے حکیم صاحب بمشکل انہیں اٹھا کر بیڈ پر ڈال چکے تھے ندا کو دیکھتے ہی بولے۔

بھئی...... فون کر کے ایمبولینس منگوایئے...... شبیر صاحب کو ہاسٹل لے جانا ہوگا۔

یہ سن کر تو ندا کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا...... یہی حکیم صاحب ہاسپٹل پر لعنت بھیجتے نہیں تھکتے تھے......

ان کی حکمت دم دبا کر بھاگ گئی تھی سارے کشتے کشتیاں بن کر بہہ گئے تھے۔

بیٹا حکیم صاحب ٹھیک کہہ رہے ہین نانا کو ہاسپٹل لے جانا ضروری ہے ان کی حالت ایسی ہے کہ ہاسپٹل میں داخل کرنا ضروری ہے۔ پڑوسن نے ندا کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے مزید تاکید کے ضمن میں کہا تھا۔

آنٹی پہلے آپ ان حکیم صاحب کو یہاں سے نکالیں ان کی وجہ سے میرے نانا جان کا یہ حال ہوا ہے اب ہاسپٹل کا نام کیوں لے رہے ہیں......؟ ہر وقت نان جان کو اینٹی بائیوٹک سے ڈراتے رہتے تھے ندا دانت پیس پیس کر حکیم صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔

بیٹا یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ حکمت بھی ایک سچائی ہے لوگوں کو جڑی بوٹیوں سے بھی فائدہ ہوتا ہے پڑوسن نے ندا کا انداز دیکھ کر اسے پرسکون کرنے کی کوشش کی کہ مریض بے ہوش پڑا تھا غیر متعلقہ غیر ضروری باتوں کی گنجائش نہیں تھی۔

میں نے اپنے باس کو بلایا ہے آنٹی...... وہ آتے ہی ہوں گے پھر ہم نانا جان کو ہاسپٹل لے جائیں گے اب یہ حکیم صاحب ہمارے سر پر کیوں سوار ہیں انہیں کہیں کہ اپنے گھر جائیں۔

ندا کسی دیرینہ دشمن کے انداز میں حکیم صاحب کو دیکھ رہی تھی جو کھڑے شبیر حسین کے تلوے سہلا رہے تھے اور خاصے پریشان نظر آرہے تھے۔

گیٹ چوپٹ کھلا ہوا تھا پڑوسن کے پوتے نواسے بھی گویا تماشہ دیکھنے آرہے تھے...... یہ پڑوس بھی گزارے لائق تھا۔

گھر کے مرد تو دوبئی میں کماتے تھے گھر میں مکمل زنانہ راج تھا...... سال چھ مہینے میں کوئی مرد چکر لگاتا تھا اور اگلے سال گھر میں ایک نومولود کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ باہر ملک میں کمانے والے مرد کا یہی کام ہوتا ہے۔

گھر میں خوش حالی لانا اور کنبے کے افراد میں سالانہ بنیادوں پر اضافہ کرنا......

یہی وہ پڑوسن تھیں جو ندا کی غیر موجودگی میں شبیر حسن کا خیال رکھتی تھیں جو ندا کی نانی کی بچپن کی سہیلی تھیں اور محلے میں اتنی ہی پرانی تھیں جتنے شبیر حسن۔

ثمر کی گاڑی گیٹ پر رکی تو چوپٹ کھلے ہوئے گیٹ نے یقین دلایا کہ واقعی کچھ ہو کر گزرا ہے۔

گاڑی دیکھ کر نانا کی وجہ سے جمع ہونے والے بچے گاڑی کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔

انکل آپ ڈاکٹر ہیں......؟ ایک بچے نے ثمر کے حلیے اور چم چم کرتی گاڑی سے ثمر کے ڈاکٹر ہونے کا اندازہ لگایا۔

اس گھر میں ڈاکٹر کا انتظار ہو رہا ہے۔ ندا آپی کے نانا جان بہت دیر سے بے ہوش ہیں وہ اب حکیم صاحب سے ٹھیک نہیں ہوں گے۔ دوسرے بچے نے حق ہمسائیگی ادا کیا اور بہت چوکس اور پھرتیلے انداز میں گویا ہوا۔ جیسے چاہتا ہو کہ ڈاکٹر صاحب آئیں جلدی سے انجیکشن لگا کر نانا جان کو ہوش میں لے آئیں۔ وہ بیٹا اندر بتاؤ کہ ثمر صاحب آئے ہیں ثمر بری طرح الجھ گیا تھا...... ندا بے وقوف تو ضرور ہے مگر پاگل تو نہیں ہے...... اس نے تو بالکل Clear واضح طور پر بتایا تھا کہ اس کے نانا جان کی ڈ۔تھ ہو گئی ہے۔

انکل سب ویسے ہی اندر جا رہے ہیں اپ بھی چلے جائیں اور ایک اور بچے نے بڑی معصومیت سے ثمر کو اندر جانے کا مشورہ دیا۔

سب ویسے ہی جا رہے ہیں...... سب اس کا مطلب ہے اندر کافی لوگ ہیں...... اب ثمر سب سے یہ تو نہیں جان سکتا تھا کہ 'سب' کا سائز اور عمر کیا ہے منظر پر تو ہر سائز کے صرف بچے ہی نظر آرہے تھے جو ندا کے پڑوس لے ٹرپل اسٹوری مکان کے مکین تھے۔ دیکھنے میں سارے محلے کے ٹوٹل بچے لگ رہے تھے۔

ثمر نے چند چاپیے غور کیا پھر ہچکچاتا ہوا بالآخر گھر میں داخل ہو گیا...... اور ندا سامنے ہی نظر آ گئی ثمر کو دیکھ کر جلدی سے آگے بڑھی۔

تھنک گاڈ سر آپ آ گئے حکیم صاحب کہہ رہے ہیں نانا جان کو ہاسپٹل لے جانا ہوگا...... وہ کسی بھی طرح ہوش میں نہیں آرہے۔ ندا ثمر کو سامنے پا کر ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔ نانا جان بے ہوش ہیں......؟ ثمر سچ مچ تپ گیا۔

شرم کیجیے...... کچھ دیر پہلے اپ نے اپنے نانا...... سگے نانا کی Death ڈکلیئر کی تھی...... کوئی اس طرح کرتا ہے مذاق ہے......؟؟

ثمر آواز دبا کر دانت پیس کر ندا پر ایک حساب سے برس رہا تھا۔

سر...... آئی...... ایم' ...... سوری نانا فرش پر گرے تھے اور بالکل ٹھنڈے ہو رہے تھے میں اتنی جلدی پریشان ہوئی کہ کچھ سمجھ نہیں آئی ندا تو نانا کی وجہ سے پہلے حواس باختہ ثمر کے باس کے انداز میں برس پڑنے پر روہانسی ہو گئی۔

سر اچھا ہوا ناں...... آپ اس بہانے آ گئے نانا جان کو ہاسپٹل لے کر جانا ہے میں تو کبھی ایمرجنسی پیشنٹ کو ہاسپٹل لے کر نہیں گئی...... مجھے تو کچھ نہیں پتا...... جب میرے پیرینٹس کی ڈیتھ ہوئی تھی تو میں بہت چھوٹی تھی۔

وہ جلدی جلدی صفائی پیش کرنے لگی۔

اس بہانے...... ثمر پر کڑی گزر گئی۔ نانا کے ہاتھوں پروان چڑھنے والی لڑکی سے اس قسم کی امید کی جا سکتی تھی۔ ماں کی افادیت اسی طرح تو نظر آتی ہے...... درحقیقت تربیت ماں ہی تو کرتی ہے ماں کے علاوہ دوسروں کی روک ٹوک کو تو بچے بھی لفٹ نہیں کراتے......

وہ تو شکر ہے نانا نے نواسی کی تعلیم کا خیال کر لیا تھا۔

ٹھیک ہے...... آب آیا ہوں تو اتنی Help کر سکتا ہوں یہ حکیم صاحب ساتھ چلیں گے......؟ ثمر نے دور سے حکیم صاحب پر ایک تنقیدی نظر ڈالی۔ توبہ کریں ان کو تو میں کبھی بھی لے کر نہ جاؤں...... ان کی شکل سے مجھے چڑ ہے...... ان کی وجہ سے تو نانا جان کی یہ حالت ہوئی ہے ندا ایک دم بھڑک سی اٹھی۔ حکیم صاحب کو یوں گھور رہی تھی جیسے ایک اڑان بھر کر ان کی گردن دبوچ لے گی۔

وہ تو آنٹی بلا لائیں...... میں تو مر کر بھی ان کو نہ بلاتی۔

اب اتنے بھی بے کار نہیں ہیں میرے ساتھ مل کر آپ کے نانا کو گاڑی کی سیٹ پر تو لٹا سکتے ہیں۔ جلدی کریں۔

وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں...... ثمر اب تیزی سے اس طرف بڑھا جہاں حکیم صاحب کھڑے نانا جان کی تلوے اور ہتھلیاں سہلا رہے تھے۔

حکیم صاحب ہم نانا جان کو ہاسپٹل لے کر جا رہے ہیں آپ تھوڑی سی Help کر دیجیے اور سر کے ساتھ نانا جان کو اٹھا کر گاڑی میں لٹا دیجیے ندا بھی ثمر کے تعاقب میں چلی آئی تھی اور حکیم صاحب سے مخاطب تھی۔

سر...... ارے بھئی انہیں کہاں سے بلا لیا۔ خیر اب بلا لیا ہے ایک سے دو بھلے۔ ہم ساتھ چل رہے ہیں حکیم صاحب اس مخبوط الحواس عیاش بوڑھے کی طرح ندا کو دیکھا جو ہاتھ آیا موقع ضائع نہیں کرتا۔

نہیں نہیں...... تھینک یو...... پچھلی سیٹ پر تو نانا جان لیٹیں گے اور میں اگے سر کے ساتھ بیٹھوں گی' ندا نے کھولتے ہوئے دماغ کو بمشکل قابو کیا۔

سر کے ساتھ......؟ ارے اتنی رات کو نامحرم کے ساتھ اکیلی جاؤ گی......؟ شبیر حسن تو ہوش میں آ کر

ہمیں آڑے ہاتھوں لیں گے...... حکیم صاحب نے شک سے لبالب نظریں ثمر کے وجود میں اتارنے کی مقدور بھر کوشش کی۔

میرے نانا بے ہوش ہیں...... اتنی سیریس کنڈیشن ہے اور آپ کو محرم نامحرم کی پڑی ہوئی ہے۔ آپ نانا جان کو گاڑی میں لٹا سکتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں کسی اور کو روڈ سے پکڑ کر لائی ہوں...... ندا تلملائی۔

اب روڈ پر پھروگی......؟ ہم شبیر حسن کو سمجھاتے تھے لڑکی ذات کو نوکری پر مت کراؤ...... پر لگ جاتے ہیں...... انہوں نے ایک نہیں سنی...... آیئے میاں مریض کو اٹھایئے حکیم صاحب کو ثمر کا وجود کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ صورت حال بہت نازک تھی...... بحث مباحثے کی گنجائش نہیں تھی۔

چولہا بند کرنے گئی تھی۔ ارے آپ لوگ ابھی تک یہیں کھڑے ہیں......؟

ندا کی پڑوس والی آنٹی پھر سے لپک جھپک آ پہنچیں تھیں۔

کیسے بیٹھ جائیں...... مریض کی حالت کے پیش نظر اب بیٹھنے کا موقع ہی نہیں...... حکیم صاحب ندا سے بھی زیادہ عقلمند اور دانش ور ثابت ہو رہے تھے۔

ارے باہر اتنی بڑی گاڑی کھڑی ہے انہیں ہاسپٹل لے کر جایئے یہ ندا کے رشتے دار آ گئے ہیں ناں...... اب کیوں کھڑے ہیں پڑوسن نے انگلی اٹھا کر ثمر کی طرف اشارہ کیا جو بری طرح پھنس چکا تھا...... اور سوچ رہا تھا...... انسانیت کا تو بہت بھاری ٹیکس Pay کرنا پڑتا ہے۔ اسے پہلی مرتبہ ملنے والوں سے کوئی بات کرنا ایسے ہی لگ رہا تھا۔ جیسے نتھیا گلی میں ٹکٹ کے لیے بننے والی Que کو گھنٹوں بھگتنا پڑتا ہے۔

آگے پیچھے کھڑے لوگوں کی شکلیں منہ زبانی یاد ہو جاتی ہیں۔ مگر بات چیت کوئی نہیں ہوتی نہ کرنے کا دل چاہتا ہے۔

اللہ اللہ کر کے نانا جان کو اٹھا کر گاڑی کی بیک سیٹ پر ڈالا اور ثمر نے فوراً ندا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا...... ندا تو جیسے اشارے کی منتظر تھی۔

آنٹی پلیز گیٹ اور دروازے چیک کر لیجیے گا...... ہمیں پتا نہی کتنی دیر لگے۔

ہاں ہاں بیٹا تم فکر نہ کرو میں دیکھ لوں گی...... اب بچے گاڑی کو گھیر کر کھڑے تھے۔ جیسے گاؤں میں دولہا کی کار گھیرے میں آ جاتی ہے...... ثمر نے ہارن دے دے کر بچوں کو یوں پرے کیا جیسے انگور بیچنے والا جھاڑن سے مکھیاں بھگا رہا ہو۔

☆......☆......☆

چمن بلک بلک کر روتی بچی کو ٹہل ٹہل کر چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی...... بچی رونے کی وجہ سے اسے ثمر سے رابطہ کرنے کا بھی موقع نہیں مل رہا تھا...... بار بار نظر وال کلاک کی طرف جاتی تھی۔

اللہ...... کیا ہوا ہے......؟ کہاں رہ گئے......؟

اس وقت سیل پر ثمر کی کال آئی...... ثمر کا نام Blink ہو رہا تھا۔

(... کی نزاکت اور سفا کی دکھاتے اس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

''میں تمہیں ناپسند نہیں کرتا قدر! صرف تمہاری کچھ عادتوں سے اختلاف رکھتا ہوں۔ اگر تم سمجھو تو یہ پلس پوائنٹ بھی تمہارے ہی فیور میں جاتا ہے۔ یو نو واٹ......'' مرد جس عورت کو چاہتا ہے۔ اسے سب سے چھپا کر رکھنا چاہتا ہے۔ اس پر وہ کسی دوسرے کی نظر پڑنے نہیں دیتا......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا بیسواں حصہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بیک وقت حال و ماضی کے دریچوں سے جھانکنے والی یہ کہانی دیا سے شروع ہوتی ہے۔ جسے مرتد ہونے کا پچھتاوا، ملال، رنج، دکھ اور کرب کا احساس دل و دماغ کو شل کرتا محسوس ہوتا ہے۔ دیا جو درحقیقت علیزے ہے اور اسلام آباد چاچا کے ہاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مکین ہے۔ یوسف کرسچن نوجوان جو اپنی خوبروئی کی بدولت بہت سی لڑکیوں کو استعمال کر چکا ہے۔ علیزے پر بھی جال پھینکتا ہے۔ علیزے جو دیا بن کر اس سے ملتی ہے اور پہلی ملاقات سے ہی یوسف سے متاثر ہو چکی ہے۔

یہ ملاقاتیں چونکہ غلط انداز میں ہو رہی ہیں۔ جبھی غلط نتائج مرتب کرتی ہیں۔ یوسف ہر ملاقات میں ہر حد پار کرتا ہے علیزے اسے روک نہیں پاتی مگر یہ انکشاف اس پر بجلی بن کر گرتا ہے کہ یوسف مسلمان نہیں ہے۔ دنیا میں آنے والے اپنے ناجائز بچے کو باپ کا نام اور شناخت دینے کو علیزے یوسف کے مجبور کرنے پر اپنا مذہب نا چاہتے ہوئے بھی چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرتی ہے مگر ضمیر کی بے چینی اسے زیادہ دیر اس پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ وہ عیسائیت اور یوسف دونوں کو چھوڑ کر رب کی ناراضگی کے احساس سمیت نیم دیوانی ہوتی سرگرداں ہے۔ سالہا سال گزرنے پر اس کا پھر سے بریرہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے

علیزے اور بریرہ جن کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ بریرہ علیزے کی بڑی بہن مذہب کے معاملے میں بہت شدت پسندانہ رویہ رکھتی تھی۔ اتنا شدت پسندانہ کہ اس کے اس رویے سے اکثر اس سے وابستہ رشتوں کو تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ بریرہ سے بالکل متضاد صرف پرہیزگار نہیں عاجزی و انکساری جس کے ہر انداز سے جھلکتی ہے اور اسیر کرتی ہے۔ درپردہ بریرہ اپنے بھائی سے بھی خائف ہے۔ ہارون اسرار شوبز کی دنیا میں بے حد حسین اور معروف شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ گھر کی دینی محفل میں وہ بریرہ کی پہلے آواز اور پھر حسن کا اسیر ہو کر اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ مگر بریرہ ایک گمراہ انسان سے شادی پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ہارون اسرار کسی بھی صورت عبدالغنی کو اس رشتہ پر رضامندی پر التجا کرتا ہے۔ عبدالغنی سے تعاون کا یقین پا کر وہ مطمئن ہے۔ اسے عبدالغنی کی باوقار اور شاندار شخصیت بہت بھاتی ہے۔

اسامہ ہارون اسرار کا چھوٹا بھائی حادثے میں اپنی ٹانگیں گنوا چکا ہے۔ ہارون کی ممی اپنی یتیم بھتیجی سارہ سے زبردستی اس کا نکاح کراتی ہیں۔ جس کے لیے اسامہ ہرگز راضی نہیں اور نہ ہی سارہ کو اس کے حقوق دینے پر آمادہ ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے سارہ کی اچھائی کی وجہ سے وہ اس کا اسیر ہونے لگتا ہے لاریب ہارون کی چھوٹی بہن جو بہت لااُبالی نظر آتی ہے۔ ہارون کے ہمراہ کالج واپسی پر پہلی بار عبدالغنی کو دیکھ کر اس کی شخصیت کے سحر میں خود کو جکڑا محسوس کرنے لگتی ہے۔ علیزے لاریب کی ہم عمر ہے۔ دونوں میں دوستی بھی بہت ہو چکی ہے۔ وہ

لاریب کی اپنے بھائی میں دلچسپی کی بھی گواہ ہے۔
شادی کے موقع پر بریرہ کا رویہ ہارون کے ساتھ بھی بہت لیا دیا اور سرد مہری نہیں حاکمیت آمیز بھی ہے۔
ساتھی اداکارہ سوہا کی ہارون سے بے تکلفی اسے سخت گراں گزرتی ہے۔ممی کو اپنی بیٹی کا عبدالغنی جیسے نوجوان میں دلچسپی لینا ایک آنکھ نہیں بھاتا جبھی ایک معمولی بات پر وہ لاریب کے سامنے عبدالغنی کی بے حد تحقیر کرتی ہیں۔
بریرہ لاریب کو ناپسند کرتی ہے۔جبھی اسے یہ اقدام ہرگز پسند نہیں آتا مگر وہ شادی کو روکنے سے قاصر ہے۔لاریب عبدالغنی جیسے منکسر المزاج بندے کی قربتوں میں جتنا سنورتی ہے۔ہارون بریرہ کے حوالے سے اسی قدر اذیتوں کا شکار ہے۔بریرہ کے دل شکن رویے کے باوجود ہارون اس کی توجہ کا منتظر بار بار اس کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی لاریب کی طرح سدھار کا متمنی ہے۔مگر بریرہ جو علیزے کی بے راہ روی کا باعث خود کو گردانتی ہے اور احساسِ جرم میں مبتلا رب کو منانے ہرصورت علیزے کی واپسی کی ملتمس ہے۔
ہارون اس بے نیازی کو لاتعلقی اور بے گانگی سے تعبیر کرتے ہوئے مایوسی کی انتہا۔ہ گہرائیوں میں اترتا نا صرف شوبز کی دنیا میں دوبارہ داخل ہوتا ہے بلکہ ضد میں آکر بریرہ کو جھنجوڑنے کی خاطر سوہا سے شادی بھی کر لیتا ہے۔علیزے کے حوالے سے بالآخر بریرہ کی دُعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔لیکن تب تک ہارون کے حوالے سے گہرا نقصان اس کی جھولی میں آن گرا ہوتا ہے۔
عبدالہادی اپنے روحانی استاد کے زیر تربیت ایک کامل مومن کی شکل میں ان کے سامنے ہے۔وہ اسے نور کی روشنی پھیلانے کو ہجرت کا حکم دیتے ہیں۔
عبیر ایک بد فطرت عورت کے بطن سے جنم لینے والی باکردار اور باحیا لڑکی ہے۔جسے اپنی ماں بہن کا طرزِ زندگی بالکل پسند نہیں۔
کامیاب علاج کے بعد اسامہ پھر سے اپنے پیروں پر چلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔اسامہ چونکہ فطرتاً کاملیت پسند ہے۔کسی بھی چیز کا ادھورا پن اسے ہرگز گوارا نہیں مگر اس کے بیٹے میں بتدریج پیدا ہونے والی معذوری کا انکشاف اسے سارہ کے لیے ایک سخت گیر شوہر، متکبر انسان کے طور پر متعارف کراتا ہے۔وہ ہرگز اس کمی کے ساتھ بچے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔عبیر کو حالات اس نہج پر پہنچا دیتے ہیں کہ وہ ایک مسجد میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔عبدالغنی سے موذن صاحب بہت متاثر تھے۔وہ اُس سے اپنی اِس پریشانی کا ذکر کرتے ہیں اور اُسے قابلِ بھروسہ جان کر عبیر کو عقد میں لینے پر زور دیتے ہیں۔عبدالغنی انتہائی مجبوری کی حالت میں اُن کا یہ فیصلہ قبول کر کے عبیر سے نکاح کر لیتا ہے۔
لاریب کے لیے یہ سب کچھ سہنا آسان نہیں ہوتا، وہ اُسی وقت گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔چونکہ گھر میں کوئی بڑا نہیں ہوتا، اِس لیے لاریب کو سمجھانا عبدالغنی کے بس سے باہر تھا۔علیزے، عبدالہادی کے ساتھ اُس کی مام سے ملنے اُن کے آبائی گھر چلی جاتی ہے۔جب عبدالھادی علیزے کو اپنی ماں سے ملوانے کے لیے کہتا ہے تو وہ ایک غیر مسلم عورت سے ملنے کے لیے فوری طور پر انکار کر دیتی ہے۔علیزے بدگمان تھی مختلف مواقع پر عبدالہادی کو پرکھنے کے بعد بالآخر اپنا دل صاف کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔
ہارون اسرار کا رویہ بریرہ سے بہت برا ہو جاتا ہے اور وہ اُسے اپنے ساتھ اسلام آباد اپنی دوسری بیوی کے ساتھ چلنے کے لیے کہتا ہے۔بریرہ اسے بھی اپنا امتحان مان کر راضی ہو جاتی ہے۔ہارون اسرار کی دوسری بیوی، پہلی بیوی کو برداشت نہیں کر پاتی اور اُس سے اپنے نام لکھی گئی جائیداد اور روپے پیسے لے کر طلاق لے لیتی ہے۔بریرہ اور ہارون پھر سے محبت کے بندھن کو جوڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔عبدالغنی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔لاریب اور عبیر میں اس حادثے کے بعد دوستی ہو جاتی ہے۔
عبیر ایک حادثے کے بعد ماں بننے کے قابل نہیں رہتی۔لاریب عبدالعلی اور عبدالاحد کے بعد ایک بیٹی کو جنم دیتی ہے۔عبدالغنی کے رویے نے لاریب اور عبیر کو اتنا قریب کر دیا تھا کہ لاریب عبیر کے انکار کے باوجود اپنی بیٹی کو اس کی گود میں ڈال دیتی جس کا نام اتباع رکھا جاتا ہے۔بریرہ اور ہارون کے گھر بھی عبداللہ کے بعد امن جنم لیتی ہے۔وہ دونوں بچوں کے ساتھ اتباع کو دیکھنے لاریب کے گھر آتے ہیں۔عبداللہ کو اتباع گڑیا جیسی لگتی ہے اور وہ ضد کرتا ہے کہ یہ گڑیا ہم لے جائیں گے۔ہارون اور بریرہ اس کی ضد سے مجبور ہو کر عبدالغنی کے آگے دستِ سوال کر دیتے ہیں اور اتباع کو باہمی رضامندی سے عبداللہ کے نام منسوب کر دیا جاتا ہے۔علیزے اور عبدالہادی بھی وہاں موجود ہوتے ہیں۔علیزے کے دل میں اولاد کی کمی سر اٹھانے لگتی ہے اور وہ عبدالغنی سے عبدالعلی کو مانگ لیتی ہے۔عبدالغنی اپنے بیٹے کو بہن کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔کچھ عرصے بعد علیزے اپنے جیسی ایک خوبصورت بیٹی کو جنم دیتی ہے۔علیزے کو جیسے دنیا ہی میں جنت مل گئی تھی۔وہ قدر کو عبدالعلی کی دلہن کے روپ میں بچپن سے دیکھ رہی ہے۔
وقت کروٹ لیتا ہے بچے جوان ہو جاتے ہیں۔اور پھر کہانی نیا رُخ اختیار کرتی ہے۔عبدالعلی فوج میں چلا جاتا ہے۔عبدالغنی کی دین سے

محبت عبدالعلی کے رگوں میں دوڑ رہی ہے۔ علیزے بہت حساس طبیعت کی مالک ہے۔ اب وہ کسی قسم کا کوئی بھی روگ برداشت کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہی۔ قدر ناز ونعم میں پل بڑھ کر جوان ہوئی ہے۔ اکلوتی ہونے کی وجہ سے اس کے اندر فطری ہٹ دھرمی موجود ہے۔ وہ عبدالعلیکو ہمیشہ سے ماں سے ملی فوقیت پر ناپسند کرتی ہے۔ علیزے اسے ہر ہر پل یہ باور کراتی ہے چاہے وہ کچھ بھی کر لے وہ عبدالعلی ہی کی ہے۔ عبداللہ ہارون اسرار کا دوسرا روپ ہے۔ وقت نے ہارون اور بریرہ کی محبت کو دوبارہ جوان کر دیا ہے۔ حالانکہ اتباع جانتی ہے کہ وہ عبداللہ سے منسوب ہے لیکن اس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی کمزور لمحے کی زد میں نہ آئے۔ امن اپنے بھائی کی اتباع سے ٹوٹ کر محبت سے بہت اچھی طرح واقف ہے۔ اور اکثر وہ عبداللہ کے لیے پل کا کام انجام دیتی ہے۔ کیونکہ وہ اتباع کی بھی بیسٹ فرینڈ ہے اس لیے وہ اس کے جذبات کا ہمیشہ بہت خیال رکھتی ہے۔

سارہ اور اسامہ ارسل کے بعد ایک صحت مند بچے کو جنم دیتے ہیں۔ ارسل بھی اپنی معذوری کو شکست دے کر جوان ہو چکا ہے۔ لیکن وہ سب سے کٹ کر رہتا ہے۔ عبداللہ اتباع کی بے رُخی کی وجہ اس کا شرعی طور پر نامحرم ہونا جان کر فوری طور پر منگنی کے بجائے نکاح کا مطالبہ کر دیتا ہے۔ یوں اتباع اور عبداللہ کا نکاح ہو جاتا ہے۔ قدر اپنی ماں سے بہت محبت کرتی ہے۔ جبکہ وہ عبدالعلی کی وجاہت سے مرعوب ہو کر اپنے جیون ساتھی کے طور پر خود کو ہر طرح بدلنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن اس کے لیے عبدالعلی ایک نا بوجھی جانے والی پہیلی بن کر رہ جاتا ہے۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

قدر پلیز! کنٹرول یور سیلف۔ میری بات بری لگی ہو تو میں سوری کر رہا ہوں۔

وہ گڑ بڑا کر کہنے پر مجبور ہوا کہ ہر لحہ مزید غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس حالت کو آنسو...... آہیں سسکیاں رنج وغم اور بے تحاشا دکھ اور گہرا دکھ۔ جس کی شدتیں اسے توڑ رہی تھیں۔ ریزہ ریزہ کر رہی تھیں۔ پھر اس پہ عبدل علی کو یہ خوف بھی تھا کہ اگر جو کسی نے انہیں ایسے دیکھ لیا تو وضاحت پیش کرنی ہوں۔ جبھی جلد از جلد معاملہ سدھارنے کے در پہ تھا۔ مگر صورتحال یہ تھی کہ وہ جتنا اسے سنبھال رہا تھا۔ وہ اس قدر بلک رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ رو رہی تھی۔

''مجھے مرنے دیں۔ مجھے مر ہی جانا چاہیے۔ جا...... جانتی ہوں...... آپ...... آپ کو پسند نہیں ہوں میں۔'' وہ ہچکیوں سسکیوں کراہوں کے درمیان بولی۔ مزاحمت البتہ جاری تھی۔ مگر اس میں وہ دم خم نہیں تھا۔ اس کی ہمتیں جواب دے رہی تھیں۔ دونوں ہی پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔

''ایسا نہیں ہے قدر! اللہ گواہ ہے میں تم سے جان نہیں چھڑانا چاہتا۔ خود سوچو غور تو کرو ایسا ہوتا تو میں یہاں کیوں تمہارے پیچھے آتا۔'' وہ عاجزانہ انداز میں وضاحتیں پیش کرنے پر مجبور ہوا قدر نے آنسوؤں سے جل تھل آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

وہ بے حد نزدیک تھا۔ اتنا کہ اس کی گرم سانسیں بھاپ کی طرح اس کے چہرے کو سلگا رہی تھیں۔ اسے اس ناگفتہ با حالت میں بھی اس قربت کا احساس ہوا تو کترا کر فاصلے پہ ہوئی۔ پلکیں جھک گئیں۔ عبدل علی نے اس سے گریز کو محسوس کیا یہ شوایدہ سر کیفیت کی دیوانگی سے نجات کا واضح اشارہ تھا۔ وہ قدرے ریلکس ہوا۔

''میں تمہیں ناپسند نہیں کرتا قدر! صرف تمہاری کچھ عادتوں سے اختلاف رکھتا ہوں۔ اگر تم سمجھو تو یہ پلس پوائنٹ بھی تمہارے ہی فیور میں جاتا ہے۔ یو نو واٹ......'' مرد جس عورت کو چاہتا ہے۔ اسے سب سے چھپا کر رکھنا چاہتا ہے۔ اس پر وہ کسی دوسرے کی نظر پڑنے نہیں دینا چاہتا۔ اور جس عورت کو وہ لوگوں کی نظروں سے نہیں بچاتا وہ اس کے دل میں اتری نہیں ہوتی۔ وہ اسے صرف استعمال کرتا ہے دوسرے لوگوں کے

سامنے اسے پیش کر کے اپنی ویلیو بڑھانے کے لیے کہ اس کے پاس ایک اچھی چیز ہے۔ ایک ایسی چیز...... جو نظروں کو اچھی لگتی ہے۔ دل کو بھاتی ہے۔ پھر وہ عورت ساری عمر بس اس کے نزدیک ایک چیز ہی رہتی ہے۔ جسے مرد بس اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے۔''

اس نے لمحہ بھر کا توقف کیا اور اسے دیکھا جو سر جھکائے۔ نادم کھڑی تھی گویا اس کی اس بات کا اثر ہو رہا تھا۔ عبدالعلی کو انوکھی سی خوشی محسوس ہوئی۔ جبھی مزید گویا ہوا تھا۔

''سر پر دوپٹہ رکھنے سے عورت اللہ کی رحمت کے سائے میں رہتی ہے۔ حیا بہت بڑی دولت ہے۔ اور جو عورت اس دولت کی حفاظت کرتی ہے کبھی کنگال نہیں ہوتی۔ شیطان کا پہلا شکار ہی حیا ہوتی ہے۔

ایک بار انسان بے حیا ہو جائے تو پھر اسے کوئی برائی برائی لگتی ہی نہیں۔ گویا بے حیائی ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔''

عبدالعلی نے اس کا سر تھپکا تو قدر بھیگی آنکھوں سے مسکرادی تھی۔

''میں کوشش کروں گی کہ دوپٹے کا ہمیشہ خیال رکھوں۔''

''انشاء اللہ۔'' وہ جواباً ہلکا پھلکا ہو کر مسکرا کر بولا تھا۔ پھر گہرا سانس بھر کے دروازے کی جانب بڑھا۔

''اب آ جائیں۔ اگر کسی نے ہمیں یہاں اکھٹے دیکھ لیا تو کسی اور ہی غلط فہمی کا شکار ہو جائے گا۔''

عبدالعلی کا لہجہ گو کہ فکر مندانہ تھا۔ مگر قدر کا دل ہنسنے کو چاہنے لگا تھا۔ اس نے محبت کا اظہار کیا تھا نہ کسی اور سے انوالومنٹ کے حوالے سے خود کو بری ذمہ قرار دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کی اتنی توجہ پا کر ہی خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگی تھی۔ شاید محبت یہی ہے۔ شاید محبت اتنی ہی خوش فہم ہے۔

☆......☆......☆

کالج سے باہر نکلی تو گاڑی میں عبدالعلی کو یا عبدل احد کو اپنا منتظر پانے کی بجائے عبداللہ کو موجود پا کر وہ یکدم ہی گھمبیر قسم کی سنجیدگی کا شکار ہوئی تھی۔

''میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ سوچا آپ کو ڈراپ کر دوں۔ اس بہانے کچھ بات چیت بھی وہ جائے گی۔''

اس کے سرد بیگانے اور اجنبی تاثرات پہ دھیان دیے بغیر وہ نرم نگاہوں سے اسے تکتا گھمبیر لہجے میں بولا تھا۔ اتباع نے اضطراری انداز میں نقاب کو پھر سے ٹھیک کیا۔

''شکریہ...... میں چلی جاؤں گی۔'' وہ اس کی بجائے دور سڑک پر دیکھ رہی تھی۔ شاید گاڑیوں کی رش میں اپنی گاڑی کو۔ عبداللہ یہی سمجھا وہ اپنی فیملی کی خفگی کے خیال سے گریزاں ہے۔

''میں بوجانی کو بتا چکا ہوں کہ میں آپ کو پک کروں گا۔ سو ڈونٹ یو وری۔''

اس بات پہ اتباع نے ٹھٹک کر اور کسی حد تک مشکوک نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ مگر عبداللہ نے اپنی پسند کا مطلب اخذ کیا تھا۔

اس کا موڈ خوشگوار بلکہ باغ بہار تھا۔

''پلیز!!'' عبداللہ نے فرنٹ ڈور اوپن کر دیا۔ پھر اس کی ہچکچاہٹ کو پا کر کسی قدر حیران ہوا۔

''بیٹھ جاؤ یار! اتنا سوچ بچار کرو گی تو لوگ ہمارے جائز رشتے کے لیے بھی مشکوک ہو جائیں

گے۔ اور میں نکاح نامے کی کاپی ساتھ نہیں لے کے پھرتا۔''

وہ اس کو گریز پا کر شریر ہوا۔ اتباع کا دل تنگ سا پڑنے لگا۔ مگر چارہ نہیں تھا۔ اسے بیٹھنا پڑا تھا۔ عبداللہ یوں مسکرایا۔ گویا دنیا فتح کرلی ہو۔

''تھینکس فار دس آفر!'' اس نے ذرا توقف کیا پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے مسکراہٹ دبا کر براہ راست اسے دیکھا تھا۔

''تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔'' وہی پر شوق نگاہیں، وہی متبسم لہجہ، اتباع نہ صرف پزل ہوئی بلکہ اس کی جان پہ بھی بننے لگی۔ وہ اس کے رومینٹک موڈ سے ایسے ہی بدکا کرتی۔ ایسے ہی خائف رہا کرتی۔

''یار عجیب ہو تم بھی۔ میں جتنا بے قرار ہوں تم اس قدر رکول۔ تمہارا دل نہیں کرتا مجھ سے ملنے کو...... باتیں کرنے کو......؟''

وہ انتہائی بے بسی اور کسی حد تک اشتیاق میں مبتلا ہو کر پوچھ رہا تھا اتباع کو اس قدر اختلاف لاحق ہو گیا تھا۔ اس کی باتوں سے...... خاص کر لفظ یاد سے بے طرح اعتراض ہوا۔ آکورڈ بھی لگا۔

''مجھے اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔'' اس نے بے لحاظ ہو کر کہہ ڈالا۔ عبداللہ نے جواباً طویل عریض سرد آہ بھری۔

''اگر میں یہ کہوں کہ تو میرا حال ایسا ہے تو یقین کرلیں گی......؟'' گاڑی کی اسپیڈ کم کرتے اس نے اچانک سوال کیا تو اتباع کی نگاہوں میں شعوری طور پر استفار اتر آیا۔ تھا جیسے محسوس کرتے وہ ذرا سا مسکرایا اور بھاری آواز میں گویا ہوا تھا۔

وہ راستے میں مل جائے اتفاق سے کہیں
مجھے یہ شوق مسلسل سفر میں رکھتا ہے

اتباع کے چہرے پر ہلکی سی سرخی بکھر گئی پل میں حیا بار انداز میں لرزی تھیں۔ عبداللہ اسے دیکھتے ہوئے زمان و مکان بھولنے لگا۔

''کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہوں۔ اجازت ہو تو عرض کردوں......؟'' اس کا انداز شریر تھا۔ تبسم خیز تھا اتباع کی کیفیت کچھ مزید کنفیوز ہوئی۔ وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں رہی تھی۔ عبداللہ نے اس خاموشی سے حوصلہ پاتے دل کا حال آشکار کیا تھا۔

چپ چاپ اس کو بیٹھ کر دیکھوں تمام رات
جاگا ہوا بھی ہو کوئی سویا ہوا بھی ہو

وہ اس پر جھک کر مخمور آواز میں گویا ہوا۔ اتباع نے گھبرا کر اسے دیکھا وہ پوری طرح اس میں محو و مگن تھا۔

''میں آپ کو پہلے بھی کہہ چکی ہوں عبداللہ! مجھے یہ انداز گفتگو پسند نہیں۔ اس کے علاوہ یاد ہو تو میں نے آپ سے یہ بھی کہا تھا مجھ سے آپ کا مزاج نہیں ملتا۔ نہ کریں شادی۔ میں آپ کی ان توقعات پر پورا نہیں اتر سکوں گی جو آپ کو مجھ سے وابستہ ہوں گی۔''

اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ اس کی گفتگو کا انداز بتلاتا تھا۔ عبداللہ کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

ایک وقت ایسا بھی آتا ہے اتباع! جب جان بچاتے رکھنے میں سر جاتا ہے۔ اچھے خاصے سیدھے سادھے انسان تو ایک لمحہ دیوانہ کر جاتا ہے۔ میرے ساتھ ایسا ہو چکا۔ آپ کو دیکھنے کے بعد میں اس قابل نہیں رہا تھا کہ کسی اور جانب دیکھ لیتا۔ حالانکہ تب اس حالت کو دیکھتے ہوئے پاپا نے مجھے کہا تھا۔

یہ بھی ممکن ہے تجھے عشق ولایت دے دے

یہ بھی ممکن ہے تیرے ہوش ٹھکانے آ جائیں
''ابھی تو ہوش ٹھکانے لگ رہے ہیں۔اللہ جانے ولایت نصیب ہوتی ہے کہ نہیں......'' اتباع نے اس جواب پر ہونٹ بھینچ لیے تھے۔
''مگر یہ بھی بہت تلخ حقیقت ہے کہ جلد بازی میں فیصلہ کرنے والے بدگمان بھی ہو جایا کرتے ہیں اور جلدی بدگمان ہونے والے لوگ دیتے بھی ہیں دکھ اور اٹھاتے بھی ہیں۔''
اس جواب پہ عبداللہ نے بغور اسے دیکھا۔ پھر سنجیدگی واجندگی کے حصار میں قصیدہ کر بولا تھا۔
''میں بہت حیران ہوں۔ مسلسل ورطہ حیرت میں مبتلا۔ کیا خوب تخلیق ہے یہ عشق...... نہ اس جیسا کوئی...... نہ کوئی اس جیسا...... بس ایک نقطے کے اندر گھومتے رہنا۔ ایک دائرے کے اندر سفر کرنا۔ ساری کی ساری دنیا اس ایک محور کے گرد اسی ایک دائرے کے اندر گزارتی ہے۔ عشق کا حصار ایک دائرے کے ہوتا ہے۔ شاید جس کا کوئی خط نہیں ہوتا کہ ٹوٹ جائے...... کوئی زاویہ نہیں ہوتا کہ ناپا جا سکے۔ نہ ہی اس کا کوئی اختتام ہوتا ہے۔ بس عشق کیے جانا ہی اولین فریضہ ہوتا ہے۔ بغیر کسی شرط و تجارت کے ایسی دیوانگی کے تمثیل بجا طور پر دنیا و مافیا عقل و خرد سے بیگانگی ظاہر کرتی ہے۔ میں کیا کہوں اس کے کہ......

عشق میں ذات ہوتی ہے نہ اوقات ہوتی ہے
یہاں مات مات اور محض مات ہوتی ہے

میں نے منگنی اس لیے نہیں کی کہ میں آپ کی نیچر کو سمجھ گیا تھا۔ آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ نکاح اس لیے کیا تھا کہ شرعی دائرے کے اندر رہ کر آپ سے میل ملاقات رکھوں۔ تا کہ آپ مجھے سمجھیں۔ یا شاید کاش آپ مجھ سے محبت کریں۔ مگر مجھے لگتا ہے میرا یہ عمل بھی بے فائدہ رہا ہے۔ آپ کی محبت تو درکنار...... میں تو آپ کا اعتماد حاصل کرنے میں بھی ناکام رہا ہوں۔''
اس کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔ وہ یکدم خود بھی کتنا بجھا ہوا بے رونق لگنے لگا تھا۔ اضمحلال کا احساس اسے واضح طور پہ شکستہ کر کے دکھاتا تھا۔ اتباع نے اس کی کیفیت کو نوٹ کیا اور حیران ہونے لگی۔ اس سے پہلے کہ کچھ کہتی...... گاڑی گھر کے سامنے آن کر ایک جھٹکے سے رکی تھی۔
''میں کوشش کروں گا آئندہ آپ کو ہرٹ نہ کروں۔ جو کچھ ہو چکا اس پہ معذرت خواہ بھی ہوں...... اس نے قدرے جھک کر اس کی جانب کا دروازہ کھول دیا۔ اتباع بے چین ہوئی تھی۔
''آپ......!!''
''آپ تشریف لے جائیں اتباع! گو کہ میں بوجانی کو بتا چکا تھا کہ آپ میرے ساتھ ہیں۔ مگر عبدالعلی آپ کو میرے ساتھ دیکھیں گے تو یقیناً آپ کو آکورڈ لگے گا۔ سو پلیز......''
وہ اس کی جانب دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اتباع کو اب توہین کے احساس نے چھوا تھا۔ یہ بھی خوب رہی تھی۔ وہ توقعات بھی رکھتا تھا۔ ناجائز خواہشات پوری بھی کراتا تھا۔ پھر بھی معمولی باتوں پہ خفا ہونے کا حق بھی محفوظ رکھتا تھا۔ اسے عجیب سی کوفت اور جھنجلاہٹ نے آن لیا۔ کچھ کہے بغیر وہ کپڑے سمیٹ کر اپنا بیگ سنبھالی گاڑی سے اتر کر چلی گئی اور پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ عبداللہ کی جلتی آنکھیں مزید جلنے لگی تھیں۔

☆......☆......☆

تم مل جاؤ نجات مل جائے
روز مرنے سے روز جینے سے

اس نے گنگناتے ہوتے خود کو ہلکا سا فضا میں اچھالا اور جھولے پہ بیٹھی اتباع کے پہلو میں آ گری۔ جھولا اس کے بوجھ سے آہستہ آہستہ سہی مگر ہلکورے لینے لگا۔ اتباع نے اپنے خیال سے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ شاید نہا کر آئی تھی۔ تازہ غسل کا نکھار اسے دلکش و تابندگی بخش رہا تھا۔ مہکے مہکے بال ہلکی نمی لیتے اس کی جاذبیت میں اضافہ کا باعث بن رہے تھے۔

''خیریت بہت خوش ہو......؟'' اتباع کے اس سوال پہ وہ بازو فضا میں پھیلا کر آنکھیں میچ کر ہنسنے لگی۔

''ہاں خوش تو ہوں، تم Guess کرو کیوں خوش ہوں۔'' اس نے مسکراہٹ دبا لی۔ اتباع نے اسے بغور دیکھا۔

''تمہارے چہرے کا پیارا سا رنگ خود گواہی دے رہا ہے۔ تمہارے پیارے پیارے رازوں کی۔ بھائی سے صلح ہوگئی ہے ناں تمہاری......'' اور جواباً وہ دھنک کے رنگوں میں نہا گئی تھی۔

''میں سمجھتی تھی وہ ماؤنٹ ایورسٹ ہے جسے میں کبھی سر نہیں کر سکتی۔ مگر اب کچھ امید تو ہے کہ......''

مل کے اس شخص سے میں لاکھ خاموشی سے چلوں
بول اٹھتی ہے نظر پاؤں کی پایل کی طرح

وہ کچھ...... پھر جیسے آہ بھر کے افسردگی سمیت گویا ہوئی تھی۔

''مگر...... مسئلہ یہ بھی ہے۔''

پاس جب تک وہ ہے درد تھما رہتا ہے
پھیل جاتا ہے پھر آنکھ کے کاجل کی طرح

''بس یار کچھ ایسا سدباب کرو کہ مستقل بنیادوں پر اس شخص پہ حاکمیت حاصل ہو جائے۔''

وہ جس طرح منہ لٹکا کر بولی تھی۔ اتباع نے جھینپ کر اسے ایک دھپ لگا دی۔

''بہت ہی بے شرم ہو تم......'' وہ آنکھیں نکال رہی تھی۔

''اور تمہارا بھائی بھی اتنا ہرگز پرہیزگار نہیں۔ آج ہی معلوم ہوا ہے مجھے۔'' اس نے جواباً انتہا کر دی۔ اتباع کے ہی چھکے چھوٹے تھے۔ کہ عبدالعلی لان کی سیڑھیاں اترتا ہوا انہیں سمت آ چکا تھا۔

''آپ کو اپنی دوست کی جانب جانا تھا غالباً......'' اس کی سنجیدگی کا وہی عالم تھا۔ قدر نے محض سر کو اثبات میں ہلایا۔

''لیس آف کورس مگر ماموں پتا نہیں کہاں چلے گئے......'' اس نے آخیر میں منہ لٹکا لیا تھا۔

تیار ہیں تو گاڑی میں چل کر بیٹھیں۔ مگر چادر یاد سے لے لیجیے گا۔'' وہ اس سنجیدگی سے کہتا پلٹ گیا تھا۔ قدر نے خود کو پورے کا پورا اتباع پہ ڈھیر کر دیا۔

شکر ہے سنا نہیں ورنہ کہاں خیر رہتی۔ آخر پرہیزگار لوگوں کے راز طشت از بام کرنے کی خطا کے سزاوار تھے۔''

اس کا انداز شوخ تھا۔ اتباع گہرا سانس کھینچ کر رہ گئی۔

''تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ اگر تم خود کو بھائی کے رنگ میں رنگ لو۔ آسانی رہے گی۔''

''تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے اتباع! تمہیں خود کو عبداللہ بھائی کے رنگ میں نہیں رنگنا چاہیے......؟''

''تمہیں لگتا ہے وہ ٹھیک ہے......؟''

یہ سوال قدر کو قدرے دھیما کر گیا تھا۔ مگر پھر گہرا سانس بھرا اور اسے دیکھ کر کاندھے اچکا دیے

تھے۔

''تم بہن بھائی جو باتیں کرتے ہو وہ غلط نہیں ہیں میں جانتی ہوں۔ مگر اتباع اللہ نے شوہر کی اطاعت کا حکم بھی تو عورت کو دیا ہے ناں۔

''دیا ہے بالکل دیا ہے۔ مگر یہ اطاعت اللہ کی اطاعت سے اہم نہیں۔ جہاں شوہر کی خواہشات احکام یا مطالبات اللہ کے احکامات اس کی حدوں سے متصادم ہوں گے۔ وہاں اطاعت لازم نہیں۔ وہاں شوہر کی اطاعت کو چھوڑ کر رب کی اطاعت کا حکم ہے۔''

اب کہ اتباع کا لہجہ نرم تھا۔ قدر نے گہرا سانس بھر کر تائیدی انداز میں سر ہلانے لگی۔

''یہ بات تو تم عبداللہ بھائی کو سمجھاؤ۔''

''سمجھاؤں گی مگر مناسب وقت آنے پر۔''

اتباع کے جواب پر قدر ٹھہر سی گئی۔

''ممکن ہے جسے تم مناسب وقت تصور کر رہی ہو اتباع! وہ مناسب نہ ہو انتظار مایوسی کو بھی جنم دیا کرتا ہے۔ ضروری نہیں صبر سے روشناس کرائے۔

قدر اپنی بات کہہ کر چلی گئی تھی۔ جبکہ اتباع اسی ایک نقطے پہ اٹک رہی تھی۔

''انتظار مایوسی کو بھی جنم دے سکتا ہے بانسبت صبر کے......

☆......☆......☆

وہ فرنٹ سیٹ پر گاڑی میں اس کے ہمراہ تھی۔ مگر دل عجیب سی یاسیت کا شکار تھا۔ حالانکہ جب اسے پتا چلا عبدالغنی کے بجائے وہ عبدالعلی کے ساتھ جا رہی تھی۔ تو دل کی کلی کیسے کھل کر گلاب بنی تھی۔ گاڑی میں اس کے برابر سیٹ سنبھالتے اس نے کنکھیوں سے عبدالعلی کو دیکھا تھا۔ سفید شلوار قمیض پہ سیاہ وہی کوٹ...... وہ کتنا بھرپور اور وجیہہ لگ رہا تھا۔ اتنا اتنا کہ اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ یہ دھڑکنیں اس شخص پہ مکمل ملکیت کے احساس سمیت سر تال میں بجتی محسوس ہوتی تھیں۔

اسے ایک دم لگا تھا۔ وہ عبدالعلی کے سامنے آ کر یوں بجھ گئی ہے۔ جیسے کہ ستارہ چاند کے سامنے اپنی دمک کھو دے۔ مگر ملا کیا تھا بھلا...... یہ طے تھا وہ اس کا تھا پھر کیسا تفکر...... ہاں وہ ترنگ میں تھی جب ہی کھڑکی کا شیشہ اتار کر ہلکے نم بالوں کو ہلکے جھٹکے سے بکھیر دیا تھا۔ عبدالعلی کی ناراضگی یا استفار پہ بہانہ بال سکھانے کا قدر کو معقول تھا جو پیش ہوسکتا تھا۔ یہ ناراضی سامنے تو آئی تھی مگر دوسرے انداز میں جس کا قدر کو قطعی احساس نہ تھا۔

''تم بالوں کی کٹنگ کرواتی ہو......؟'' اس کی نگاہوں میں محض استفار نہیں تھا۔ برہمی بھی تھی۔ اور وہ جو اس کی توجہ کی اور انداز میں طالب تھی۔ گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔ بلکہ طنز پہ اتر آئی۔

''آپ کو کیا پتا میں کیا کرتی ہوں کیا کرواتی ہوں۔ کبھی غور سے دیکھیں تو پتا بھی لگے۔''

اسے اس بات پہ بھی غصہ آ رہا تھا کہ عبدالعلی نے اس کی جانب جھک کر کھڑکی کا شیشہ پھر چڑھ رہا تھا۔ صرف یہی نہیں اسے دوپٹہ ڈھنگ سے اوڑھنے کی تاکید میں بھی سخن کا عنصر پایا جاتا تھا۔ وہ جز بز ہو کر رہ گئی۔ اسے اعتراف کرنا پڑا۔ اس جیسا روکھا شخص اس دنیا میں دوسرا نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں روہانسی ہونے لگی تھی۔

''آپ کو میں کبھی اچھی نہیں لگ سکتی۔ یہ طے ہو چکا ہے۔'' اس نے جل کر بے مروتی سے کہا تو عبدالعلی نے دانت بھینچ لیے۔

''دل میں ان گنت خواہش بھری ہوں تو

مثبت سوچ کی جانب دھیان جا بھی نہیں سکتا۔ نہ ان نعمتوں کے شکر کا خیال دل میں پیدا ہوا کرتا ہے۔ جو اللہ نے وافر مقدار میں عطا فرما رکھی ہوں۔ ذرا سی تشنگی اور کمی کا احساس ہی اپنا دائرہ وسیع کرتا ہوا اسی جانب دھیان لگائے رکھتا ہے۔ اور بڑا کامیاب رہتا ہے کہ یہ خواہشات کا جنم ہی دل میں شیطان کی کامیابی ہے گویا۔ وہی شیطان میں نے اللہ کو نہ مانا تو اللہ نے اس پر لعنت بھیج کر اپنی رحمت سے نکال دیا۔ انسان کے دشمن کو اللہ نے اپنا دشمن بنایا تھا۔ اب اگر انسان اللہ کے دشمن سے دوستی کرے اور اس کی تقلید کرتے ہوئے اسے خوش اور اپنے اللہ کو ناراض کرے تو اس سے بڑھ کر افسوس کا اور کیا مقام ہو سکتا ہے۔''

اسے دیکھے بنا وہ کتنی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا ظاہری بات تھی اشارہ اس کے بالوں کی کٹنگ کی جانب تھا قدر نے ہونٹ بھینچ لیے۔ دکھ سے بھرتا دل جیسے کوئی پھوڑا تھا۔ کچھ دیر قبل سرخوشی کی کیفیت اور مدہوشی کا سرگم ڈھل چکا تھا۔ اس کی جگہ عجیب سے ملال نے لے لی تھی۔ دونوں کے درمیان خاموشی کی چادر تن گئی۔ قدر اس سے شاکی تھی کہ وہ کبھی اسے نرمی سے پیار سے نہیں قائل کر سکتا تھا۔ عبدل علی اس بات پہ افسردہ تھا کہ وہ اس قدر بے حس کیوں تھی۔ آخر وہ کیوں کسی بھی بات کا اثر نہیں لیتی تھی۔ سفر طویل تھا اور طے ہو ہی رہا تھا جیسا بھی ہو...... مگر گڑبڑ اس وقت ہوئی جب ایک دم کالی گھٹائیں چھائیں اور ابر برس پڑا۔ آدھے پون گھنٹے کے اندر ہر سو جل تھل ہو چکا تھا۔ سڑک پکی نہیں تھی۔ مگر کسی تالاب کا منظر پیش کرنے لگی تھی۔ عبدالعلی تفکر میں مبتلا ہوا جاتا تھا۔ جبکہ اس کے برعکس بارش نے قدر کا موڈ قدرے بحال کر دیا تھا۔ پھر وہ مغرب میں تیزی سے غروب ہوتا ہوا سورج پورے آسمان کو نارنجی رنگ میں ڈھال رہا تھا۔ بارش کی بوندوں کا گاڑی کی چھت سے ٹکرا کر مدھر دھن پیدا کرنا قدر کے دل میں خوشی کا احساس جگا رہا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے اپنے غافل اور بے نیاز ہمسفر کو دیکھا۔ جس کی سنجیدہ نظریں ونڈ اسکرین پہ جمی تھیں تو مضبوط ہاتھ اسٹیرنگ پہ وہ اس سے ایسے بے پرواہ بیٹھا تھا گویا اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہو۔ اس کا دل اس من پسند شخص کی رفاقت اور قربت کے باوجود عجیب سی یاسیت کے احساس سے لبریز ہونے لگا۔

عجیب موسم ہے بارشوں کا
کہ جس میں جذبے سلگ رہے ہیں
دھواں دھواں ہیں یہ بھیگی آنکھیں
جگر کے چھالے بھی تپ رہے ہیں

وہ اس وقت چونکی جب گاڑی یکے بعد دیگرے دو تین زوردار جھٹکے کھا کر ساکن ہوئی۔ عبدالعلی کی دوبارہ اسٹارٹ کی کوشش کے باوجود گاڑی کا انجن ہولے سے غرایا اور پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔ یہاں تک کہ عبدالعلی نے جھنجلا کر کوشش ترک کر دی۔ قدر نے تشویش میں گھر کر ایک دم سے اسے سوالیہ انداز میں دیکھا۔

''ک...... کیا ہوا......؟ گاڑی خراب تو نہیں ہوگئی......؟''

''میرا خیال ہے آپ کا خیال سو فیصد درست ہے۔'' عبدالعلی کا لہجہ خشک بھی تھا طنز آمیز بھی۔ قدر دھک سے رہ گئی۔ اس نے بے اختیار مضطربانہ نظروں سے باہر کا جائزہ لیا۔ رات مکمل طور پہ ڈھل چکی تھی۔

جہاں تک نگاہ پڑتی تھی سڑک کے اطراف کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ جو اس وقت پانی میں ڈوبے

ہوئے تھے۔

''مائی گاڈ......!''اب کیا کریں گے......؟''

اس نے بے قراری سے ہاتھ مسلتے اُسے مخاطب کیا۔

''جو دل چاہتا ہے کریں۔آپ کے تو غالباً من کی مراد پوری ہوئی ہے۔بارش بھی ہے۔گاڑی میں ہوں بھی صرف میں اپ کے ساتھ۔اسی لیے کہتے ہیں انسان کو خواہش بھی ڈھنگ کی کرنی چاہیے۔فضول نہیں،کوئی قبولیت کا بھی لمحہ ہوتا ہے۔''وہ کتنا جھلایا ہوا تھا۔

جس قدر برہم تھا۔اس قدر شدتوں سے برسا۔قدر صرف شرمسار نہیں ہوئی۔ان طعنوں پہ سُبکی سے بھی اپنی نظروں سے گرنے لگی۔خفت کا احساس اتنا گہرا اور جان لیوا تھا کہ وہ محض اسے نم آنکھوں میں بے بسی لیے ایک نظر ہی دیکھ سکی۔اور پھر رُخ پھیر کر بے اختیار بہہ جانے والے آنسوؤں کو بے دردی سے رگڑا۔اس کی محبت اس کی خواہش چاہیے دونوں کتنی ہی معصوم یا جائز تھیں۔اسے رسوا و ذلیل کرنے پہ تلی تھیں۔صحیح کہا ہے کسی نے جذبے بے اختیار ہی ہوتے ہیں مگر خود کو کبھی بے اختیار نہیں ہونے دینا چاہیے۔وہ خود کو سنبھال نہیں پائی تھی۔اس زعم میں مبتلا رہ کر وہ اس کا جائز مالک ہے۔وارث ہے،محرم ہے مگر سامنے والے کے حالات وجہ بات بھی تو محض نہیں تھے۔پھر......پھر......

اے دل دھڑک......تڑپ مگر اتنا یاد رکھ
تیرے جذبات اور ہے میرے حالات اور ہیں
ان کے خیالات کچھ اور ہیں۔

وہ خود کو ڈانٹنے جھڑکنے اور ملامت میں اتنی مصروف ہوئی تھی کہ گل خان گاڑی تک آیا کب

اس نے عبدالعلی کو اپنے آفیسر کے طور پر پہنچان کر سیلوٹ جھاڑا اور مدد کی آفر بھی کر دی۔اتنی ہی غافل تھی وہ یا پھر دانستہ یہ تغافل برتا تھا۔

''یہ ہمارا بھابی ہوگا سر!''گل خان نے دانت نکوس کر سوال کیا تھا کہ جواب میں وہ کوئی راہ فرار ڈھونڈتا۔

''آپ یہ امارا برساتی بھابی کو اوڑھا دو سر!امارا خیر ہے آ جاؤ سر!اللہ نے رحمت بھیجا ہے۔مورے کو پتا لگے گا مہمان آئی ہے تو بہت خوش ہوگا۔''

عبدالعلی نے گہرا سانس بھرا اور اپنی جانب کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔اس وقت گل خان کی آمد خدائی مدد کے علاوہ کچھ نہیں تھی۔جس سے کفران نعمت ممکن ہی نہ تھا۔بیابان میں ہیں خطرناک علاقہ تھا۔راہزن تو گویا ایسے مواقع کی تاک میں ہوا کرتے تھے۔عبدالعلی کے لیے سب سے تشویش ناک قدر کی موجودگی تھی۔وہ تو خود کیسے بھی حالات میں گزارا کر سکتا تھا مگر قدر کی وجہ سے کسی محفوظ پناہ گاہ کی اشد ضرورت تھی۔موسم کی خرابی کی وجہ سے موبائیل سگنل بھی دغا دے چکے تھے۔گل خان کا تعلق گاؤں سے تھا یہ تو ٹریننگ کے دوران اس سے ہونے والی بات چیت میں اسے معلوم ہو گیا تھا وہ یہاں کا باشندہ تھا۔یہ بات ابھی معلوم ہو سکی تھی...... بہر حال وہ فاصلے سے زیادہ مطمئن ہو چکا تھا اب۔

''اگر رونے کا کوٹا پورا ہو گیا ہے تو نیچے تشریف لے آئیے۔اپنی طرف کا دروازہ لاک کرنے کے بعد اس کا منتظر تھا۔جب اس کی جانب سے کوئی سرگرمی دیکھنے میں نہیں آئی تو صحیح معنوں میں وہ تلملاتا ہوا اس کے سر پہ پہنچا تھا۔کچھ تو صبح سے طبیعت ویسے بھی بوجھل تھی اور اس

یہ طویل سفر اس پہ ستم اب کسر بارش میں بھیگ کر پوری ہو رہی تھی۔ اس کا حرارت دیتا وجود اس خنک موسم میں انگارے کی مانند چبھتا محسوس ہو رہا تھا۔ قدر کی یہ لاتعلقی اسے سخت گراں گزری تھی۔ جبھی مدھم مگر سخت لہجے میں پھنکارنے کے انداز میں بولا تو قدر جو واقعی آنسو بہا رہی تھی گڑ بڑا کر اسے دیکھنے لگی۔ مگر کچھ کہے بغیر بے انتہا ہچکچاہٹ کا شکار نیچے اتری تھی۔ مگر پہلے ہی مقام پہ جب پاؤں ٹخنوں سے اوپر تک بارش کے گدلے پانی اور کیچڑ میں لت پت ہوئے وہ گھبرا کر رہ گئی تھی۔ نگاہ میں بے چارگی تھی۔ بے بسی تھی مگر عبدالعلی متوجہ کہاں تھا۔

''چلو یار! بارش ابھی بہت تیز ہے۔''

عبداللہ کی جھلائی ہوئی آواز بارش کے پردے کے پار سے اس تک پہنچی تھی۔ گل خان نے برساتی بڑھا دی۔ جو عبدالعلی نے اس سے لے کر قدر کے آگے کی۔

''میں چل نہیں سکتی۔ ایک قدم اٹھانے کی کوشش میں وہ لڑکھڑا گئی تھی۔ ایک لمحے کو تو لگا تھا۔ زمین قدموں تلے سے بھی نکل گئی ہو۔ ابھی منہ کے بل گر جائے گی۔ مگر خیریت گزری۔ لیکن اسے یقین واثق تھا کہ اگلی کوشش میں وہ ہرگز نہیں سنبھل سکتی۔ بھلا کہاں چلی تھی وہ ایسے راستوں پہ جو ذرا سا بھی تجربہ ہوتا۔ جبھی روہانسی ہونے لگی۔

''کیوں نہیں چل سکیں گی......؟ اب کیا میں آپ کو اٹھا کر سر پر رکھ لوں......؟''

عبدالعلی جو گل خان کے ساتھ کئی فٹ آگے جا چکا تھا۔ اس نے بے بسی احتجاج اور مشکل کو خاطر میں لائے بغیر اس پہ چڑھائی کر گیا۔ قدر نے بھیگی آنکھوں سے اس بے مہر شخص کو دیکھا تھا۔ جس کے سینے میں یا تو دل نہیں تھا اگر تھا تو اس میں جذبہ نہیں پھوٹ سکتا تھا ہمدردی تک کا بھی۔

''سر آپ بھابی کا ہاتھ پکڑ لو پلیز! گر جائے گا بیچارا......''

اس کی نسبت تو گل خان کو اس سے ہمدردی لاحق ہو گئی۔ قدر نے ترچھی نگاہوں سے عبدالعلی کو دیکھا۔ جو گریزاں تھا۔ مگر حالات کی نزاکت کے پیش نظر یہ ناگریز بھی تھا جبھی ہچکچاہٹ آمیز انداز میں انداز میں سہی مگر اسے اپنا ہاتھ قدر کی جانب بڑھانا پڑا تھا۔ قدر نے بلا تردد اس کا سہارا لے لیا۔ اس کے باوجود ہر راستہ بہت کٹھن تھا۔ جیسے جیسے گاؤں نزدیک آ رہا تھا پانی بڑھتا ہوا ان کے گھٹنوں تک پہنچ گیا۔ جب وہ لوگ گل خان کے گھر میں داخل ہوئے سرتاپا نچڑ رہے تھے۔ مگر قدر کے لیے یہ گزرگاہ ستاروں کی گزرگاہ بن گئی تھی۔ خوشبوؤں کا سفر تھا جیسے...... وہ اپنے حواسوں میں واپس لوٹی تو مسکراہٹ اس کے لبوں پہ کھیل رہی تھی۔ گل خان نے مختصر تعارف پہ اس کی ایک ماہ کی بیاہی نئی نویلی دلہن اور بوڑھی ماں عبدالعلی اور قدر کے آگے بچھ بچھ جانے لگیں۔ قدر کو بالخصوص ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ گل خان کی نوعمر نازک سی بیوی پلوشے ساس کے اشارے پہ اسے اپنے سجے سجائے کمرے میں لے آئی۔ جہاں رنگین لڑیوں اور پنوں کی آرائش مسہری کے گرد ہنوز موجود تھی۔ سستا سا فرنیچر اور ہاتھ کی کڑھائی سے مزین تکیے غلاف اور چادر ہی تھیں پردے لٹک رہے تھے۔

''آپ یہاں بیٹھو ابھی ام آپ کو کپڑے دیتا ہے۔ نہا کر بدل لینا۔''

پلوشے عمر میں قدر سے بھی چند سال چھوٹی تھی۔ مشکل سے سولہ برس کی ہو گی۔ اس کا بس نہ

چلتا تھا قدر کو پلکوں پہ بٹھالے جو لباس وہ الماری سے استری شدہ اس کے لیے نکال کر لائی اسے دیکھ کر قدر کا دل گھبرانے لگا تھا۔

گوٹے کناری سے مزین طبی پٹھانی فراک جو کہ عموماً پٹھان عورتیں پہنتی ہیں مگر یہ چونکہ دلہن کا لباس تھا جبھی خاصا بھڑکیلا تھا۔

''نہیں ...... نہیں میں یہ نہیں پہن سکتی کوئی سادہ لباس چاہیے۔ اس نے فی الفور انکار کیا۔ جس کے جواب میں پلوشے نے جتنے بھی لباس نکالے سب ایک سے بڑھ کر ایک بھڑکیلے تھے۔ جنہیں وہ بہر حال نہیں پہنا چاہتی تھی۔ مگر پلوشے کی ساس نے اندر آ کر کچھ اتنی محبت سے اصرار کیا کہ اسے ناچار ماننی پڑی۔

''سادہ لباس ہے نہیں کوئی امارے پاس۔ ورنہ ام آپ کو ضرور دیتا۔''

پلوشے جو چند جماعتیں پڑھی ہوئی تھی۔ شرمساری بولی۔

''ابھی نیا شادی ہوا ہے ایسا ہی کپڑا پہنتی ہے ہماری بہو۔ آپ کیوں نہیں پہن رہی۔ آپ کا بھی شادی نیا ہوا ہے ناں......''

پلوشے کی ساس جس یقین سے کہہ گئی تھیں۔ قدر کے اختلاف ہونے کے باوجود تصحیح نہیں کر پائی۔ جس وقت وہ نہا کر لباس بدل کر آئی۔ عبدالعلی بھی کمرے میں آچکا تھا۔ اور گل خان بھی موجود تھا۔ قدر نے سرخ کڑھائی کی شال اچھی طرح پھیلا کر اوڑھی۔

''مورے امارا بھائی کو کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہیے۔ آج رات یہ لوگ ادھر ہی ٹھہرے گا۔ پلوشہ آپ کے ساتھ لیٹ جائے گی میں برآمدے میں ٹھیک رہوں گا۔''

وہ پروگرام طے کر چکا تھا گویا۔ عبدالعلی کے احتجاج کو خاطر میں لائے بغیر مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

''گل خان کو برآمدے میں لیٹنے سے روکیں۔ آپ سب خواتین ایک کمرے میں لیٹ جائیں۔ دوسرے میں، میں اور گل خان......'' عبدالعلی کے لہجے میں گڑبڑاہٹ بھی تھی۔ شدت کا اصرار بھی۔ گل خان کی والدہ کو تو جیسے یہ بات کسی گناہ کبیرہ کی طرح محسوس ہوئی تھی۔ جبھی کانوں کو ہاتھ لگانے لگی تھی گویا۔

''آپ نے کیسا بات کیا ہے اللہ کا نام لو۔ امارا تو دل ہی اتنا خوش ہے کہ اللہ نے رحمت بھیجی ہے۔ بارش کے ساتھ مہمان بھی۔ دو دو رحمتیں...... یہ بیوی ہے آپ کا تو آپ کو کیا گھبراہٹ۔ ام خود بھی ایسے ہی خوش ہیں۔''

عبدالعلی کو خاموش ہونا پڑا۔ یہ الگ بات کہ اب وہ باقاعدہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ پریشانی تو قدر تو بھی بات سن کر ہوئی تھی۔ جب ہی وہ ڈھنگ سے کھانا بھی نہ کھا سکی تھی بے تحاشا بھوک ہونے کے باوجود۔

''کھاؤ نا آپ! پہلے ہی بہت کمزور ہو آپ۔ جان بنے گی تو گھر بچے سنبھالو گی۔''

گل خان کی والدہ کو قدر بہت اچھی لگی تھی۔ جبھی نادر مشوروں سے نوازنے لگیں تھیں شاید۔ وہ جو پہلے ہی جزبز تھی اس کے باقاعدہ ہونٹ کچلنے لگی۔

''شادی کو کتنا عرصہ ہوا......؟ کوئی خوشخبری ہے......؟'' خاتون کا انداز رازدارانہ ہوا تھا مگر اس کے باوجود عبدالعلی کی سماعتوں نے باآسانی یہ بات سن لی۔ وہ سٹپٹا سا گیا۔ جبکہ قدر تو جیسے دہک سی گئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بزرگ خواتین پر شدید غصہ آیا۔

''کوئی بات نہیں ہے۔ دیر سویر اللہ کے گھر میں ہونا ہے۔ اماری بہو کو بھی ابھی تلک کوئی امید نہیں ہو سکا۔ ام نے کل ہی بڑے پیر صاحب سے گڑ پڑھوایا ہے۔ اللہ کے فضل سے بچہ ہوگی۔ کہو تو تھوڑا اسالا دوں۔ اللہ گود بھرے دے گا۔''

قدر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی کہ خاتون نے ان دونوں کی خاموشی سے جو نتیجہ اخذ کیا تھا اس لحاظ سے مزید گوہرافشانی کی تھی۔

''ٹھیک ہے ماں جی ضرور! آپ لا دیجیے گا۔ مگر صبح ......''

عبدالعلی کے جواب نے قدر کو گنگ کر ڈالا تھا۔ اسے اپنی سماعتوں پہ شبہ کا گمان ہوا۔ اس نے کنگا بستر پر پٹخ دیا اور غیر یقینی سے پلٹ کر عبدالعلی کو دیکھا۔ جو گل خان کی والدہ کی دعائیں سمیٹنے میں مصروف تھا۔ جو اس کی فرمانبرداری سے نہال ہو کر اسے دینے میں مصروف ہوئی تھیں۔

''واٹ نان سینس عبدالعلی ......! یہ گڑ جب وہ لائیں تو آپ خود کھالینا سمجھے آپ......؟''

محترمہ کے تشریف لے جاتے ہی وہ جو سرتاپا سلگ رہی تھی اس پہ چڑھائی کر دی۔ عبدالعلی نے جواباً شاید پہلی بار آج کے دن اسے براہ راست دیکھا تھا۔ پھر کاندھے اچکا دیے۔

''مینشن ناٹ کھا لوں گا۔'' تسلی بھرا انداز قدر کو مزید آگ لگانے کا باعث ٹھہرا۔

''اور یہ سب اس نے کمرے کی جانب اشارہ کرتے اسے باقاعدہ گھورا۔

''آپ نے سوچا بھی کیوں کہ میں آپ کے ساتھ کمرے میں تنہا رہ لوں گی۔'' وہ اتنے غصے میں تھی کہ مناسب الفاظ کا استعمال بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ عبدالعلی نے اب کی مرتبہ مصلحتاً خاموشی اختیار کی۔

''آپ ان کی غلط فہمی دور کر سکتے ہیں کہ میں ...... ہمارے بیچ یہ رشتہ نہیں ہے جو وہ سمجھ رہے ہیں۔

وہ سخت چڑ رہی تھی۔ اسے قطعی سمجھ نہیں آ رہی تھی اپنی ناپسندیدگی اپنی ناگواری کس طرح سے ظاہر کرے۔

رشتہ تو موجود ہے۔ آپ مانتی بھی ہی'' اب کہ عبدالعلی کا انداز بہت سرد تھا۔ اتنا کہ ایک لمحے کو قدر کو بھی سن کر کے رکھ گیا۔

وہ اس سے کترا کر بیرونی کھڑکی کھول کر کھڑا ہو گیا۔ باہر برستی بارش کو دیکھتا ہوا۔ مگر قدر کی اس بات پر اس نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔ گلابی چہرہ۔ باتونی لب، بھیگی بھیگی سی پلکیں جگمگاتا ہوا شفاف سحر طاری کرتا ہوا عکس ......اس کی ساری بے نیازی حسن کی شعاعوں میں جل کر خاک ہونے لگی۔ یہ الفاظ جتنے بھی سرد تھے مگر بہت جتلا کے کہے گئے تھے۔

دل کی پوری آمادگی کے ساتھ......قدر مسہری پر بڑے ریلیکس انداز میں براجمان تھی۔ تراشیدہ ہلکی نمی لیے سلکی بال سارے سمیٹ کر ایک سائیڈ پر کندھے پر ڈال رکھے تھے۔

''اپنے الفاظ یاد ہیں آپ کو......؟ مین چیز نکاح ہوتا ہے۔ رخصتی تو ایک فارمیلٹی ہے۔ جس کی شریعت میں ہرگز اتنی اہمیت نہیں ہے۔''

عبدالعلی کے الفاظ اب آنچ دینے لگے۔ وہ خود بھی کھڑکی بند کر کے اس کے مدمقابل بستر پہ ٹک گیا تھا۔ اس کی نظر میں قدر کو دیکھتے پہلی بار گہرائی اترنے لگی۔ دیکھنے کا یہ انداز نیا تھا۔ اس سے قبل اس نے قدر کو پہلے کبھی ایسا نہیں دیکھا تھا۔ قدر کو جو اس کی بات پر حیران ہو رہی تھی۔ اس کی

نظروں کا بدلا انداز اسے ہڑبرانے کو کافی ثابت ہوا۔ اپنے مابین رشتے کا احساس جاگا تو دل بے ترتیبی سے بدحواس ہو کر بہت بے ہنگم انداز میں دھڑک اٹھا۔ اس کی پلکیں لرز کر عارضوں پہ گریں اور دل جیسے اتھاہ گہرائیوں میں اترنے لگا۔

''تم نے آئینہ دیکھا کیا لگ رہی ہو......؟'' عبدالعلی چونکہ اس بہکا دینے والے ماحول میں خود کو لاچار بے بس اور سحرزدہ محسوس کر رہا تھا۔ جبھی دھیان بٹانے کو مزاح کے انداز میں گویا ہوا۔

''ان کپڑوں میں تم بالکل دیہاتی لگ رہی ہو......''

وہ مسکراہٹ دبا کر بے حد شرارت سے کہہ رہا تھا۔ قدر کی لانبی پلکیں بے تحاشا لرزنے لگیں۔

''مجھے بہت آکورڈ فیل ہو رہا ہے۔'' وہ جیسے منمنائی تھی۔ عبدالعلی سے کہیں بڑھ کر وہ مشکل کا شکار تھی جیسے عبدالعلی ہولے سے ہنس دیا۔

''پھر تم نے مجھے نہیں دیکھا شاید...... میں بھی گل خان لگ رہا ہوں۔''

اس نے خوبصورت گھیردار شلوار کو چھوا اونچی سی مگر کھلی مردانہ قمیض کا دامن تھپتھپایا اور بے تحاشا ہنسنے لگا۔ قدر نے چونک کر سر اٹھایا تھا تو جیسے اس کی ہنسی نہیں رک سکی تھی۔ وہ اس لباس میں جو کہ گل خان کا تھا۔ واقعی کوئی پٹھان نوجوان نظر آ رہا تھا مگر اس کا یہ روپ بھی بہت اٹریکٹیو تھا۔ یہ قدر کے دل نے چپکے سے گواہی دے دی تھی اسے۔

''واقعی آپ بالکل گل خان لگ رہے ہیں۔'' وہ اپنا ہاتھ منہ پر رکھے ہنوز ہنس رہی تھی۔ نازک سا ہاتھ سیاہ بالوں کی آبشار موتیوں سے دانتوں کی چمک سیاہ گہری آنکھوں کا طلسم۔ دلکشی جاذبیت نزاکت کا مجسم مجموعہ۔ وہ آج عبدالعلی کے حواسوں پر چھا رہی تھی پتا نہیں کیوں۔

''اگر واقعی ایسا ہے تو پھر کیا حرج ہے۔ اگر ہم گل خان اور اس کی بیوی کی طرح ہی آج رات گزار دیں۔'' عبدالعلی نے گو کہ شرارت سے کہا تھا۔ مگر اس کا لہجہ جذبات سے بوجھل ہو رہا تھا۔ جو قدرے نارمل ہو چکی تھی۔ اس بات پہ دھک سی رہ گئی۔ اسے عبدالعلی سے اپنا فاصلہ یکدم بہت کم محسوس ہوا۔ اس کا دل جیسے دھڑکنا بھولنے لگا۔ التفات کی یہ بارشیں نئی اور عجیب تھیں۔ اس کی نرم نظروں کی روشنی قدر کو مطیع کر رہی تھی۔ اس کی نظریں عبدالعلی کے سامنے اٹھنے کی تاب کھونے لگیں۔ قدر کو یہ سب اچھا بھی لگ رہا تھا اور غیر مناسب بھی...... عجیب متضاد کفیات تھیں۔ دل گداز ہوا جاتا تھا۔ معاً اس نے اٹھنا چاہا وہ یہ فاصلے بڑھا دینا چاہتی تھی مگر حالات واقعات سب شاید اس کے مخالف تھے۔ جبھی اس لمحے بادل گرجا تھا۔ یہ کڑک اتنی خوفناک تھی کہ ایسی دل دہلا دینے والی کہ وہ خوف کے حصار میں گھرتی بے اختیار ہو کر چیختی لاشعوری طور پہ سہی عبدالعلی کے وجود میں پناہ لے بیٹھی تھی۔ یہ چند لمحوں کی اعصابی کشمکش کا احساس تھا۔ حواسوں میں لوٹتے ہی اس نے فاصلے پہ ہونا چاہا۔ مگر عبدالعلی نے یہ کوشش ناکام بناتے ہوئے اسے بازوؤں کے مضبوط شکنجے میں کس لیا تھا اور فاصلہ مزید گھٹا دیا۔

''اٹس اوکے...... ٹیک اٹ ایزی۔'' وہ اس پہ جھکا تھا اور اس کے نم مہکتے بال چوم لیے۔ قدر شاکڈ رہ گئی۔

''تم کوئی ساحرہ ہو جس نے بالآخر مجھے اپنا اسیر کر لیا ہے۔''

اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔ مگر بے

حد بوجھل تھی۔قدر کے حواس اس کا ساتھ چھوڑنے لگے۔عبدالعلی کے دونوں بازو اس کی کمر کے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے۔اس کے مضبوط بازوؤں حصار میں نرمی بھی تھی اور گرمی بھی۔شدت بھی اس کی گرم بے ترتیب سانسیں قدر کے بالوں اور گالوں کو چھو کر گردن تک پہنچ رہی تھیں۔دو انگارہ لبوں نے اس کے چہرے کو دہکایا تو وہ جیسے تڑپ کر ہوش میں آ گئی۔جبھی بے اختیار مچلی تھی۔

''چھوڑیں علی!! دس از ناٹ فیئر۔''اس کی آواز میں نمی بھی تھی۔بے بسی بھی تھی۔مگر عبدالعلی پہ اثر نہیں ہوا۔

''مجھے لگتا ہے...... میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔قدر ہمارا تعلق جائز ہے۔''

وہ اسی بھیجتے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا قدر کے اندر غضب کی ٹوٹ پھوٹ غضب کی بدگمانی اور اشتعال اتر آیا۔اس نے پوری طاقت صرف کی تھی اور ایک جھٹکے سے اس کے بازوؤں کا حصار توڑ دیا تھا۔لڑکھڑانے کے انداز میں کئی قدم پیچھے ہٹی اور دیوار سے لگ کر بری طرح کانپتی خاموش آنسو بہانے لگی۔

''مجھے نہیں پتا آپ کو کیا ہوا ہے علی! مگر مجھے اتنا معلوم ہے آپ اس وقتی خواہش سے مغلوب ہو کر میرے پاس آئے ہیں۔ورنہ آپ ایسے کبھی بھی نہیں تھے کہ میرے بغیر نہ رہ سکتے۔میں خود کو آپ کے اس عارضی جذبے کے حوالے نہیں کر سکتی۔سن لیں آپ......''

وہ زاروقطار رو رہی تھی عبدالعلی سکتہ زدہ کھڑا تھا۔معاً اس نے ہونٹ بھینچے اور رُخ پھیر لیا۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو قدر ایسا ہرگز کچھ نہیں ہے اور...... میرے میدان میں اترتے ہی بھاگ کھڑی کیوں ہوئی تم......؟ محبت کے بڑے دعوے تھے تمہیں تو......''

وہ جیسے بامشکل مسکرایا۔قدر نے دھندلائی نظروں سے اسے دیکھا اور بستر پہ گری چادر اٹھا کر اپنے گرد لپیٹ لی۔

''آپ شاید مجھے پرکھنا اور آزمانا چاہتے تھے عبدالعلی! یہی مقصد پیش نظر ہوگا کہ میں کس حد تک کمزور نفس کی مالک ہوں۔تو سن لیں میں محبت کرتی ہوں آپ سے، آپ کے علاوہ کسی کو زندگی میں کبھی قبول نہیں کر سکتی۔مگر میں پھر بھی نفس کی اتنی تابع نہیں ہوں اس کے باوجود یہ تعلق جائز ہے۔میری فضول اور بے محض اور محض شرارت میں کہی باتوں کا بہت غلط مطلب لے چکے ہیں آپ۔''

اس کا درشت لہجہ بے حد تلخی سموئے ہوئے روکھا اور سرد تھا۔عبدالعلی کچھ نہیں بولا۔قدر صوفے پہ سکڑ کر لیٹ گئی۔اپنے اوپر وہی شال پھیلالی تھی۔عبدالعلی نے لائٹ بند کر دی اور بیڈ پر چلا گیا۔قدر اس سنسناتی ہوئی تاریکی میں اپنے ہی سانسوں کی آواز سنتی رہی۔کچھ دیر قبل جو آگ اسے سر سے پاؤں تک سلگا رہی تھی وہ اب دل کی جانب رُخ کر رہی تھی۔وہ سونا چاہتی تھی مگر سونے کے بجائے رو رہی تھی حالانکہ وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔آج کی رات اسے یہی کرنا تھا۔دوسری جانب عبدالعلی تھا۔آج کی رات نیند اسے بھی نہیں آئی تھی کہ یہ رات ایک نئے ادراک کی رات تھی۔

جھیل پر اترتی مرغابیوں کی طرح دل کے ساحل پر جو کیفیات آج اتری تھیں۔وہ بہت نئی اور انوکھی تھیں۔آج کی رات جیسی پہلے بھی کوئی رات نہیں آئی تھی۔وہ کھویا کھویا سا تھا۔ایک کسک پورے وجود میں نشاط انگیز بے چینی پھیلا

رہی تھی۔ ذہن تھا کہ اس گھڑی بھر کی قربت کے خمار سے نہیں نکل رہا تھا۔ یہ عجیب مدہوشی کی کیفیات تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ اتنا سرد مہر خشک اور روکھا انسان ایک دم سے کیسے کچھ کا کچھ ہوگیا۔ یہ صرف ماحول کا اثر تو نہ تھا۔ دل پہ یکدم ایسی واردات ہوئی تھی کہ وہ اس خواہش کے بہاؤ میں بہتا چلا گیا تھا۔ قدر کا جوابی ردعمل اسے کس خفت جھنجھلاہٹ یا تناؤ کا شکار کرنے کی بجائے مزید ہلکا پھلکا کر گیا تھا۔

گو کہ وہ اس کو جانچ رہا تھا نہ پرکھ جیسا کہ قدر اس کے متعلق گمان کر رہی تھی۔ ہاں البتہ اس کا یہ وقار اس کی یہ انا اسے بہت اہم بہت خاص بہت پیاری لگ رہی تھی۔ بلاشبہ وہ خیالات سوچ اور عمل بھی پاکیزگی کی حد تک بے داغ تھی۔ معیار کے مطابق جہاں عبدالعلی اپنی شریک حیات کو دیکھنے کا متمنی تھا۔ اسے قدر کی خفگی کا احساس تھا مگر فکرمندی نہیں۔ اسے اپنے اس عمل پہ ہرگز کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا اس نے بہرحال کوئی غلط حرکت نہیں کی ہے۔

☆......☆......☆

سورج ابھی پوری طرح نہ نکلا تھا اور کہر فصلوں سے ذرا اوپر سر اٹھائے ٹھہری سی گئی تھی۔ چڑیوں کے غول کے غول گھنے درختوں سے اڑتے اور ان کی چہکاریں فضا میں شور کا احساس بھر جاتیں۔ گل خان کے ساتھ قریبی مسجد میں وہ نماز پڑھ کر اب واپس آ رہا تھا۔ گاؤں کی گلیاں ہنوز گزشتہ رات کے طوفان کے مناظر کا عکس پیش کر رہی تھیں۔ گوڈے گوڈے کیچڑ بھرے تالاب جیسی گلیاں جن میں جانور منہ مارتے تھے۔ مرغیاں، بکریاں اور گدھے گل خان جانوروں کو شکارتا گلی محلے کے آشنا بوڑھے نوجوانوں سے سلام دعا کرتا اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ سروں پر چارے اور گوبر کے ٹوکرے رکھے دوپٹوں میں منہ چھپائے خواتین بھی اپنے کام میں نظر آتیں۔

"آپ کمرے میں چلو سر! ام ابھی ناشتہ لاتی ہے۔"

گھر کے بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی گل خان نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا تھا۔

گاڑی ٹھیک ہونے کا بندوبست کردو گل خان پلیز! وہ عاجز ہوا تھا گل کان نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور انکساری سے جھک گیا۔

"آپ فکر نہ کرو سر! اللہ کے فضل سے یہ کام بھی جلد ہی ہو جائے گا۔" عبدالعلی مسکرایا اور قدم باہر بڑھا کر بیٹھک کی جانب گیا۔ جہاں رات سے اس کا اور قدر کا قیام تھا۔ اندر آ کر اپنے پیچھے ہی اس نے دروازہ بند کرتے اس نے دزدیدہ نگاہ بستر پہ ڈالی اور گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔ قدر ہنوز صوفے پر دراز تھی۔ حالانکہ مسجد جانے سے قبل اس نے اسے جگا کر بستر پہ جانے کا کہتے اپنے باہر جانے کی نوید سنائی تھی۔ مگر وہ شاید ابھی تک بدگمان تھی۔

"اٹھی نہیں ہو تم......؟ صبح ہو چکی ہے تیاری پکڑو اپنی۔" بستر کے کونے پر ٹکتے ہوئے اس نے نارمل انداز میں قدر کو مخاطب کیا تھا۔

"آپ واپس چلیں۔ مجھے سمعیہ کی طرف نہیں جانا۔" اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس سے نگاہ ملائے بغیر خشک انداز میں کہہ گئی تو عبدالعلی نے بے طرح چونک کر اسے دیکھا۔

"سمعیہ غالباً وہی خاتون ہیں جن کی خاطر آپ نے یہ کشت کاٹے تھے۔" وہ مسکراہٹ دبا رہا تھا۔ قدر دبک سی گئی۔ البتہ ہونٹوں کو سختی سے بھینچے رکھا۔

''اس فیصلے کی وجہ......؟'' عبدالعلی حیران و پریشان نظر آنے لگا۔
''میں جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔'' وہ نروٹھے پن سے بول پڑی۔
''پابند تو ہیں خیر آپ۔ صرف جواب دینے کی نہیں۔ میری ہر خواہش کی تکمیل کی چاہے وہ خواہش......''
''عبدالعلی صاحب......! پلیز خاموش ہو جائیے۔ میں نے کہا تھا نا کہ آپ نے مجھے بہت غلط سمجھا ہے۔'' اس کی آواز میں سوز تو تھا ہی نمی بھی اتر آئی۔
''میں نے اب ہی تو تمہیں سمجھا ہے قدر......!'' اس کا گھمبیر لہجہ تر ہوا۔
''میں نے جانا جو لوگ رشتوں کے تقدس میں ذرا سی اونچ نیچ والوں کو نا خالص اور قابل نفرت گردانتے ہوں۔ ایسے لوگ عام نہیں ہو سکتے۔''
قدر حیران رہ گئیں۔ اسے عبدالعلی کی بات خاک سمجھ نہیں آئی تھی۔ ہاں وہ اتنا سمجھ سکتی تھی۔ اس کی پرکھ ہوئی تھی اگر وہ اس پرکھ میں ہار جاتی تو عبدالعلی کے معیار سے ہمیشہ کے لیے گر جاتی۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ اٹھ کر تیزی سے باہر چلی گئی۔ عبدالعلی نے کہاں اس کی کیفیت اس کے احساسات پہ توجہ دی۔ وہ تو بس اپنی کیفیات پہ مطمئن تھا۔ خوش تھا سرشار تھا۔ وہ اس وقت برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ پرسکون، قدر آگ آگ ہو رہی تھی۔ دھواں آگ سے بھی نکلتا ہے اور برف سے بھی۔ آگ اور برف کا دھواں...... نتیجہ دھندلا منظر۔ ان کے سامنے بھی منظر دھندلا رہے تھے۔

☆......☆......☆

بستر پہ تکیوں میں منہ چھپائے سخت بے زاری کا عالم میں بھی وہ میوزک انجوائے نہیں کر سکتا تھا۔ مگر دھیان کا بٹنا ضروری تھا۔ جبھی چل رہا تھا مگر کسی نے اندر آ کر جب ایکدم سے آف کیا تو اس کا موڈ بھی آف ہو گیا تھا گویا۔ قہر سے بھرے انداز میں وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا تو آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں۔ کچھ طبیعت کی خرابی سے کچھ غصے سے...... مگر امن کے ساتھ اتباع کو کھڑے پا کر اس کے اندر حیرت استعجاب گیر یقینی خوشگوار اور بے تحاشا خوشی کا احساس اترتا چلا گیا تھا۔ جبھی چند لمحوں کو اس زاویے پر ساکن ہو کر رہ گیا۔
''یہ اتباع......! خیریت معلوم کرنے آئی ہے آپ کی بھائی!''
امن کے کہنے پہ وہ گہرا سانس بھرتا خوشی کے عالم میں سیدھا ہو بیٹھا۔
''آ گئی ہیں تو تشریف رکھ لیجیے۔ احسان عظیم ہوگا۔'' اس کا لہجہ اس کے اندر کی سرشاری کا گواہ تھا۔ امن نے مسکراہٹ دبائی۔
''بیٹھو اتباع! میں چائے بنا لاتی ہوں۔'' وہ اگلے لمحے چھپاک سے باہر تھی۔ اتباع جو اسے اس وعدے کے ساتھ لائی تھی کہ وہ اتنی دیر اس کے بیٹھی رہے گی جب تک وہ عبداللہ کے ساتھ ہے اس دغابازی پہ دھک سی رہ گئی۔
''بیٹھو اتباع! گھبرا کیوں رہی ہو......؟'' وہ ہلکے سے ہنسا تھا اور خود بھی بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا لی۔ اس کی روشن آنکھیں بہت تفصیلی جائزے میں مگن تھیں۔ اتباع کو اس قدر گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ یہ اس کی دھمکیاں خفگی اور شکوے تھے لاریب سے کہ انہیں اسے زبردستی اس کی خیریت پوچھنے کو بھیجنا پڑا تھا۔ مگر اب اتباع کو لگ رہا تھا پھر غلطی ہو گئی ہے۔ عبداللہ جینز کے اوپر صرف بنیان پہنے ہوئے تھا۔ اتباع کو اس کی یہ بے تکلفی ہی بہت بری لگ رہی۔ وہ پہلی بار اس طرح اس کے

سامنے آیا تھا۔ شاید اسے تو احساس بھی نہیں تھا۔ مگر اتباع جز بز ہو چکی تھی۔ کہنا چاہتی تھی مگر حجاب مانع تھا۔ وہ ہر گز اس سے اتنی بے تکلف نہیں تھی۔

''سچ پوچھو تو بہت اچھا لگا تمہیں اس طرح آج اپنے پاس دیکھنا۔ مجھے یقین کرنے میں دشواری نہیں رہے گی اتباع! کہ تمہیں میری پرواہ ہے۔ میرا خیال ہے تم وہ ہو جسے دیکھ کر مجھے احساس ہوا تھا کہ تم میرے ہی وجود کا گمشدہ حصہ ہو۔ جبھی تمہیں حاصل کرنے کو بے قرار ہوا تھا۔ اتباع میں خود کو مکمل دیکھنا چاہتا تھا۔''

وہ اسے یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ پلکیں جھپکاتے بنا۔

''پہلی بات میں نے تمہیں دیکھا۔ مجھے لگا تھا جیسے اردگرد پھول کھل گئے ہوں۔ روشنی کی کرن چمکی ہو۔''

وہ کتنے دھیان سے کس وجہ سچائی سے اپنی کیفیات آشکار کر رہا تھا۔ جبکہ اتباع اس قدر سٹپٹائی گھبرائی ہوئی تھی۔ معاً وہ ہاتھ مسلتے ہوئے ایکدم اٹھ کھڑی ہوئی تو عبداللہ بے قرار سا ہو کر ایک جھٹکے سے اس کے مقابل آ گیا۔

''ابھی مت جاؤ اتباع! اتنی جلدی نہ جاؤ پلیز!''

وہ ہنوز اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ جن میں ایک خاص کشش تھی۔ جو لوٹ لینے خرید لینے جوگی بنا دینے میں ماہر تھی۔

''مم...... مگر آپ نے شرٹ نہیں پہنی ہوئی مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔''

وہ جھنجلائی تھی اور بالآخر اپنی خفگی کی وجہ اُگل دی۔ عبداللہ پہلے حیران ہوا۔ پھر خفت زدہ اس کے بعد اس شرمندگی میں مبتلا خجالت آمیز ہنسی ہنسنے لگا۔

''اوہ...... سوری اتباع! پلیز غلط نہ سمجھیے گا مجھے بہت خراب عادت ہے۔ رات کو شرٹ اتارے بغیر میں سو نہیں سکتا۔ تو آج بستر سے نکلا ہی نہیں جبھی اس جانب توجہ ہی نہیں جا سکی۔''

سرہانے پڑی شرٹ اٹھا کر پہنتا ہوا وہ بے ساختہ وضاحت پیش کر رہا تھا۔ اتباع کچھ بولی نہیں۔ تو عبداللہ نے بٹن بند کرتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔

''ابھی بھی خفا ہیں......؟'' وہ کتنا سادہ معصوم لگ رہا تھا سوال کرتے۔ اتباع کو ہنسی آئی مگر دبا لی۔

''اٹس او کے۔'' اس نے سنجیدگی سے ہی جواب دیا۔ وہ قدرے ریلکس ہوا۔

''تھینکس...... بیٹھ جائیں نا آپ۔'' امن چائے لاتی ہو گی۔

اتباع کو ناچار دوبارہ بیٹھنا پڑا۔ عبداللہ جیسے پرسکون ہو کر رہ گیا۔ کچھ دیر اسے تبسم خیز نظروں سے دیکھتا رہا پھر بے ساختہ گنگنایا تھا۔

نگاہ یار کے پردوں میں ہے حیا کیسی
ستم کیسا کرم کیسا جفا کیسی وفا کیسی

اس کا لہجہ شوخ و شنگ بھی تھا۔ سراہتا ہوا بھی۔ اتباع کی پھر سے جان پہ بننے لگی۔ اس نے اضطراب سے پہلو بدلا تھا اور پھر عاجز نظروں سے اسے دیکھا۔

''اگر ایسے کریں گے تو میں چلی جاؤں گی۔'' دھمکی ایسی تھی کہ وہ کھل کر ہنسا پھر جواباً گویا ہوا تو انداز شرارت و سنجیدگی کا مظہر تھا۔ کسی حد تک دھمکی آمیز بھی۔

''اگر آپ ایسا کریں گی تو ہم بھی مستقل بنیادوں پر آپ کو یہاں لانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ایسے کہ پھر واپس نہیں جا سکیں گی۔''

اتباع کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے گھبرا کر اُسے دیکھا تھا۔ وہ جو اس کی سمت ہی متوجہ

تھا۔ اس درجہ کیفیات کے نزول پہ جیسے اسے دیکھتا سحرزدہ ہوگیا۔

کیا غضب ہے کہ اس کی خاموشی
مجھ سے باتیں ہزار کرتی ہے

وہ جیسے کراہا تھا۔ اتباع ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔۔ عبداللہ نے بے اختیار ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''کیسا لگا میرا سراہنا...... میرا انتخاب......''

اتباع کا دل رونے کو چاہنے لگا۔ یہ امن بھی بدتمیز جانے کہاں رہ گئی تھی۔ اسے اس پہ بھی غصہ آیا۔

''شاعری اور موسیقی میرے لیے میری روح کی غذا ہے سمجھ لیں۔ آپ بیٹھیں نا میں آپ کو ایک سانگ سناتا ہوں۔ جو آپ کی آمد سے پہلے سن رہا تھا۔ اف...... کیا شاعری کی ہے۔ کلر ہے ،تباہی ہے۔''

وہ جوشِ جذبات سے پلٹ کر بستر پہ گرا اور ریموٹ اٹھانے گا۔ ارادہ ظاہر ہے۔ میوزک آن کرنے کا تھا۔ جب اتباع نے درشتی سے مداخلت کردی تھی۔

''زحمت نہ کریں عبداللہ! میں گانے نہیں سنتی نہ سننا چاہتی ہوں۔

عبداللہ میکانکی انداز میں رکا۔ پھر پلٹ کر اسے دیکھا اور گہرا سانس بھر کے ریموٹ واپس بستر پہ اچھال دیا۔ انداز میں بے دلی تھی۔ سارا جوش خروش ماند پڑ گیا تھا گویا۔

''عبداللہ ایک بات کہوں...... اگر آپ غور کریں تو......؟'' نظریں جھکائے کچھ سوچتی ہوئی وہ متذبذب بھی لگی۔

عبداللہ حیران رہ گیا۔ معاً اس کی آنکھیں کسی احساس سے چمکیں اور بے ساختہ مسکرانے لگیں۔

''ضرور مادام! اور آپ کو اجازت کی ہرگز ضرورت نہیں وہ پھر سے خوش و خرم چاق و چوبند تھا جیسے۔

اتباع نے اس تبدیلی کو پتا نہیں کس حد تک نوٹ کیا اور گہرا سانس بھر کے مدھم انداز میں گویا ہوئی تھی۔

''ابھی آپ نے کہا نا...... آپ کی روح کی غذا موسیقی اور شاعری ہے۔ عبداللہ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ روح کی غذا موسیقی نہیں، قرآن کریم کی سورتیں ہیں۔ ایک ہی گانا بار بار سننے اور گانے سے اکتاہٹ ہو جاتی ہے مگر قرآن کریم کی ایک ہی صورت بار بار پڑھنے اور سننے سے اکتاہٹ نہیں ہوتی۔ اس کی ایک مثال سورہ فاتحہ ہے۔ ہر رکعت میں پڑھی اور تلاوت کی جاتی ہے۔ آج تک کوئی اکتایا نہیں۔ اگر ہو سکے تو زندگی میں اس کا تجربہ ضرور کیجیے گا۔ یہ خواہش ہے میری۔''

جھکی پلکیں سلیقے سے اوڑھا دوپٹا تقدس کے ہالے میں روشن چہرہ...... انسان کے روپ میں فرشتہ لگی اسے، جنت کی حور جو شاید راستہ بھٹک گئی تھی۔ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر آہستگی سے......نرمی سے مسکرایا تھا۔ یہ مسکراہٹ بہت دل سے اٹڈی تھی۔ جبھی بہت خوبصورت تھی۔ پیور تھی۔ شفاف تھی جس نے اس کے چہرے کو اجال دیا تھا۔ معاً وہ خود کو اس مسحور کن کیفیت سے نکالنے کو کھنکھارا اور بھاری آواز میں بولا تھا۔

''شیور وائے ناٹ اتباع! مگر ایک بات میں بھی کہوں گا وہ یہ کہ...... ہر بار اتنی خوبصورت بات آپ اتنے فاصلے سے کرتی ہیں تو بہت تشنگی کا احساس ہوتا ہے مجھے۔ سمجھیں سارا مزہ ہی کرکرہ ہو جاتا ہے ایسا نہ کریں۔ شادی کرلیں ہم۔ پھر آپ مجھ پہ جتنے مرضی فرمان صادر کیجیے گا۔ نہ

مانوں تو جو مرضی سزا......"

وہ ہنس رہا تھا۔ اتباع بے اختیار جھینپ گئی۔ خفگی کا تاثر اس کے صبیح چہرے پہ اترا تھا۔ مگر وہ وہاں مزید نہیں رکی۔ اور تیزی سے کمرے سے نکل آئی۔ کتنی دیر بعد تک بھی اس کی دھڑکنیں اس کی سانسیں اعتدال پہ نہیں آسکی تھیں۔

☆......☆......☆

وہ گھر آ گئی تھی تو کچھ دیر بعد ہی عبدالعلی اور قدر بھی آ گئے۔ وہ ان میں مگن ہو گئی۔ کھانا پکانا پھر نماز اس کے بعد مصروفیات...... کتنی دیر بعد موبائل دیکھا تو وہاں عبداللہ کا میسج I love u کی صورت میں جگمگا رہا تھا۔ اس کا دل جیسے کسی نے جکڑ لیا۔ وہ کچھ دیر اس کیفیت سے نہیں نکل سکی۔ اسے لگنے لگا تھا عبداللہ اپنی محبت کا سنہرا جال اس کے گرد جانفشانی سے بن رہا ہے کہ وہ چاہے بھی تو اس سے نہیں نکل سکتی۔ بلکہ اگر حقیقت کی نظر سے اپنا تجزیہ کرے تو اس سے بھی عبداللہ کی یہ محبت بہت اچھی لگ رہی تھی۔ چاہے جانے کا دلربا احساس اسے خود اپنی نظروں میں باوقت بنانے لگا تھا۔ وہ پوری طرح اس کی سوچوں اس کی باتوں میں محو تھی۔ جب ہاتھ میں موجود سیل فون اچانک وائبریٹ کرنے لگا۔ اتباع اپنے دھیان میں اتنی محو تھی کہ بری طرح سے ہڑبڑا گئی۔ سنبھلتے ہوئے بے تحاشا خجالت نے آن لیا کہ سیل فون اس کے ساتھ سے چھوٹ کر بستر پہ جا گرا تھا۔

"عبداللہ کالنگ......" اس کا دل زور سے دھڑکا تو لبوں پہ بڑی بے ساختہ قسم کی مسکان اتری۔

"السلام وعلیکم! طبیعت کیسی ہے......؟" یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے عبداللہ سے سلسلہ کلام جوڑا تھا۔ مگر دوسری جانب کچھ ایسی کیفیت کا شکار تھا کہ کس تبدیلی پہ غور نہیں کر سکا۔

"وسلام! طبیعت کا نہ پوچھو جان من! اگر آشکار کر دی تو تم اتنی خفا ہو جاؤ گی کہ ڈر ہے پھر شاید بات بھی نہ کرو۔ بس اتنا سن لو مجھے نیند نہیں آ رہی۔ تمہاری کمی فیل کر رہا ہوں۔

اور اتباع کے پاس جیسے الفاظ ختم ہو گئے۔ وہ خاموش رہی تھی مگر دل کی دھک دھک بہت واضح تھی۔

'خفا ہو گئیں اتباع! وہ آہستگی سے مگر بے حد بوجھل آواز میں مخاطب ہوا۔ اتباع نے محض ہنکارا بھرا۔

"تم شادی کر لو مجھ سے پلیز! میں بعد میں ہرگز پابندی نہیں لگاؤں گا تم پہ...... جتنا مرضی پڑھنا۔

وہ ملتجی ہوا تھا۔ اتباع گڑبڑا گئی۔

"یہ تو ممکن نہیں ہے پلیز......"

"کیا...... پڑھنا کہ شادی......؟"

عبداللہ چڑا۔

"آپ ویٹ کریں عبداللہ! میرے نزدیک میری تعلیم بہت اہم ہے۔ اس کا لہجہ مضبوط تھا۔ عبداللہ کو یکدم چپ لگ گئی۔

"طے ہوا بہت ظالم ہو تم...... تمہیں کیا پتا مجھ پہ کیا بیتتی ہے ذرا سا اندازہ اس سے کر لو کہ۔

رات چپ چاپ دبے پاؤں چلی آتی ہے
صرف خاموش ہے روتی بھی نہیں ہنستی بھی نہیں
چاند کی کرنوں میں وہ سابق ہر یشم بھی نہیں
چاند مصری کی ڈلی ہے کہ گھل جاتی ہے
اور سناٹے کی اک دھول اڑی جاتی ہے
ہجر کی راتوں میں یہ دیکھو کہ کیا ہوتا ہے
اس کے لہجے کی آنچ اتنی دور سے بھی اتنے

فاصلوں کے باوجود اتباع کھلسانے لگی تھی۔ وہ ساکن بیٹھی رو گئی۔

"ٹھیک ہے آپ آرام کریں۔ میں نے خواہ مخواہ ڈسٹرب کر دیا۔"

وہ ایک دم رابطہ منقطع کر گیا۔ اتباع ششدر رہوئی تھی۔ گہرا سانس بھرتی نیم دراز ہوگئی۔

(یہ کن راہوں پہ ہاتھ پکڑ کر زبردستی لے جارہے ہیں آپ مجھے عبداللہ! کیوں چاہتے ہیں میں بھی چین کھودوں۔) اس کی خوبصورت آنکھیں نم ہورہی تھیں۔

☆......☆......☆

لان کے آخری کونے میں گلابوں کے کنج کے پاس وہ کب سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اداس، ملول...... ویران کل سے آئی تھی۔ کل سے یہی کیفیت تھی۔ سب ہی حیران تھے۔ مگر اتباع تو مضطرب ہو چکی تھی۔ کتنا پوچھا بھی تھا اس نے...... مگر وہ جواب ہی نہ دیتی تھی۔ خود میں غلطاں...... کسی اضطراب کا شکار...... اتباع نے بات کو شرارت کا رُخ دے کر اسے چھیڑا تھا تو آنکھیں بھیگ گئیں۔

"لاسٹ ٹائم تمہیں یاد ہے۔ تم نے مجھ سے کیا کہا تھا۔ میرا بھائی اتنا سرد نہیں جتنا تم سمجھتی تھیں۔ اچھا خاصا لوفر ہے۔ کیا اس سفر میں ان کی لوفری...... میرا مطلب ہے رشتے کا کوئی استحقاق تمہیں برا لگا ہے یا کوئی اور بات ہے۔"

جواب میں قدر کی آنکھیں جتنی تیزی سے بھیگی تھیں وہ بات اتباع کے لیے بے حد پریشان کن تھی۔ کچھ کہے بغیر وہ وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ اور کمرے میں بند ہو کر شدت و من سے روتی رہی تھی۔

"میں تمہیں کیا بتاؤں اتباع! میں نے کیا کھو دیا ہے۔ وہ باتیں جو میں نے محض شرارت میں کہہ جاتی تھی۔ میرے گلے کا طوق ثابت ہو چکی ہیں۔ نظروں سے گرنا وہ بھی اس شخص کی جو آپ کے نزدیک سب سے خاص سب سے اہم ہو کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے مجھ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے۔...... تم نے کہا تھا اتباع......! کہ عورت جب تک مرد سے دور رہتی ہے تب تک وہ مرد کے لیے حسین دلکش اور نایاب چیز ہوتی ہے۔ لیکن جس وقت وہ محبت کا اقرار کر لیتی ہے تب مرد کی نگاہوں میں اس عورت کی اہمیت اور دلکشی ختم ہو جاتی ہے۔ جبکہ عورت کی نگاہوں میں اس مرد کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ...... عورت اقرار کر کے قید ہو جاتی ہے اور مرد اقرار سن کر آزاد ہو جاتا ہے۔ نفیس مرد ہمیشہ عورت کو محبت سے زیادہ عزت دیا کرتے ہیں۔ کیونکہ محبت کا اظہار تو خاص خاص موقعوں پر ہی کیا جاتا ہے۔ جبکہ عزت ہر وقت ملحوظِ خاطر رکھی جاتی ہے۔ عورت محبت کے بغیر آدھی ہوتی ہے۔ جبکہ عزت کے بغیر عورت، عورت نہیں رہتی۔" مجھے اب جا کیا حساس ہوا۔ میں نے کتنی بڑی غلطی کی۔ خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار ڈالی۔ عبدالعلی...... جنہیں میں خاص بہت بلند سمجھتی تھی۔ وہ بھی......" اس نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں مگر آنسو پھر بھی مچلتے رہے بکھرتے رہے۔

"انہیں پتا ہے میں ہرٹ ہوں۔ وہ پھر بھی کوئی وضاحت نہیں مجھے دے کر گئے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک میری عزت ہی نہیں ہے۔ کاش میں مرجاتی اس دکھ کو سہنے سے پہلے...... مجھ سے یہ ذلت برداشت نہیں ہورہی۔"

(لفظ لفظ مہکتے اِس خوبصورت ناول کی

ضبط کا حوصلہ نہ پوچھ

''چپ ہو جاؤ وینی...... چپ ہو جاؤ'' وہ خوشامد سے کہہ رہا تھا۔ الوینہ کی امی کے آنے کا وقت ہو گیا تھا اگر وہ اس وقت ان دونوں کو اور خاص طور پر الوینہ کو لان میں دیکھ لیتیں تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن الوینہ کو آنے والے خطرے کا احساس نہیں تھا۔ وہ پوری......

آشی کو دیکھ کر اسے بھی ستار بجانے کا شوق ہو گیا۔ لیکن کم بخت سر قابو میں ہی نہیں آتے تھے جبکہ آشی کو ستار بجانے میں خاصی مہارت تھی۔ اس نے ایف ایس سی کے امتحان کے بعد چھٹیوں میں میوزک کی کلاسز جوائن کی تھیں اور ستار بجانے سیکھ لیے تھے۔

اس نے اپنے دوست سے ایک پرانا ستار بھی خرید لیا تھا۔ اور دن رات الوینہ کے کان کھاتی تھی۔

وہ تو ہر جگہ دوست بنانے میں ماہر تھا۔ میوزک کلاسز کے لیے بھی اسے زیادہ خرچہ کرنا نہیں پڑتا تھا۔ کچھ واقفیت کام آ گئی تھی۔ باقی
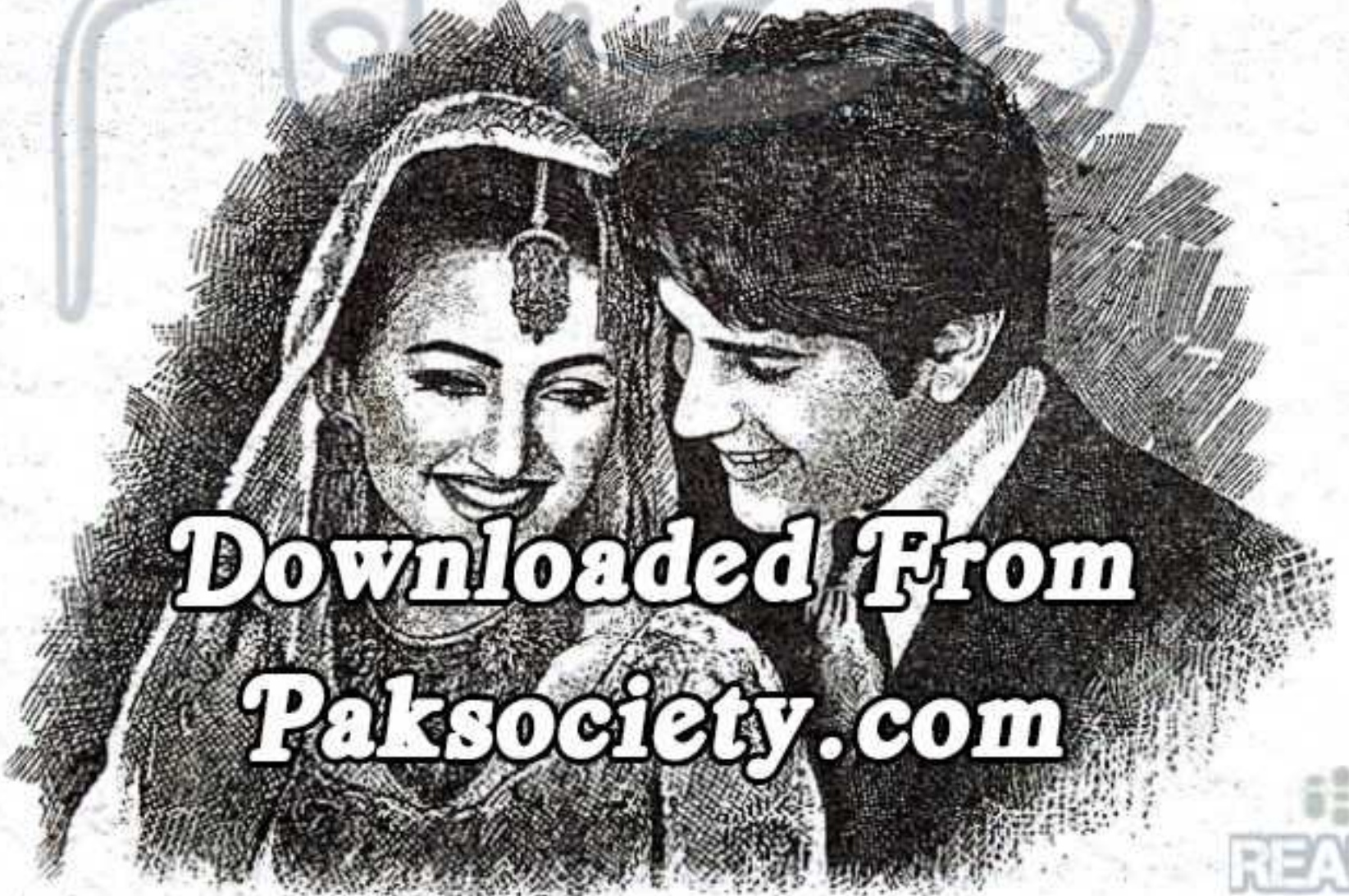
گزارا ٹیوشن سے ہو گیا تھا۔ الوینہ نے آشی کی بہت خوشامدیں کی وہ اسے ستار بجانے سکھا دے لیکن دو تین کوششوں کے بعد آشی نے صاف کہہ دیا وہ ستار بجانا نہیں سکھا سکتا۔

اب الوینہ کے لیے یہ انا کا سوال بن گیا تھا۔ مگر مجبوری یہ تھی کہ ستار بھی آشی کا تھا جسے وہ جان سے لگا کر رکھتا تھا۔ ویسے تو آشی ایک کول ملٹری اکیڈمی ٹریننگ کورس مکمل کر رہا تھا لیکن آج کل چھٹیوں میں آیا ہوا تھا۔

الوینہ بھی تاک میں لگی رہتی تھی اور آج اسے موقع مل گیا تھا۔

امی بھی اپنی کسی سہیلی سے ملنے گئی ہوئی تھیں اور آشی بھی باہر گیا ہوا تھا۔ ابو سے زیادہ خطرہ نہیں تھا۔ وہ زیادہ تر اپنی اسٹڈی میں کتابوں میں گم رہتے تھے۔ یوں بھی انہیں الوینہ کی کسی بات پر اعتراض نہیں ہوتا تھا اگر وہ اسے ستار بجاتے دیکھ لیتے تو کوئی حرج نہیں تھا وہ تو امی ہی تھیں جو چوبیس گھنٹے 440 والٹ کا خطرہ بنی رہتی تھیں۔

آج امی گھر پر نہیں تھیں مگر مشکل یہ تھی کہ وہ رات کے کھانے کی پوری ذمہ داری اس پر ڈال گئی تھیں۔ باورچن موجود تھی مگر ان کا حکم تھا کہ ایف اے کے امتحان کے بعد اسے امور خانہ داری میں ماہر ہونا چاہیے۔ اور امی کا ہر حکم نادر شاہی ہوتا ہے۔

بابا اس میں اختلاف کرنے کے عادی نہیں تھے۔ اس نے ملازمہ کے ساتھ مل کر رات کا کھانا تیار کیا اور کھانے کی میز سجا کر فارغ ہو گئی۔

امی نو بجے تک آنے کا کہہ کر گئی تھیں۔ ابھی ساڑھے سات بجے تھے چنانچہ اس کے پاس ڈیڑھ گھنٹہ تھا۔ ملازمہ کے ساتھ مل کر وہ ستار پچھلے لان میں لے آئی۔ اسے امی کو یہ بات نہ بتانے کے لیے اسے اپنے جیب خرچ سے کچھ رشوت بھی دینی پڑی۔ عالی بھیا کا کمرہ اس کے کمرے کے ساتھ ہی تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ پڑھائی کے دوران ڈسٹرب ہوں۔ گو پاپا کی طرح عالی بھیا بھی بے ضرر تھے۔

اپنی پسندیدہ جگہ چھوٹے سے تالاب کے پاس سفید گلابوں کے کنج کے پاس بیٹھ کر اس نے بڑے اسٹائل سے ستار اپنے کندھے سے ٹکا کر بجانا چاہا۔

ابھی اس نے ستار کے تاروں پر انگلیاں پھیری ہی تھیں کہ اسے پیچھے سے 'ہاؤ' کی آواز آئی۔ دل امی کے ڈر سے پہلے ہی سہما ہوا تھا۔ الوینہ ستار زمین پر پٹخ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ ستار کے تار زور سے جھنجھائے اور خاموش ہو گئے۔ وہ اندر دوڑ لگانے والی تھی کہ آشی کے قہقہے نے اسے آپے سے باہر کر دیا۔

''آشی کے بچے......''

وہ دانت کچکچا کر اور مکا تان کر آگے بڑھی۔ آشی کمال پھرتی سے ایک طرف ہو گیا اور الوینہ اپنی جھونک سے آگے نکل گئی۔

آشی کے سامنے ستار کی چوری پکڑے جانے پر شرمندگی کا احساس۔ ان سب باتوں نے مل کر الوینہ کو بری طرح بوکھلا دیا اور وہ وہیں گھاس پر بیٹھ کر زار و قطار رونے لگی۔

آشی نے اس کا آنچل کانٹوں سے چھڑایا اور اس کے پاس آ بیٹھا۔

''چپ ہو جاؤ وینی...... چپ ہو جاؤ۔'' وہ خوشامد سے کہہ رہا تھا۔ الوینہ کی امی کے آنے کا وقت ہو گیا تھا اگر وہ اس وقت ان دونوں کو اور خاص طور پر الوینہ کو لان میں دیکھ لیتیں تو کچھ بھی

ہوسکتا تھا۔ لیکن الوینہ کو آنے والے خطرے کا احساس نہیں تھا۔ وہ پوری شدومد کے ساتھ رونے میں مصروف تھی۔ آخر آشی کو غصہ آ گیا۔

''واہ بھئی...... اچھی رہی۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ ایک تو میرا ستار چوری سے یہاں اٹھا لائیں وہ بھی میری اجازت کے بغیر۔ اوپر سے یہ رونا دھونا مچا رکھا ہے۔''

''میں کوئی چوری وری سے نہیں لائی اور مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تمہیں پورے دوسو اڑتالیس روپے دیے تھے اس ستار کے لیے۔ بڑے آئے ستار والے۔''

الوینہ نے بات ختم کی اور دوبارہ اسی رفتار سے رونا شروع کر دیا۔

اچھا بابا تمہارا ہی ستار ہے۔ آشی کو ٹھنڈا ہونا پڑا۔ الوینہ کسی بھی وقت ان دوسو اڑتالیس روپے کا مطالبہ کر سکتی تھی اور اس کی جیب میں فالتو ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔

''میں تمہیں ایک خوشخبری سنانے آیا تھا۔ نہیں سنتی تو نہ سنو۔ میں تو جا رہا ہوں۔ تم بیٹھی رہو یہیں......'' الوینہ کے رونے کو بریک لگ گئے۔

''کیسی خوشخبری......'' اس نے دوپٹے کے پلو سے ناک اور آنکھیں پونچھیں۔

''وہ شعیب بھائی آ رہے ہیں......''

'' میرے لیے یہ کوئی خوشخبری نہیں ہے۔'' الوینہ نے منہ بسور کر کہا۔

سوائے اس کے کہ میرے کام اور امی کی ڈانٹ پھٹکار میں اضافہ ہو جائے گا اور کچھ نہیں۔

کافی دن سے شعیب بھائی کے آنے کا گھر میں تذکرہ ہو رہا تھا جو کہ الوینہ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ لیکن نہ الوینہ نے کافی عرصے سے انہیں دیکھا تھا اور نہ ہی ان سے دلچسپی تھی۔ سنا تھا وہ اپنے بزنس کی ایک اور شاخ کھولنے لاہور آ رہے ہیں ان کا قیام طویل بھی ہوسکتا تھا۔ یہ بھی سنا تھا کہ وہ ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتے ہیں مگر الوینہ کی امی کے اصرار پر ان کے گھر رہنے پر راضی ہوئے تھے الوینہ کو بھلا ان سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔

''سنا ہے بہت ہینڈسم ہیں بلکہ میں نے تو ان کی تصویر بھی دیکھ لی ہے۔ دیکھو گی تو دنگ رہ جاؤ گی۔

''مجھے کیا......'' الوینہ نے شانے جھٹکے۔

''اور میں کیا تمہاری طرح ہوں ہر وقت لڑکیوں کو تاکتے رہتے ہو۔

الوینہ بھلا آشی سے انتقام لینے کا موقعہ ہاتھ سے کیسے جانے دے سکتی تھی۔ اچھا بھلا ستایا تھا اس نے بے چاری کو۔

''میں......لڑکیوں کو تاکتا ہوں۔ کس نے کہا تم سے......؟'' آشی ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''وہ جو سامنے والی نیلو کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتے ہو۔'' الوینہ نے یونہی ہوا میں تیر چلایا۔

''ارے ہاں......'' آشی نے زور سے سر ہلایا۔

''یار اس سے دوستی تو کرواؤ شاید کچھ بات بن جائے۔ ورنہ جب تک یہاں سے تم دفعان نہیں ہوگی۔ اپنے لیے کوئی چانس نہیں ہے۔ اوپر سے وہ بقراط بھی یہاں موجود ہیں۔'' وہ عالی بھیا کو اسی نام سے پکارا کرتا تھا۔

''دوستی کرنی ہے تو مجھ سے کر لو۔ نیلو کے مقابلے میں تو بہت اچھی ہوں۔''

الوینہ کی رگ شرارت پھڑک اٹھی۔ اس نے دایاں ہاتھ آشی کی طرف بڑھایا۔

آشی نے جو مزے سے گھاس پر پاؤں پسارے بیٹھا تھا ایکدم سیدھا ہو بیٹھا۔

دوستی اور تم سے۔ممانی جان جو مثال دیتی ہیں کہ آگ کو پکڑو۔اس کو نہ پکڑو۔وہ تم پر صادق آتی ہے مجھے کوئی شوق نہیں آگ سے کھیلنے کا۔"

"نہیں تو نہ سہی......" الوینہ کو بھی غصہ آ گیا۔"شکل دیکھی ہے اپنی۔"

"ہاں دیکھی ہے۔تمہارے شعیب صاحب سے تو اچھی ہے۔مقابلہ کر لینا۔"

آشی نے مسکرا کر کہا۔

"جہنم میں جاؤ...... اب بات کرنا مجھ سے۔"الوینہ روٹھ کر چل دی۔

اسے شعیب بھائی کے نام سے ویسے ہی چڑ تھی۔

"تم بھی ساتھ چلو نا اکیلے وہاں دل نہیں لگے گا۔آشی نے پیچھے سے ہانک لگائی الوینہ کے جانے کے بعد آشی نے ہاتھ بڑھا کر ستار کو قریب کیا۔تاروں کو انگلیوں سے چھوا اور عجیب بے ہنگم سی آواز آئی۔

"تو تار سچ مچ ٹوٹ گئے۔اس نے آہستہ سے کہا اور گھاس پر لیٹ کر شروع کی تاریخوں کے مدہم سے چاند پر نظریں جما دیں۔اگر اس وقت کوئی وہاں ہوتا تو اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو دیکھ سکتا تھا۔

الوینہ کے والد واپڈا کے ڈائیریکٹر کے عہدے سے دو تین سال پہلے ہی ریٹائر ہوئے تھے۔

کم بچے خوشحال گھرانے کے تحت ابھی تک تو زندگی خوشحال ہی گزری تھی۔ لیکن ساری عمر دیانت داری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔اس لیے ریٹائرمنٹ کے ساتھ ہی مسئلے کھڑے ہو گئے۔

بہن بھائیوں کی ذمہ داریاں نمٹاتے شادی کو بھی دیر ہو گئی تھی۔ بیٹا بھی ابھی تعلیم سے فارغ نہیں ہوا تھا اور الوینہ نے تو ابھی ایف ہی کیا تھا۔ کافی وسیع اور خوبصورت گھر والد کو کلیم میں مل گیا تھا۔

ابھی تک تو ان کے پاس ہی تھا مگر ظاہر ہے اس میں بہن بیٹیوں کا بھی حصہ تھا اوپر کا حصہ کرائے پر چڑھا دیا تھا مگر اچھے کرایہ دار کی تلاش کے چکر میں کرایہ بھی کافی کم کرنا پڑا تھا۔

الوینہ کی امی یوں تو اعتدال پسند خاتون تھیں۔میاں کے بڑے عہدے تک پہنچتے پہنچتے زندگی بہت سے نشیب و فراز دیکھ لیے تھے۔ الوینہ کے ابو طبیعتاً نرم مزاج کے مالک تھے۔

ان پر بیوی کا رعب بہت زیادہ تھا۔ایک تو ویسے ہی تنک مزاج تھیں اور تھیں بھی نسبتاً اونچے اور امیر خاندان سے۔زندگی بھر من مانی کرنے کی وجہ سے مزاج میں رعونیت آ گئی تھی۔شادی کے بعد انہیں صرف ایک بات اپنی منشا کے خلاف برداشت کرنا پڑی تھی اور وہ یہ تھی آشی کی ذمہ داری۔

آشی الوینہ کی اکلوتی پھپھو کا بیٹا تھا۔اس کے والدین چند ہفتوں کے وقفے سے دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔پھوپھو کے سسرال میں کوئی ایسا عزیز نہ تھا کہ پانچ سالہ آشی کی ذمہ داری قبول کرتا لہٰذا بڑے ماموں ہونے کے ناطے احسن صاحب پر یہ بار آ پڑا۔احسن صاحب کو اپنا یہ بھانجا بہت عزیز تھا لیکن بیگم کو یہ بوجھ بہت ناگوار گزرا تھا لیکن کچھ نہ کہہ سکیں کیونکہ زندگی میں پہلی اور آخری بار ان کے شوہر نے کوئی فیصلہ حتمی طور پر کیا تھا۔

عمر کے اس دور میں اپنے لیے تو دل میں کوئی ارمان نہیں تھا لیکن عام ماؤں کی طرح بیٹی کے

لیے ایک بہت خوشحال اور پرتعیش زندگی کے خواب دیکھا کرتی تھیں۔ ان کی بڑی بہن کے میاں بزنس مین تھے پہلے وہ سعودی عرب میں رہے پھر پاکستان آ کر کاروبار شروع کیا اور خوب ترقی کی قابل بیٹے کی مدد سے تقریباً پورے پاکستان میں کاروبار پھیلا چکے تھے اور اب کاروباری ضروریات کے تحت لاہور میں ایک اور شاخ کھولنا چاہتے تھے۔ جب سے انہوں نے سنا تھا کہ ان کا ہونہار بھانجہ لاہور آ رہا ہے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کے سنہرے مستقبل کے خواب بننا شروع کر دیے تھے۔

عالی بھیا جن کا پورا نام عالیشان تھا۔ ایم بی بی ایس کے فائنل ایئر میں تھے۔ ایک تو وہ ویسے ہی الوینہ سے پانچ چھ سال بڑے تھے، پھر انہیں بزرگ بننے کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔

پڑھائی کی وجہ سے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں الوینہ کی اپنے سے تین سال بڑے آشی سے بہت جلد دوستی ہوگئی لیکن لڑائی بھی بہت ہوتی تھی۔

آشی بظاہر کھلنڈرا اور لاابالی تھا۔ کھیلوں میں ہمیشہ اول آتا لیکن پڑھائی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ دیکھنے میں کھلنڈرا اور لاپرواہ ہونے کے باوجود شاید والدین کا سایہ سر پر نہ رہنے کی وجہ سے اور کچھ رازیہ بیگم کے سرد اور خشک رویے کی وجہ سے بہت زیادہ حساس ہوگیا تھا۔ اسے شدت سے احساس تھا کہ وہ اپنے ماموں کے معاشی مسائلوں میں اضافے کا باعث ہے۔ اسی لیے وہ جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔

احسن صاحب کو یاد نہیں تھا کہ کبھی اس نے کوئی فرمائش کی ہو۔ کوئی چیز مل گئی تو خوش ورنہ نہ سہی۔ اور میٹرک کے بعد تو وہ اپنی بیشتر ضروریات اپنی ٹیوشنز سے پوری کرتا تھا۔ احسن صاحب بھی اس معاملے میں زیادہ دخل اندازی نہیں کرتے تھے ایک تو عالیشان کی سیلف فنانسنگ میڈیکل کی تعلیم کی وجہ سے ان پر کافی بوجھ تھا۔ پھر وہ اسے حتی الامکان خودمختار رہنے دینا چاہتے تھے۔ وہ اس کی خوددار طبیعت سے واقف تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ اسے کسی ایسی بات پر مجبور کریں جو اس کی فطرت کے خلاف ہو۔ اس نے تو اپنے ماموں کو یہ بھی معلوم ہونے نہیں دیا تھا کہ ڈاکٹر بن کر آرمی جوائن کرنا وہ واحد خواب تھا جو وہ بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔

والدین کی محرومی اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے اس نے اس خواب کو اپنی آنکھوں سے نوچ پھینکا تھا حالانکہ وہ ایف ایس سی میڈیکل کے میرٹ پر آ گیا تھا۔ اس نے کسی کو بتائے بغیر فوج میں کمیشن کے لیے درخواست بھیجی۔ لیکن ٹائیفائڈ ہو جانے کی وجہ سے وہ آئی ایس ایس بی کے ٹیسٹ کلیر نہ کر سکا۔ اب بی ایس سی کے بعد اس نے پھر کوشش کی اور کامیاب ہوگیا۔

احسن صاحب اپنی بیگم کے مزاج سے واقف تھے جو آشی کو بادل نخواستہ برداشت کرتی تھیں آشی کو بھی اس بات کا ادراک تھا اور وہ اپنے حوالے سے اپنے شفیق ماموں کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ احسن صاحب کو اپنا یہ بظاہر کھلنڈرا، ہنسوڑ لیکن انتہائی خوددار حساس اور ذمہ دار بھانجہ بے حد عزیز تھا اور دل کے کسی گوشے میں یہ تمنا چھپی ہوئی تھی کہ وہ اپنی اکلوتی اور پیاری بہن کے ہونہار بیٹے کو اپنا داماد بنا سکیں، لیکن فی الحال وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ رازیہ بیگم الوینہ کے لیے بہت اونچے خواب دیکھ رہی ہیں اپنے محدود وسائل کی وجہ سے وہ آشی کو

ایسا تابناک مستقبل نہیں دے سکتے تھے جو ان کی توقعات پر پورا اتر سکے۔ اور اب تو شعیب کو دیکھ کر یہ آرزو دل کے کسی گہرے گوشے میں جا چھپی تھی کہ بہرحال ہر باپ اپنی بیٹی کے لیے زیادہ شاندار اور خوشحال کل کا متمنی ہوتا ہے۔

آج کل الوینہ کی شامت آئی ہوئی تھی۔ اور یہ شامت تو اسی دن سے شروع ہو گئی تھی جب رازیہ بیگم کو پتا چلا تھا کہ شعیب لاہور آنے والے ہیں۔ انہوں نے تقریباً سارے گھر کی ترتیب بدل ڈالی تھی اور زیادہ تر کام الوینہ کو ہی کرنا پڑا تھا ان کی خواہش تھی کہ شعیب کے سامنے الوینہ کے کمال خانہ داری کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کر سکیں۔ امی سے زیادہ وہ آشی سے عاجز تھی جو اسے بات بے بات شعیب بھائی کے نام سے چھیڑتا تھا۔ حالانکہ اسے ان سے رتی بھر بھی دلچسپی نہیں تھی۔

ایک تو اس نے انہیں دیکھا ہی کہاں تھا۔ وہ پہلے تعلیم اور پھر کاروبار کے سلسلے میں ملک سے باہر رہے تھے دوسرے الوینہ کو فی الحال اپنی تعلیم اور اپنے مشاغل سے فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ کسی اور کے بارے میں سوچے۔ اس کی دنیا تو بس گھر، کالج اور سہیلیوں تک محدود تھی۔ ایم اے کرنا اس کا خواب تھا۔ امی کی عائد کردہ پابندیوں میں ایک یہ بھی تھی کہ اسے زیادہ سہیلیوں کے گھر جانے اور انہیں گھر بلانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے کالج میں سہیلیوں کے علاوہ اس کی دوستی بس آشی سے ہی تھی۔ اور یہ دوستی بھی زیادہ دیر برقرار نہیں رہتی تھی آشی اسے تنگ کرنے سے باز نہیں آتا تھا اور وہ اس سے لڑ بیٹھتی تھی لیکن زیادہ دیر ناراض بھی نہیں رہ سکتی تھی۔

آخر کار وہ دن آ گیا جب شعیب بھائی کو لاہور پہنچنا تھا رازیہ بیگم کی گھبراہٹیں عروج پر تھیں آشی کو جہاز کی آمد سے تین گھنٹے پہلے ایئرپورٹ روانہ کر دیا گیا تھا۔ عالی بھیا نے تو پڑھائی کی مصروفیات کی وجہ سے معذرت کر لی تھی۔ اس وقت الوینہ کو عالی بھیا پر بے تحاشا رشک آیا تھا اور اپنی نالائقی پر غصہ بھی کہ اس نے اگر سولہ سال کی بجائے چودہ سال کی عمر میں میٹرک کر لیا ہوتا تو آج وہ بھی میڈیکل کی طالبہ ہوتی اور عالی بھیا کی طرح پڑھائی کا بہانہ بنا کر امی سے نادر شاہی احکامات سے بچ سکتی جو صبح سے بارش کی طرح بلکہ اولوں کی طرح اس پر تواتر سے برس رہے تھے۔

بہرحال امی کی ہدایات کے مطابق نو بجے یعنی شعیب بھائی کی متوقع آمد سے دو گھنٹے قبل انتہائی پرتکلف ناشتہ اور بے شمار ڈشز پر مشتمل کھانا تیار ہو چکا تھا انہیں اندازہ نہیں تھا کہ لاڈلا بھانجہ آتے ہی ناشتہ کرے گا یا کھانا، لہٰذا دونوں طرح کی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کا پورا انتظام ہو چکا تھا۔ گیٹ سے لے کر باورچی خانے تک پورا گھر جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ اور اب امی الوینہ کے سر پر کھڑی تھیں کہ وہ غسل کر کے جلد از جلد تیار ہو جائے۔

''امی مجھے تیار ہو کر کیا کرنا ہے شعیب بھائی کھانا کھا کر یا تو آرام کریں گے یا آپ لوگوں سے باتیں بھلا میں وہاں بیچ پر بیٹھ کر کیا کروں گی۔'' الوینہ نے لاپرواہی سے کہا اور رازیہ بیگم نے سر پیٹ لیا۔

اب وہ اس بے عقل لڑکی کو کیسے سمجھاتیں کہ پچھلے پندرہ دنوں سے جو انہوں نے سارے گھر کو تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے تو اس کا اصل معمع تو وہی ہے پہلے تو انہوں نے اسے کوئی وجہ بتائے بغیر چند صلواتیں سنائیں اور پھر عرق گلاب، ملائی، ابٹن

اور نہ جانے کیا کیا دے کر اسے واش روم کی طرف دھکیل دیا۔ وہاں تک تو الوینہ انتہائی سعادت مندی سے پہنچ گئی لیکن دروازہ بند کرتے ہی اس نے امی کے تمام اہتمام کو ڈسٹ بن کی نذر کیا اور پھر سیدھے سادے طریقے سے تیار ہو کر باہر آ گئی۔

امی کے دیے ہوئے شوخ نارنجی جارجٹ کے سوٹ کے بجائے پنک کڑھائی والا سفید کاٹن کا سوٹ پہنا، آنکھوں میں ہلکا ہلکا کاجل لگایا اور گیلے گھنے بالوں کو پشت پر پھیلا کر صوفے پر دراز ہوگئی اور اطمینان سے وہ کتاب پڑھنے لگی جو امی کی لائی ہوئی 'قیامت' سے پہلے پڑھنا شروع کی تھی۔ اور پھر پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ابھی وہ چند سطور ہی پڑھ پائی تھی کہ آشی زلزلے کی صورت میں کمرے میں وارد ہوا۔ الوینہ نے اسے کوئی اہمیت نہ دی کیونکہ تھوڑی دیر پہلے وہ قیامت سے نمٹ چکی تھی اور زلزلہ ہر صورت قیامت سے زیادہ ہولناک نہیں ہوسکتا۔ ارے وینی کی بچی تم یہاں بیٹھی ہو۔ میں نے تمہیں سارے گھر میں ڈھونڈ لیا۔'' الوینہ نے شان بے نیازی سے اس کی طرف دیکھا۔

''مثلاً کہاں ...... کہاں مجھے تمہارے خیال میں اس وقت اپنے کمرے کے سوا اور کہاں ہونا چاہیے تھا؟'' اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

''میرے خیال کے مطابق تمہیں اس وقت، جہنم میں ہونا چاہیے تھا۔ آشی دانت پیس کر بولا۔

''لیکن وہاں تو تمہارے بغیر نہیں جا سکتی۔'' الوینہ نے گویا اپنا بدلہ لے لیا۔

''چلو اٹھو ممانی جان بلا رہی ہیں۔ شعیب بھائی آ گئے ہیں اور تم یہاں بیٹھی ہو۔ تمہیں کم از کم اس وقت ڈرائنگ روم میں ہونا چاہیے تھا بے وقوف لڑکی۔''

آشی نے الوینہ کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔

''آشی کے بچے چھوڑو میرا ہاتھ۔ ہائے اللہ میرا ہاتھ ٹوٹ جائے گا۔''

''چلاتی رہو۔ مگر ڈرائنگ روم کے پاس جا کر خاموش ہو جانا۔ ورنہ تمہاری یہ دل دوز چیخیں سن کر شعیب بھائی واپس روانہ ہو جائیں گے انہیں جہاز کے پہیوں سے ہی کیوں نہ لپٹ جانا پڑے۔''

اور الوینہ کو واقعی چپ ہونا پڑا کیونکہ سامنے ہی امی غیظ وغضب کا نمونہ بنی کھڑی تھیں۔

اس کی ایک وجہ تو اس کا غائب ہو جانا تھا جبکہ اسے شعیب کے استقبال کے لیے کم از کم ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہونا چاہیے تھا۔ دوسری وجہ کاٹن کا وہ سادا سا سوٹ تھا۔ حالانکہ وہ نارنجی سوٹ انہوں نے خاص طور سے آج کے لیے بنوایا تھا۔ الوینہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ تیزی سے ڈرائنگ تک کا فاصلہ طے کیا اور امی کے کچھ کہنے سے پہلے اندر داخل ہوگئی۔

''السلام وعلیکم۔'' اس کی مترنم آواز سن کر شعیب بھائی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور احتراماً کھڑے ہوگئے۔ رسماً حال چال پوچھا اور دوبارہ عالی بھیا کی طرف متوجہ ہوگئے۔

مگر رازیہ بیگم کی تجربہ کار اور باریک بین نظروں نے ان چند لمحوں میں ان کی آنکھوں میں الوینہ کے لیے پسندیدگی کی جھلک دیکھ لی تھی۔

صبح صادق کا وقت تھا۔ ستارے آنکھیں جھپک جھپک کر اپنی مدہم ہوتی ہوئی روشنی میں اپنی رخصتی کا اعلان کر رہے تھے۔ آشی اپنے جانے کی

تیاریوں میں مصروف تھا سے چھٹیوں کے بعد کاکول اکیڈمی کے لیے دوبارہ روانہ ہونا تھا۔ اس نے رات کو کھانے کی میز پر ماموں اور ممانی جان سے جانے کی اجازت لے لی تھی۔ نماز کے بعد وہ تیار ہو کر صوفے پر بیٹھا جوتوں کے تسمے باندھ رہا تھا کہ الوینہ چائے کی ٹرے لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ آشی اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ ساتھ ہی اس کی رگ شرارت پھڑک اٹھی۔ ''وینی تم......! اتنی صبح صبح چائے بنا ڈالی۔ اچھا اچھا پریکٹس کر رہی ہو۔ مگر شعیب بھائی تو دس بجے سے پہلے نہیں اٹھتے۔ تم بلاوجہ......''

اسے فوراً رک جانا پڑا۔ کیونکہ الوینہ کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔ جو نہ جانے کس خیال سے بھر آئے تھے۔ آشی بوکھلا کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کہے۔ الوینہ نے منہ پھیر کر دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے اور آگے بڑھ کر ٹرے میز پر رکھ دی۔

''تم نے ناحق تکلیف کی......'' وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

''بڑے پر تکلف بن رہے ہو۔ زیادہ نخرے دکھانے کی ضرورت نہیں جیسے میں جانتی نہیں کہ نہ تو تم ریلوے اسٹیشنوں کی چائے پسند کرتے ہو اور نہ ہی بازار کا کھانا۔'' الوینہ نے پلیٹ میں رکھے سینڈوچز اس کی طرف بڑھائے اور پیالی میں چائے بنانے لگی۔ آشی نے اس کی طرف دیکھا۔

سیاہ دوپٹے کے حلقے میں اس کا گلابی چہرہ دمک رہا تھا آنکھوں میں نیند کا خمار تھا اور دراز پلکوں کا سایہ گالوں پر پڑ رہا تھا۔ الوینہ نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھائی تو آشی اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر کھڑکی میں ڈوبتے ہوئے زرد چاند کو دیکھنے لگا۔

''وینی تم میری عادتیں خراب کر دو گی۔ تم تو پیا دیس سدھار جاؤ گی اور میں بس تمہیں یاد کرتا رہ جاؤں گا۔ آشی کے ہونٹوں سے بے اختیار جملہ نکل گیا۔

''اتنی دور کی باتیں کیوں سوچتے ہو آشی۔ یہ جو پل ہے یہ تو ہمارا ہے۔ اس کے بعد کیا ہو گا دیکھا جائے گا۔ الوینہ نے بھیگی آنکھوں سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''بڑی عقلمند ہو گئی ہو۔'' آشی نے طویل سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''آخر میری اتنے دنوں کی محبت کا اثر تم پر ہو گی گیا۔ ویسے خاصی دیر کر دی تم نے۔ خیر دیر آید درست آید۔

آشی نے چائے کی خالی پیالی ٹرے میں رکھی اور اپنا سفری بیگ کاندھے میں ڈال کر دروازے طرف چل پڑا۔ اچھا وینی خدا حافظ خوش رہنا اور میرے لیے بھی دعا کرنا۔'' الوینہ اس کے پیچھے پیچھے برآمدے تک چلی آئی۔ آشی نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ گم صم سی کھڑی تھی۔ آشی نے نرمی سے الوینہ کے ہاتھ کو چھوا۔ اور تیز تیز قدموں سے گیٹ سے نکل گیا۔

کچھ دور جا کر اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو رگڑا اور دو آنسو آنکھوں سے نکل کر مٹی میں جذب ہو گئے۔

آشی کو کاکول گئے کئی مہینے ہو گئے تھے اس کی عدم موجودگی میں الوینہ ایکدم اداس ہو جاتی تھی اور یہ بات تھی کہ آشی کی موجودگی میں صلح چند منٹ سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن یہ لڑائی بھی دوستی کی طرح پائیدار نہیں ہوتی تھی۔ بس اسے آشی کی عادت ہو گئی تھی۔ اس کے بغیر گھر اجنبی سا

لگتا تھا۔ کئی دن چھائی اداسی اور بوریت دور کرنے کا بس یہی ایک طریقہ تھا کہ وہ گھر کی تفصیلی صفائی شروع کر دے۔ وہ آخر میں آشی کے کمرے میں داخل ہوئی۔

آشی کی عادت تھی کہ وہ نوکرانی کو کمرے کی صفائی کی اجازت کم ہی دیتا تھا وہ اپنا ہر کام خود کرنے کا عادی تھا۔ وہ تو الوینہ کو بھی اپنا کام نہیں کرنے دیتا تھا۔ ہاں اس کی غیر موجودگی میں الوینہ کا کمرہ باقاعدگی سے صاف کر دیا کرتی تھی۔ کمرہ صاف کرنے کے بعد وہ واپسی کے لیے مڑی ہی تھی کہ اس کے بڑے سے دوپٹہ کا آنچل سائیڈ ٹیبل پر رکھی آشی کی تصویر سے ٹکرایا۔ تصویر آنچل سے الجھ کر گری اور شیشہ کرچی کرچی ہوگیا۔

یہ تصویر الوینہ نے ہی آشی کی گزشتہ سال گرہ پر دی تھی جو اس نے اس کی بے خبری میں خود ہی کھینچی تھی۔ الوینہ کا دل عجیب وسوسوں سے بھر گیا۔ امی کہتی تھیں کہ شیشے کا ٹوٹنا اچھا شگون نہیں ہوتا۔ تمام حالات میں شاید وہ پروانہ کرتی لیکن آشی کی اتنی طویل غیر حاضری نے اسے پہلے ہی اداس کر دیا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر نیچے بیٹھ کر شیشے کی کرچیاں اٹھانے لگی۔ اچانک دھڑ سے دروازہ کھلا توجہ ہٹ جانے کی وجہ سے ایک کرچی اس کے ہاتھ میں چبھ گئی۔ اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ آشی نے اسے دیکھتے ہی زوردار سیلوٹ مارا۔

''اوہو بڑے اکڑ رہے ہو۔ کیا بات ہے......؟'' الوینہ نے اپنی خوشی چھپا کر کہا۔ وہ اسے اچانک اپنے سامنے پا کر بے حد مسرور ہوگئی تھی۔

''سیکنڈ لیفٹیننٹ اشعر کامران سر۔ آشی نے ایک بار پھر خالص فوجی انداز میں ایڑیاں بجائیں وہ فوجی یونی فارم میں اتنا ہینڈسم اور شاندار لگ رہا تھا کہ وہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ اچانک آشی کی نظر اس کی انگلی پر پڑی۔ اس کی انگلی سے کافی تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔

''ارے تمہارا ہاتھ کیسے زخمی ہوگیا۔ یار بہت ہی بے وقوف لڑکی ہو۔ کس نے کہا تھا زمین سے شیشہ اٹھانے کو۔ چلو اٹھو فوراً میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے خوشی راس ہی نہیں آتی۔'' وہ بری طرح گھبرا گیا تھا۔

''ارے آشی کچھ بھی نہیں ہوا ذرا سا شیشہ لگ گیا ہے۔ تم بس کس کر پٹی باندھ دو ابھی خون بند ہو جائے گا۔ آشی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے بڑی بہادر ہوگئی ہو۔'' آشی جانتا تھا کہ وہ کتنی ڈرپوک تھی۔ انجیکشن سے اس کی جان نکلتی تھی۔ ذرا سی چوٹ لگ جائے تو سارا گھر سر پر اٹھا لیتی تھی اور آشی اس کا بے تحاشہ مذاق اڑایا کرتا تھا۔ لیکن آشی کی اپنے لیے پریشانی دکھ کر وہ ساری تکلیف بھول گئی تھی آشی نے دوا لگا کر اس کی انگلی پر کس کر پٹی باندھ دی۔

''جی جناب تو اب فرمایئے۔ آپ کی انگشت ناتواں شیشے سے کس خوشی میں بزد آزما ہوئی تھی......؟''

آشی کی اردو خطرناک حد تک اچھی تھی اور جب آشی محض اسے تنگ کرنے کے لیے مشکل مشکل لفظ بولتا تو اسے آشی پر بے حد غصہ آتا تھا لیکن اس وقت وہ یہ تفصیل جملہ کڑوے گھونٹ کی طرح پی گئی۔

وہ تمہاری تصویر کا شیشہ۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ آشی کہیں پھر نہ خفا ہو جائے لیکن نہ

جانے کیوں وہ اداس ہو گیا۔

''اوہو...... میری تصویر کا شیشہ ٹوٹ گیا......!'' خیر کوئی مضائقہ نہیں شاید اس بات کی علامت ہے لہ مجھے اب یہاں رہنا ہی نہیں۔'' آخری جملہ جیسے اس نے اپنے آپ سے کہا۔

''آشی......اب تو تم پاس آؤٹ ہو گئے ہو۔تمہاری پوسٹنگ کہاں ہوگی......؟'' اچانک الوینہ کو خیال آیا۔

ہاں وینی مجھے تین دن بعد کھاریاں جانا ہے۔

اس خیال سے کہ آشی پھر چلا جائے گا اس کا دل بیٹھ سا گیا۔

''تم پھر چلے جاؤ گے تو میں کیا کروں گی......؟''

''تم شکرانے کے نفل ادا کرنا کہ سر سے بلا ٹلی اور کیا۔

آشی نے اس کے سر پر چپت مار کر کہا۔

''ہاں یہ تو ہے......'' الوینہ نے سر ہلا کر کہا۔وہ بمشکل اپنے آنسو روک رہی تھی۔ پتا تھا کہ اگر آشی نے اس کے آنسو دیکھ لیے تو اتنا مذاق اڑائے گا کہ وہ یاد کرے۔

''مگر مجھے اس بلا کے بغیر جینے کی عادت نہیں ہے۔ میں اس بلا کے بغیر رہ نہیں سکتی نہیں رہ سکتی۔''

الوینہ کے ہاتھ سے اچانک ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور آشی ایک بار پھر بوکھلا اٹھا۔

''ارے...... ارے بدھو کہیں کی۔ بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے ارے ارے اللہ کے واسطے چپ ہو جاؤ۔اگر ممانی جان نے دیکھ لیا تو دونوں کی شامت آجائے گی۔کیا بتاؤ گی انہیں۔کس بات پر رو رہی تھیں......؟ آشی نے مدھواس ہو کر الوینہ کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

الوینہ کا رونا اچانک رک گیا۔واقعی کتنی عجیب وغریب صورت حال ہوتی اگر امی دیکھ لیتیں تو۔وہ یہ سوچ کر کانپ گئی لیکن آشی کا یہ جملہ بہت دنوں تک اس کے کانوں میں گونجتا رہا۔'' مجھے تو کوئی خوشی راس ہی نہیں ہے۔'' کیا واقعی وہ آشی کے لیے اتنی اہم تھی کہ اس کی ذرا سی تکلیف آشی کی خوشی برباد کر دیتی۔مگر کیا کبھی وہ دن آئے گا جب وہ اس کے سامنے سنجیدگی سے اس بات کا اعتراف کرے۔شاید کبھی نہیں۔

تھوڑی دیر بعد عالی بھیا آشی کو سینے سے لگائے کھڑے تھے اور پاس آؤٹ کی تقریب پر پہنچ نہ سکنے کی معذرت کر رہے تھے۔ماموں جان آنسو بھری آنکھیں لیے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کی کامیابی پر اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے۔آج تو ممانی جان نے بھی سرسری طور پر ہی سہی مگر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے مزید کامیابی کی دعا دی تھی۔آشی کو زندگی میں پہلی بار اتنی خوشی ملی تھی لیکن یہ تو وہ اپنے رب سے ہی کہہ سکتا تھا کہ پاس آؤٹ کی تقریب میں الوینہ کے نہ ہونے سے اس کی مسرت آدھی رہ گئی تھی۔

الوینہ اپنے کمرے میں بیٹھے آشی کی تصویر کا فریم بدل رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور اجازت ملنے پر اگلے ہی لمحے شعیب بھائی اندر چلے آئے شعیب بھائی کا کاروبار کے سلسلے میں اکثر لاہور آنا جانا لگا رہتا تھا آج کل بھی وہ آئے ہوئے تھے الوینہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔گھر میں کیا کھچڑی پک رہی تھی۔اس بات کا اسے کچھ کچھ اندازہ تو تھا مگر شعیب نے کبھی اشارتاً بھی اس خیال کی تائید نہیں کی تھی راز یہ بیگم کے ذہن میں تھا۔اس لیے اب شعیب بھائی سے کوئی بیر

نہیں رہا تھا۔ اس کے خیال میں امی کا یہ خیال یک طرفہ ہی تھا۔ ویسے بھی وہ بہت ہی خاموش اور سنجیدہ قسم کی شخصیت تھے ان سے بے تکلف ہونے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ گھر میں بھی بہت کم رہتے تھے۔ اس وقت انہیں اپنے کمرے میں دیکھ کر خاصی حیرت ہوئی۔

'الوینہ میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا......؟'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولے۔

''نہ ......نہیں......شعیب بھائی آپ آپ پلیز بیٹھیے نا۔'' اس نے اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پا کر کہا۔

شکریہ آپ اپنا کام جاری رکھیے۔ میں تو بس یونہی چلا آیا تھا۔ دراصل گھر میں اس وقت کوئی ہے ہی نہیں میں نے سوچا آپ سے ہی تھوڑی گپ شپ ہو جائے۔''

انہوں نے سرسری انداز میں کہا۔

''جی ضرور میں کوئی خاص کام نہیں کر رہی تھی۔ بس یونہی۔''

الوینہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان سے کیا بات کرے۔ ڈر بھی لگ رہا تھا کہ امی کے لاڈلے بھانجے کے سامنے کوئی گڑبڑ بات نکل گئی تو ان کے ہاتھوں اس کی وہ درگت بنے گی کہ یاد رہے اور اسے تو اتنے سنجیدہ لوگوں سے بات بھی نہیں کرنا آتی تھی۔ اسی لیے اس کی عالی بھیا سے بھی زیادہ دوستی نہیں تھی اور شعیب بھائی تو عالی بھیا سے بھی عمر میں دو تین سال بڑے ہی تھے۔ گھر میں اگر وہ کسی سے بے جھجک بات کر لیتی تھی تو وہ آشی کے علاوہ ابو تھے۔ مگر امی کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکیوں کو باپ سے زیادہ بے تکلف نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بے ادبی کہلاتی ہے۔ وہ ان کے سامنے آشی سے بھی زیادہ بات نہیں کرتی تھی مبادا انہیں ناگوار گزر جائے۔ لیکن آشی کے ساتھ اس کا رویہ سرد اور غیر جانبدارانہ تھا۔ اب آشی کے جانے کے بعد وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرتی تھی۔

وہ کچھ دیر انتظار کرتی رہی کہ شعیب بھائی خود ہی بات کا آغاز کریں گے اسے الجھن ہو رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ وہ جلدی سے اٹھ کر چلے جائیں تا کہ وہ آزادی سے سانس تو لے سکے۔ کیا خبر امی کو یہ بات بری لگ جائے کہ ان کے سامنے سانسیں کیوں زور سے لیں۔ وہ ان کی امی کے بہت زیادہ چہیتے ہونے پر شاکی تھی۔ آخر شعیب بھائی نے خود ہی بات شروع کی۔''

''آپ کو یہ کام کرتے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ مجھے بھی ایک تصویر فریم کروانی ہے۔ مگر فرصت ہی نہیں ملتی۔ ہاں یوں کہہ لیجیے کہ مجھے ایسے کاموں کا تجربہ نہیں ہے۔ دراصل خالہ جان کہہ رہی تھیں کہ انہیں اپنے کمرے میں میری تصویر لگانی ہے۔ تصویر تو میرے پاس ہے مگر فریم نہیں ہے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ان کے حکم کی تکمیل کیسے کروں۔''

وہ الجھے الجھے بول رہے تھے۔ وہ جل بھن کے سوچ رہی تھی۔ ''میری تصویر تو آج تک نہیں لگائی......اونہہ۔'' لیکن اسے شعیب بھائی کی پریشان سی شکل دیکھ کر ہنسی آ گئی کوئی بھید نہیں کہ امی نے یہ فرمائش اپنے مخصوص ہٹلرانہ انداز میں کی ہو۔

''تمہاری تصویر جلد از جلد میرے کمرے میں لگ جانی چاہیے۔ ورنہ۔''

اسے اپنی احمقانہ سوچ پر پھر ہنسی آ گئی۔ مگر وہ ان کے سامنے اپنی بے وقوفانہ بات پر ہنس بھی نہیں سکتی تھی۔ آخر شعیب بھائی کو جلد از جلد فارغ

کرنے کی ایک ہی ترکیب سمجھ میں آئی۔
''شعیب بھائی آپ اپنی تصویر مجھے دے دیں۔ میرے پاس ایک فریم ہے اگر آپ کی تصویر اس میں فٹ آجائے تو......''
شعیب بھائی کی پریشانی فوراً ہی دور ہوگئی۔
''بے حد شکریہ الوینہ۔ آپ نے تو میری مشکل آسان کر دی۔ درحقیقت فرصت ہی نہیں بازار جانے کی یہ بھی ڈر ہے کہ خالہ جان ناراض نہ ہو جائیں کہ ان کی اتنی سی فرمائش پوری نہیں کر سکا۔
الوینہ کو اپنا اندازہ درست ہونے پر ایک بار پھر ہنسی آگئی اور خوشی بھی ہوئی کہ اتنے لاڈلے ہونے کے باوجود وہ اپنی ڈکٹیٹر خالہ سے خوف زدہ تھے۔
تھوڑی ہی دیر میں شعیب بھائی نے ملازمہ کے ہاتھ تصویر بھجوا دی۔ بے خیالی میں الوینہ دونوں کا موازنہ کرنے لگی۔ دونوں ہی پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ شعیب بھائی تصویر میں بھی سنجیدہ اور پروقار نظر آرہے تھے جبکہ آشی کے ہونٹوں پر بڑی شریری مسکراہٹ تھی۔ شعیب بھائی تھری پیس سوٹ میں تھے جبکہ آشی جینز اور ٹی شرٹ میں ہونا اس کے لاابالی پن کو ظاہر کر رہا تھا۔
جب الوینہ نے امی کو بتایا کہ شعیب بھائی اس کے کمرے میں آئے تھے تو ان کے چہرے کی ہوائیاں اڑنے لگیں۔
''تم...... تم نے کوئی احمقانہ بات تو نہیں کی ان سے۔'' انہوں نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔
''ہائے اللہ امی...... میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں۔'' اس نے برا مان کر کہا۔
''ہاں...... ہاں کتنی عقلمند ہیں آپ مجھے اچھی طرح پتا ہے۔ خیر آئندہ خیال رکھنا۔'' اور الوینہ سر پیٹ کر رہ گئی۔ یعنی امی کو پکا یقین تھا کہ اس نے ضرور کوئی حماقت کی ہوگی۔
ڈوبتے سورج کی سرخیاں آتی سردیوں کی اس شام کو اداس مگر اور خوبصورت بنا رہی تھیں۔ الوینہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی بادلوں پر نظریں جمائے نہ جانے کس سوچ میں گم تھی۔ گود میں دھرے ہاتھوں پر پانی کے قطرے گرے تو اسے معلوم ہوا وہ رو رہی تھی وجہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھی۔ آنسو دوپٹے میں جذب کر کے وہ اس ڈر سے اٹھنے ہی والی تھی کہ امی اسے ڈھونڈ نہ رہی ہوں۔''
اچانک اس کے سر پر ہلکی سی چپت پڑی۔ اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور آشی اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے کتنی بار تصور میں یونہی دیکھا تھا وہ آج بھی اسے اپنا تصور سمجھ کر ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ دوسری چپت پر وہ ہوش میں آگئی اور اس کے منہ سے ایک بے ساختہ قسم کی چیخ نکل گئی۔
''خدا کے واسطے چپ ہو جاؤ وینی۔ گھر والے پریشان ہو جائیں گے تمہاری یہ زوردار چیخ سن کر۔
آشی بوکھلا اٹھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ الوینہ اسے دیکھ کر یوں خوشی سے بے حال ہو جائے گی۔ دل میں خوشی کا ایک عجیب سا احساس جاگا پھر ساتھ ہی تلخ حقیقت یاد آنے پر دل بجھ کر رہ گیا۔'' مجھے تو خوش ہونے کا حق نہیں ہے پروردگار۔ تو ہی بتا کہ مجھے گلہ کرنے کا حق ہے کہ نہیں تو ہی میرا واحد رازدان ہے میرے مالک۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا لیکن چہرے سے جذبات کو بالکل بھی آشکار نہ ہونے دیا۔
الوینہ اس کے شانے پر بیچ دیکھ کر سمجھ گئی تھی

کہ وہ سیکنڈ لیفٹیننٹ سے لیفٹیننٹ ہو گیا ہے۔

مری میں برف باری متوقع تھی۔ اسی دن شعیب کا اسلام آباد سے ٹیلی فون آ گیا وہ سب کو مری جانے کی دعوت دے رہے تھے۔ الوینہ کو تو ویسے ہی سیر سپاٹے کا سوق تھا مگر امی سے اجازت نہیں ملتی تھی جب اسے آشی ایبٹ آباد، کاکول اور دوسرے پہاڑی مقامات کے بارے میں بتاتا تو بے اختیار اس کا دل چاہتا کہ کاش وہ لڑکا ہوتی اور فوج میں جا سکتی۔

اور اسے شادی مرگ ہوتے ہوتے بچا جب اُسے پتہ چلا کہ امی نے اسے مری جانے کی اجازت دے دی ہے۔۔ اس سے بھی زیادہ حیرت اس بات کی تھی کہ عالی بھیا نے بھی مری جانے کے لیے تھوڑا سا وقت نکال لیا تھا آج کل وہ ہاؤس جاب کے ساتھ ساتھ کسی اور امتحان کی تیاری بھی کر رہے تھے۔ الوینہ کا خیال تھا کہ سب ہی مری جائیں گے مگر امی نے یہ کہ کر معذرت کر لی کہ وہ مری کی کی شدید سردی کو برداشت نہیں کر سکیں گی اور ابو کو ان کا ساتھ دینا پڑا۔

الوینہ ان کے انکار پر بدمزہ تو ہوئی لیکن آشی کے انکار پر بالکل ہی آؤٹ ہو گئی پہلے اس نے شور مچا کر غصہ اور ناراضگی دکھا کر آشی کو رضا مند کرنا چاہا۔ پھر سارے ہتھکنڈے بے کار دیکھ کر خوشامد پر اتر آئی مگر آشی ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کا ایک ہی عذر تھا کہ اسے نئی پوسٹنگ سے پہلے چند دن کی چھٹی ملی ہے اور وہ دن ماموں اور ممانی جان کے ساتھ گزارنا چاہتا ہے۔

''چند دن کی تو چھٹی ملی ہے پھر نہ جانے کب ملے اور میں یہ دن گھر سے باہر گزار دوں۔ no way اس نے حتمی طور پر کہہ دیا۔ اب یہ بات الوینہ کی انا کے خلاف تھی کہ وہ آشی کی وجہ سے جانے سے انکار کر دے۔۔ پھر امی کے سامنے انکار کی تاب تھی نہ مجال۔ ابھی تک باقاعدہ رشتے کی بات تو نہیں ہوئی تھی۔ یہ بات دونوں بہنوں کے درمیان ہی تھی کہ الوینہ اور شعیب کو ملنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنے چاہیں تا کہ وہ ایک دوسرے کو سمجھ لیں۔

الوینہ یوں بھی انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی کہ وہ ہر سال خود ہی تو فریاد کیا کرتی تھی کہ اسے برف باری دیکھنے مری جانے کا موقع نہیں ملتا۔ اب اس واویلے کی شنوائی ہوئی تھی تو دل خوش ہونے کے بجائے بجھ کر رہ گیا لیکن بہر حال جانا تو تھا۔

خزاں کا موسم اداس تھا بادل پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی تو آشی گھر آ کے سوچتا کہ چھٹی کے دن جلدی گزر جائیں گے وہ دل کے نہاں خانوں میں چھپے اس سوال کا جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہلکان ہو جاتا کہ یہ چند دن الوینہ کے بغیر گزارنے مشکل ہیں تو پوری زندگی کیسے گزرے گی۔

اور یہ تو اسے ہی معلوم تھا کہ کیڈٹ شپ کے دوران P.M.A کی خاموش راتیں ہوں یا ٹریننگ کے کٹھن اور جان لیوا مرحلے۔ الوینہ کا خیال تو ایک پل کے لیے بھی اس سے جدا نہیں ہوا تھا دن تو مصروفیات میں گزر جاتے تھے مگر کئی راتیں ایسی بھی آئی تھیں کہ آرام دہ کمرے کے خواب ناک ماحول میں ایک لمحے کو بھی نیند نہ آئی ہو اور وہ اس بے خوابی کی وجہ نہ جان سکا ہو۔

پھر جب آشی کے جانے میں ایک دن بچا تھا تو شیما آ گئی۔ وہ آشی اور الوینہ کی مشترکہ کزن تھی وہ میٹرک کی طالبہ تھی اور اس عمر کی لڑکیوں کی طرح شوخ، خوش باش اور بیحد باتونی لڑکی تھی۔

کہاں تو آشی تنہائی اور خاموشی سے اکتایا ہوا تھا کہاں اب وہ کونے کھدرے میں تلاش کرتا پھرتا۔ جہاں تھوڑی دیر خاموشی نصیب ہو جائے۔ شیما کے پاس باتوں کا ایک خزانہ تھا جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا تھا اور آشی کو اپنی یہ معصوم، بے فکر اور پر خلوص کزن بے حد پسند تھی۔
صبح اسے جہلم جانا تھا جہاں اس کی نئی پوسٹنگ ہوئی تھی۔ اور سر کا درد تھا کہ سر اٹھانے نہیں دے رہا تھا۔ سامان کی پیکنگ تو شیما نے کر دی تھی لیکن صبح تک اس کی طبیعت سنبھل جائے گی یہ امید نظر نہیں آ رہی تھی ایسے میں اس کا دل چاہا کہ الوینہ آ جائے جانے پھر کب اسے دیکھنا نصیب ہو مگر ہر دعا کب قبول ہوتی ہے۔
اچانک دروازہ کھلا اور شیما چائے کی ٹرے لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ آشی کے شکریے کے الفاظ کو اس نے قابل توجہ نہیں سمجھا اور جب آشی نے دل نہ چاہنے کی بنا پر چائے پینے سے انکار کیا تو اس نے زبردست ڈانٹ پلائی اور زبردستی اسے اٹھا کر چائے کی پیالی اور سینڈوچز اس کے سامنے رکھ دیے۔
شیما کی بچی تم بڑے بھائی کی شان میں گستاخی کی مرتکب ہو رہی ہو۔
آشی نے غرّ کر کہنا چاہا لیکن یہ ناکام غراہٹ ایک کراہ میں تبدیل ہو گئی کیوں کہ زور سے بولنے کی وجہ سے سر میں درد کی ایک ٹیس اٹھی تھی۔
''جب چھوٹی بہنیں بڑے بھائیوں سے زیادہ سمجھدار ہو جائیں تو ایسا کرنا پڑتا ہے۔''
شیما نے بردباری سے کہا۔
''اچھا سمجھدار صاحبہ، اگر میں چائے زہر مار کر لوں تو آپ میرا پیچھا چھوڑنا گوارہ کر لیں گی۔'' آشی نے کراہ کر کہا۔
''جی نہیں آپ کو یہ سینڈوچ بھی کھانے ہوں گے کیونکہ میں نے زندگی میں پہلی بار سینڈوچ بنائے ہیں اس کے بعد آپ سر درد کی گولی کھائیں گے اور پھر میں آپ کا سر اس وقت تک دباتی رہوں گی جب تک آپ آرام سے سو نہ جائیں۔''
''یا اللہ!'' آشی زور سے کراہا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔
''مجھے جلدی نیند آ جائے تاکہ اس خوبصورت بلا سے نجات مل جائے۔'' شیما نے اس بات کا بالکل بھی برا نہیں مانا۔ سینڈوچ آشی کے ہاتھ میں تھمایا اور چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر آشی کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ وہ فی الحال وہاں سے ٹلنے والی نہیں ہے۔ آشی نے عافیت اسی میں جانی کے چپ چاپ شیما کی بات مانتا جائے ورنہ اس کا وہاں ٹھہرے کا دورانیہ بڑھ بھی سکتا تھا۔ پھر جب شیما کی نرم گداز انگلیوں نے اس کی پیشانی کو چھوا تو اسے واقعی بہت سکون محسوس ہوا۔
اس نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن نیند کی دیوی پھر اس سے روٹھی ہوئی تھی وہ یونہی آنکھیں موندے پڑا رہا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ شیما اتنی دیر سے خاموش کیسے بیٹھی تھی گذشتہ ریکارڈ کے مطابق وہ تین سیکنڈ سے زیادہ خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔
''وینی آپا بہت خراب ہیں۔'' آخر شیما سے مزید چپ نہ رہا گیا۔ مگر الوینہ کے بارے میں اس کا یہ انکشاف خاصہ سنسنی خیز تھا کیوں کہ عمر کے فرق کے باوجود ان دونوں کی دوستی پورے خاندان میں مشہور تھی۔ اور شیما کسی بھی صورت الوینہ کے خیال ایک لفظ بھی سنا پسند نہیں کرتی

تھی۔ وہ راز یہ بیگم سے بھی ڈرتی ورتی نہیں تھی۔ وہ اگر اس کے سامنے الوینہ کو ڈانٹیں تو وہ اچھے خاصے زوردار انداز میں احتجاج کر بیٹھتی آشی نے درد سے بوجھل آنکھیں کھول کر شیما کی طرف دیکھا۔

''مسیحا بننے کی کوشش بلکہ ناکام کوشش کی تو آپ کافی دیر سے کر رہی ہیں لیکن یہ آپ کو یہ الہام کب سے ہونے لگا؟''

''نہیں آشی بھیا میں بہت سنجیدہ ہوں۔''

''یا الٰہی خیر۔'' آشی نے ایک بھرپور زور سے کراہا۔

''یہ دن بھی مجھے ہی دیکھنا تھا۔'' اس نے تقریباً رو کے فریاد کی۔ لیکن کیا آپ بتا سکیں گی یہ حادثہ کیسے ہوا یعنی آپ اور سنجیدگی۔ الامان الحفیظ۔''

''کوئی حادثہ نہیں ہوا۔'' شیما غصے سے بولی۔

''بس مجھے پتہ چل گیا ہے وینی آپا بہت بری ہیں۔''

''لیکن اس الہام کی جو آپ پر تازہ تازہ نازل ہوئی ہے کوئی تو وجہ ہوگی۔ بیٹھے بٹھائے وہ ایک ہی وقت ہی خراب اور بری کیسے ہوگئیں۔''

''آپ اتنے دن بعد آئے تھے اور وہ سیر سپاٹے کے لیے نکل گئیں......؟''

''اگر تم محض اس وجہ سے انہیں ان قابل قدر خطابات سے نواز رہی ہو تو بھئی یہ بات غلط ہے ان لوگوں نے تو مجھے بھی آفر کی تھی مگر میں خود ہی نہیں گیا ان کے ساتھ کیوں کہ مجھے الہام ہوگیا تھا کہ میری ننھی سی بہن بغیر بتائے لاہور آ رہی ہے۔ تو میں ان کے ساتھ کیسے جا سکتا تھا۔''

آشی نے پیار سے شیما کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی یہ کزن سگی بہنوں کی طرح عزیز تھی اور جس کی وجہ سے اس کا تنہائی کا احساس بہت کم ہو گیا تھا۔

''سچ آشی بھیا!'' شیما ایک دم خوش ہوگئی۔

''اور کیا یہی تو بات تھی اور کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں......؟''

آشی نے پھر آنکھیں بند کر لیں بولنے سے درد اور بڑھ گیا تھا۔ تھوڑی دیر شیما چپکی بیٹھی رہی، لیکن مجبوری تھی وہ زیادہ دیر تک چپ نہیں رہ سکتی تھی زبان میں کھجلی ہونے لگتی تھی اور دماغ بھی تو زبان کا ساتھ دیتا تھا۔

''آشی بھیا آپ یوں آنکھیں بند کیے ہوئے کتنے اچھے لگ رہے ہیں جیسے کوئی پرستان کا شہزادہ ہو۔''

''کوئی مکھن بازی نہیں چلے گی۔'' اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر کہا۔ اب اسے نیند بھی محسوس ہو رہی تھی۔

''مہینے کی آخری تاریخیں ہیں حالات بہت زیادہ خراب جا رہے ہیں جیب میں فالتو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔''

''میں کوئی مکھن بازی نہیں کر رہی۔'' شیما نے پہلی بار برا مان کر کہا۔

''اور مجھے آپ سے کوئی فرمائش بھی نہیں کرنی۔ حالانکہ کافی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ آشی بھیا سے کہوں گی کہ مجھے ایک چھوٹا سا ویڈیو کیسٹ پلیئر دلوا دیں پرانا والا خراب ہو گیا ہے۔ امی یا ابو سے کہوں گی تو ایک لمبی چوڑی تقریر سننے کو ملے گی۔ ''کیا کرو گی۔'' وقت ضائع کرو گی وہی وقت پڑھائی میں لگاؤ۔ اگر میٹرک میں اچھے نمبر نہ آئے تو کسی کالج میں داخلہ نہیں ملے گا وغیرہ وغیرہ۔ مگر میں اب آپ سے ناراض ہو گئی ہوں۔''

شکر اللہ کا۔'' آشی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔'' تو تم اب میرا پیچھا چھوڑ دو گی......؟''
'' شیما بھی ایک چکنا گھڑا تھی۔ اس کے پاس ایک اور بہانہ بھی تھا۔ چچی جان نے مجھے الوینہ کا کمرہ دیا ہے مجھے اکیلے کمرے میں ڈر لگتا ہے۔'' آشی کو اس کی معصومیت پر پیار آ گیا تو بیٹھی رہو نا یہیں۔ میرا کب دل چاہتا ہے کہ میری پیاری بہن مجھے چھوڑ کر چلی جائے۔''
'' جب نیند آنے لگی گی تو جا کر سو جاؤں گی۔'' شیما پھر خوش ہو گئی۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔
'' آشی بھیا آپ کو وینی آپا اچھی لگتی ہیں نا۔'' آخر شیما چپ نہ رہ سکی۔
'' ہاں مجھے کیا تمہاری وینی آپا سب کو ہی اچھی لگتی ہیں۔ وہ ہیں ہی اتنی اچھی۔'' آشی کم از کم شیما کے سامنے تو یہ کہہ سکتا تھا۔
'' تو پھر وینی آپا کو میری بھابی بنا دیں۔ پھر میں بھی آپ سے فرمائش نہیں کروں گی۔'' آشی کو جیسے کرنٹ لگ گیا وہ کمبل پھینک کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔
لگتا ہے میرے سر کا درد تمہارے سر میں منتقل ہو گیا ہے جب ہی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔ بے وقوفوں کی طرح۔''
'' واہ اس نے بے وقوفی کی کیا بات ہے آپ بھی اتنے ہینڈسم ہیں اور وہ بھی اتنی پیاری ہیں۔ سچی بہت اچھی لگے گی آپ دونوں کی جوڑی۔ میں تو چچی جان سے بھی کہوں گی۔''
'' تو مروائے گی مجھے۔'' آشی نے سر پکڑ لیا۔'' خدا کے واسطے کسی اور کے سامنے مت کہنا۔ تجھے اللہ کی قسم کبھی مذاق میں بھی یہ بات نہ کہنا۔'' آشی نے شیما کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے شیما نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے آشی کے دونوں ہاتھ

تھام لیے اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔'' اگلے دن دوپہر کو الوینہ اور عالی بھیا کے ساتھ گھر پہنچی تو آشی جا چکا تھا۔ اور شیما اونی خالہ کے ہاں چلی گئی تھی۔ الوینہ کا دل بہت زیادہ اداس ہو گیا۔ پہلے تو وہ یونہی ادھر ادھر پھرتی رہی۔
پڑھنے میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے کرنے کو کوئی کام بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ یونہی آشی کے کمرے کے پاس سے گزری تو اسے خیال آیا کہ آشی حسب عادت اپنا کمرہ بکھرا ہوا چھوڑ کر گیا ہوگا چلو اسے ہی ٹھیک کر لیا جائے۔
وہ کمرے میں داخل ہوئی تو کمرہ نسبتاً کم بے ترتیب تھا۔ صرف رائٹنگ ٹیبل کے پاس کچھ کاغذ مڑے تڑے پڑے تھے۔ اور میز پر آشی کی ڈائری پڑی تھی شاید وہ جلدی میں بھول گیا تھا۔ یوں بھی وہ ایک عام سی یادداشت ڈائری تھی۔ اس نے بے خیالی میں یونہی اسے الٹ پلٹ کر دیکھا تو ایک صفحے پر اس کی نظر چند اشعار پر پڑی۔ الوینہ کو بے حد حیرت ہوئی آشی اور شاعری اس نے حیران ہو کر سوچا اور پڑھنے لگی۔

مجھ کو تقدیر سے اب کوئی شکایت ہی نہیں
اور مرے لب پہ ترے غم کی حکایت بھی نہیں
تو نے کب مجھ سے کیا تھا کوئی اقرار وفا
نہ کوئی وعدہ فردا نہ کوئی حرف دعا
ہیں تو یادوں سے بھی اب دل کو نہ بہلاؤں گا
میں بہت دور، بہت دور چلا جاؤں گا
(اشعر کامران)

تو گویا یہ آشی کے اپنے شعر تھے۔
الوینہ نے اداس ہو کر ڈائری اپنی جگہ پر رکھ دی اس نے اکثر آشی کو یہ شعر گنگناتے سنا تھا۔
لوٹ کر تیری محفل میں نہ آؤں گا کبھی

لیکن اسے یہ پتا تھا کہ وہ آشی کے اپنے شعر ہیں ورنہ وہ شعروں کے نیچے اپنا نام نہ لکھتا وہ یہ درد بھرے شعر پڑھ کر اور بھی رنجیدہ ہوگئی۔ بھلا آشی جیسے لاابالی اور زندہ دل انسان کا ایسے غمگین شعروں سے کیا سروکار۔ وہ تو اس کے شاعری کے ذوق کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ حالانکہ آشی کی اردو اس کی اپنی اردو سے بہت بہتر تھی لیکن وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ آشی شاعری بھی کرسکتا ہے اور وہ بھی اتنی غمگین اور یاس انگیز۔

آشی اگر گھر پر موجود ہوتا تو وہ اس کے سر پر سوار ہو جاتی اور اس سے پوچھ کر رہتی کہ ان شعروں کا محترک کون ہے، کہاں ہے اسے تو خوش فہمی تھی کہ آشی کو جتنی اچھی طرح وہ جانتی ہے کوئی نہیں جانتا لیکن اس نے تو اس سے بھی اپنے آپ کو چھپا کر رکھا تھا مگر پوچھتی تو کس سے وہ تو جا چکا تھا۔ دل اس کے یوں ملے بغیر جانے پر پہلے ہی اداس تھا ایک عجیب سا بوجھ دل پر آ پڑا تھا۔

حالانکہ بہار کی آمد آمد تھی مگر پھر ہر طرف عجیب سی اداسی اور ویرانی چھائی رہتی تھی۔ چھٹیوں میں آشی گھر آیا تو اسے گھر کی فضا میں اجنبی سی لگی۔ یوں تو سب موجود تھے، پھر بھی پورے گھر میں ایک عجیب سی خاموشی طاری رہتی تھی۔

ماموں جان حسب معمول اپنا زیادہ تر وقت اسٹڈی میں گزارتے اور عالی بھیا ہسپتال سے آکر اپنے کمرے میں قید ہو جاتے ممانی جان زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں سر لپیٹے بستر پر نظر آتیں۔ وہی الوینہ جس کی مترنم اور سریلی ہنسی ممانی جان کی قہر آلود نظروں کے باوجود گھر کی فضا میں موسیقی اور رنگینی بکھیر دیتی تھی اب بالکل گم صم تھی۔ اول تو وہ نظر ہی نہیں آتی تھی، سامنے آتی بھی تو سہمی سہمی سی ہوتی۔ آشی کی چھیڑ چھاڑ اسے بس چند لمحوں کے لیے پہلے والی الوینہ بنا دیتی لیکن اگلے ہی پل وہ پھر سہم سی جاتی۔ کھانے کی میز پر اب بھی سب افراد جمع ہوئے تھے مگر ایسے جیسے ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے ہوں یا پھر چند اجنبی لوگ پہلی بار مل بیٹھے ہوں۔

آشی کو PMA میں قیام کے دوران اور بھی بہت سے لطیفے یاد ہوگئے تھے وہ جب بھی ماحول سازگار بنانے کے لیے کوئی لطیفہ سناتا تو سب لوگ یوں چونک کر اسے دیکھتے جیسے اس سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہے یا اس نے کسی اجنبی زبان میں لطیفہ سنا دیا ہو جو ان کے لیے ناقابل فہم ہے۔ آشی کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ چند دن قبل شعیب بھائی کے والدین بھی آکر گئے تھے اس کی چھٹی حس نے اسے کچھ کچھ صورتحال سے آگاہ کردیا تھا۔ لیکن تصدیق کس سے کرے یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ ابھی اسی کشمکش میں تھا کہ ایک دن ممانی جان نے اسے بلا بھیجا۔

یہ حادثہ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا لہٰذا وہ جل تو جلال تو کا ورد کرتے ہوئے ان کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ وہ اپنے بیڈ پر دراز تھیں اور آنکھوں پر بازو رکھے سو رہی تھیں یا کچھ سوچ رہی تھیں آشی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے اندر جائے یا نہ جائے آکر ہمت کر کے اس نے کھلے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ ''آجاؤ۔'' ممانی جان کی اجازت پا کر وہ کمرے میں داخل ہوگیا۔ ممانی جان بدستور دراز رہیں۔ صرف آنکھوں پر سے بازو ہٹا لیا۔ اور آنکھ کے اشارے سے بیٹھنے کا حکم صادر کیا اس کے بعد جو کچھ انہوں نے کہا اسے سن کر آشی حیران و پریشان رہ گیا۔ ابھی وہ کچھ بول بھی نہ پایا تھا کہ انہوں نے اپنا نادرشاہی حکم جاری کیا۔

''ہم نے زندگی میں پہلی بار تم کو اہم کام کو کہا ہے وہ بھی صرف اس لیے کہ الوینہ تم سے خاصی بے تکلف ہے اور ہم نے دونوں کے رشتے کے بہن بھائی ہونے کے ناطے اس پر کبھی کوئی اعتراض بھی نہیں کیا اب تمہارا یہ فرض بنتا ہے کہ تم اس قریبی رشتے کو نبھاؤ کرنے کو تو ہم زبردستی بھی کر سکتے ہیں لیکن ہم نے سوچا کہ پہلے تمہیں آزما لیا جائے دیکھنا یہ ہے کہ تم ہماری توقعات پر کس حد تک پورا اترتے ہو بلکہ اترتے ہو بھی کہ نہیں۔''

یہ کہہ کر انہوں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا گویا یہ اعلان تھا کہ اب آشی کو مزید رکنے کی ضرورت نہیں ہے اس پوری گفتگو کے دوران انہوں نے آشی کو ایک لفظ بھی بولنے کا موقعہ نہیں دیا تھا اس کے سلام کو بھی انہوں نے درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔

تمام کمروں میں تلاش کے بعد آخر آشی نے الوینہ کو پچھلے باغیچے میں جالیا۔ سامنے والے لان میں لوگوں کی آمد و رفت کی وجہ سے الوینہ کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ حسن صاحب کا تو پتہ نہیں زار یہ بیگم کو اس بات بہت غرور تھا کہ ترقی اور فیشن پرستی کی اس بے ہودہ دوڑ میں انہوں نے اپنی روایات کو برقرار رکھا ہے۔

الوینہ کو بے ایس سی کرنے کے بعد آگے پڑھنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اسے اب بھی اپنی سہیلیوں کے گھر جانے یا انہیں بلانے کی آزادی نہیں تھی۔ ان کے خیال کے مطابق نئی تہذیب نے نوجوان لڑکیوں کو شتر بے مہار بنا دیا ہے اور وہ اپنی بیٹی کو اس روش سے دور رکھنا چاہتی تھیں۔ الوینہ کی فرمائش پر احسن صاحب نے پچھلے وسیع صحن کو باغ میں تبدیل کر دیا تھا جہاں ایک چھوٹی سی مصنوعی جھیل اور آبشار بھی تھی وہ اپنی پیاری بیٹی کو حتی الامکان ہر خوشی دینا چاہتے تھے جو زار یہ بیگم نے اس پر ممنوع کر دی تھی۔

یہاں الوینہ نے اپنی پسند سے پھول لگوائے تھے جہاں سفید گلاب کے پھولوں کی بہتات تھی۔ جھیل کے نزدیک سفید گلابوں کا کنج الوینہ کی پسندیدہ جگہ تھی۔

اس وقت بھی وہ وہاں موجود تھی سفید لباس میں گھاس پر بیٹھی کتاب زانو پر رکھے وہ نہ جانے کس خیال میں گم تھی۔

''ہاؤ......!'' آشی نے بالکل اس کا کان کے پاس منہ لا کر کہا تو وہ بری طرح سہم گئی۔ اور دوڑ لگانے ہی والی تھی کہ آشی کے قہقہے نے اس کے قدم روک دیے۔

''تم کبھی انسانوں کی طرح نہیں آ سکتے۔ بھوت کہیں کے۔''

ارے بھئی چڑیلوں کے پاس بھوت ہی آئیں گے۔'' آشی وہیں گھاس پر پر پاؤں پسار کر بیٹھ گیا اور الوینہ کو اٹھتے دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بیٹھا لیا۔

''سفید کپڑوں میں بہت اچھی لگ رہی ہو۔ اس لیے جھگڑا ختم۔''

آشی کے منہ سے تعریف کا جملہ نکل جائے ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ الوینہ کا موڈ ایک دم ٹھیک ہو گیا پھر اسے یوں بھی معلوم تھا کہ آشی جانے والا ہے۔

''اچھا جاؤ معاف کیا تم بھی کیا یاد رکھو گے۔ چلو میں اچھی سی چائے بنا کر لاتی ہوں پھر باتیں کریں گے۔''

''اچھی سی چائے تم سے بننے سے رہی خیر لے آؤ۔''

آشی نے بھی اسے جانے دیا اس نے سوچا

کہ شاید اتنی دیر میں وہ اپنے آپ کو سمیٹنے میں کامیاب ہو جائے اس وقت وہ اپنے آپ کو بہت بکھرا ہوا محسوس کر رہا تھا نہ جانے کیوں بچپن سے لے کر آج تک کا زمانہ ایک فلم کی طرح اس کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا ماموں جان کی مصروفیات اور تنگ مزاج بیوی کی خاطر آشی سے زیادہ لگاؤ ظاہر نہ کرنا۔ عالی بھیا کی بے نیازی اور ممانی جان کی سرد مہری کے درمیان اس کی زندگی زیادہ خوشگوار نہیں گزری تھی۔ پھر اس کی انا اور خودداری ہر خوشی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی تھی۔ ایسے میں صرف الوینہ کا پرخلوص وجود تھا جس نے اس کی ز ندگی میں دل کشی پیدا کر دی تھی۔ اس کی ناراضگی اور غصہ بھی اسے اچھا لگتا تھا اس سے اس کی اپنائیت اور اس کے لیے اپنی اہمیت کا احساس ہوتا تھا یہ خدشہ کہ یہ ساتھ زیادہ دن وہ قائم نہیں رہ سکتا اسے ہمیشہ ہی رہا تھا اور اب تو یہ خوف نظروں کے سامنے ہی تھا۔ اچانک اسے وہ دن یاد کر کے ہنسی آ گئی جب اس نے کہہ دیا تھا کہ تم صرف سفید یونی فارم میں اچھی لگتی ہو اور الوینہ اس ریمارک پر غضبناک ہو گئی تھی اور کہا بھی ایسے وقت پر تھا جب وہ بڑے اہتمام سے عنابی غرارہ سوٹ میں کسی شادی میں شرکت کے لیے تیار ہوئی تھی۔

ویسے یہ حقیقت بھی کہ الوینہ پر سفید لباس بہت جچتا تھا۔ سفید کپڑوں میں اس کی شخصیت اور بھی پاکیزہ سی ہو جاتی تھی۔ مگر آشی نے یہ بات الوینہ سے سنجیدگی سے نہیں کہی تھی کیونکہ کہ سنجیدگی سے کوئی بات کرنے کے موقعہ ان دونوں کے درمیان بہت کم آتا تھا اچھی خاصی دوستی کے لمحات کا انجام اکثر زبردست جنگ ہوتا تھا۔ اور آج بھی الوینہ سے سنجیدہ گفتگو کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ جانے وہ اس کی پوری بات سنے گی بھی یا

بات کا آغاز ہوتے ہی روٹھ کر چل دے گی۔ اور یہ بات تو اس پر اچھی طرح واضح تھی کہ اس گھر میں وہ رہا تھا تو صرف الوینہ اور ماموں جان کی وجہ سے۔ ورنہ ممانی جان کا رویہ تو اس جیسے خودداد شخص کے لیے بے حد نا قابل برداشت تھا۔ اور یہ بات اور ہے کہ وہ بیٹی سے بھی لیے دیئے ہی رہتی تھیں۔ الوینہ کا سارا لاڈ پیار اور فرمائشیں باپ سے ہوتی تھیں اور وہ بھی راز یہ بیگم کی غیر موجودگی میں ورنہ ان کی ایک ہی نظر اسے سہا دیتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد الوینہ ٹرے میں بھاپ اڑاتی خوشبودار چائے کے دو مگ لے واپس آ گئی۔ اس نے ایک مگ آشی کو تھما دیا۔ اور اپنا مگ لے کر وہیں گھاس پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر خاموش رہی۔ آشی چائے پیتا رہا اور بات کا سرا ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا۔

''چائے اچھی ہے اتفاق سے......'' آشی کو اور کوئی بات نہ سوجھی تھی۔

''اچھی ہے اتفاق سے نہیں۔ میں ہمیشہ اچھی چائے بناتی ہوں۔''

''خیال ہے آپ کا ورنہ ہمارے حوصلے کی داد دینی چاہیے جو یہ چائے پی لیتے ہیں اور اف نہیں کرتے۔''

''کیا......!'' الوینہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔

''واپس کرو چائے۔ خبردار کو ایک گھونٹ پی اور لیا۔

''اچھا بابا معاف کر دو میں تو مذاق کر رہا تھا۔'' آشی نے بات بڑھتی دیکھ کر سفید جھنڈی لہرائی۔ اسے معلوم تھا کہ جو بات الوینہ سے کرنی تھی اس کے بعد اسے اس کا وقت نہیں ملے گا کیونکہ اگلے ہی دن اسے جانا تھا۔ آخر کچھ دیر بعد آشی نے بات کا آغاز کیا۔

''وینی گھر میں جو آج کل ایک سکوت سا طاری ہے اس کی وجہ جانتی ہو......؟'' آشی نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر الوینہ کی طرف دیکھا۔

''ہاں ...... جانتی ہوں۔'' الوینہ نے نظریں جھکا کر صاف گوئی سے اقرار کیا۔

''اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے حوالے سے ممانی جان کی یہ آخری اور سب سے بڑی خواہش ہے۔''

''ہاں یہ بھی جانتی ہوں۔'' الوینہ نے گھاس کا ایک تنکا توڑتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی ...... پھر بھی تم نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا......؟''

''ہاں آشی ......'' الوینہ نے نادم سی ہو کر سر جھکا لیا۔

''وجہ پوچھ سکتا ہوں......''

''آشی یہ میری زندگی ہے اور اس کے بارے میں فیصلہ کرنا میرا حق بھی تو ہے۔''

''یہ تم نے ٹھیک کہا ہے کہ یہ تمہارا حق ہے۔'' آشی نے بھی پر زور دے کر کہا۔

''یعنی تم مانتی ہو کہ تمہارے والدین، تمہارے بڑے بھی یہ حق رکھتے ہیں کہ وہ تمہارے بارے میں فیصلہ کر سکیں۔ پھر بھی تم نے یہ حق کلی طور پر اپنے ہاتھ میں لے لیا......؟''

''آشی ......!'' الوینہ نے کچھ کہنا چاہا۔

''وینی پہلے میری بات غور سے سنو۔ ایک اچھی بیٹی ہونے کے ناتے تمہیں اس بات کا یقین ہوگا کہ تمہارے والدین تمہارے حق میں کوئی غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔ پھر مجھے یہ بتاؤ کہ شعیب بھائی میں کیا برائی ہے وہ ہر لحاظ سے ہزاروں میں ایک ہیں سب سے بڑھ کر وہ دولت مند اور بارسوخ ہیں، لڑکیاں تو امیر شوہروں کی تمنا کرتی ہیں خواہ وہ بدصورت اور ادھیڑ عمر کے ہوں۔ وہ تو رئیس ہونے کے ساتھ ساتھ خوبرو بھی ہیں اور عادت مزاج میں بھی کسی سے کم نہیں پھر تمہیں کیوں انکار ہے......؟''

''کاش تم سمجھ سکتے کہ میرے انکار کی کیا وجہ ہے۔'' الوینہ نے دل میں سوچا مگر کہہ نہ سکی۔

''دیکھو وینی، ممانی جان نے بڑے مان سے یہ ذمہ داری مجھے سونپی ہے کہ میں تمہارے انکار کو اقرار میں بدل سکوں کیا تم مجھے ان کے سامنے شرمندہ کرواؤ گی......؟'' ہاں کہہ دو الوینہ۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم اپنی خوشی کو اپنے ہاتھوں ٹھکرا رہی ہو۔''

الوینہ نے نظریں اٹھا کر کاشی کی طرف دیکھا وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے آسمان پر آشیانوں کی طرف لوٹتے ہوئے پنچھیوں کو دیکھ رہا تھا اس نے آج تک آشی کو اتنا سنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔

''اچھا آشی جیسی تمہاری مرضی، جاؤ امی سے کہہ دو مجھے ان کی بات منظور ہے کسی کی زندگی کی ہر خوشی مٹا دو۔ تمہیں شرمندہ تو نہ ہونا پڑے۔'' اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

''نہیں الوینہ...... ایسا نہ کہو۔'' آشی نے بے چین ہو کر کہا۔

''خدا نہ کرے میں تمہاری خوشیاں برباد کروں اس پہلے مجھے موت آ جائے۔''

''آشی دوبارہ گھاس پر بیٹھ گیا۔ الوینہ نے بے اختیار اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ آشی نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''تم دیکھنا تمہارا یہ فیصلہ نہ صرف پورے گھر بلکہ تمہارے لیے بھی بہت خوش کن ثابت ہوگا۔ انشاءاللہ۔''

''آشی ...... کیا ...... کیا تم بھی خوش ہو......؟''

تھوڑی دیر بعد الوینہ نے عجیب انداز میں کہا۔

''پتہ نہیں الوینہ۔'' آشی باوجود کوشش کے بھی ہاں نہ کہہ سکا۔

''مجھے زندگی میں خوشیاں بہت کم ملی ہیں اس لیے اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ خوشی اور غم میں کیا فرق ہے میرے لیے سب سے بڑا صدمہ تمہارا اس گھر میں نہ ہونا ہوگا لیکن وہ میں آسانی سے برداشت کرلوں گا۔ کیونکہ مجھے یہاں رہنا ہی کہاں ہے ۔'' آشی جیسے اپنے آپ سے باتیں کررہا تھا۔

''خیر چھوڑو میں جاکر یہ خوش خبری ممانی جان کو سناتا ہوں گھر میں چھایا ہوا یہ سناٹا تو ٹوٹے۔'' آشی اٹھنے لگا تو الوینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

''تھوڑی دیر رک جاؤ کل تو تم چلے ہی جاؤ گے پھر نہ جانے کب ملنا نصیب ہو......'' آشی نے الوینہ کی طرف دیکھا اور دوبارہ گھاس پر بیٹھ گیا۔

''وہ تمہاری سہیلی کہاں ہے آج کل......؟'' آسی نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

کون سی سہیلی......'' الوینہ حیران ہوکر آشی کی طرف دیکھنے لگی۔

''ارے وہی نیلو اور کون۔ یار ہمارا بھی کچھ خیال کرو۔ اپنے ہی بارے میں سوچتی رہو گی۔

''سچ آشی اگر یہ بات ہے تو کہوں امی سے...... الوینہ نے مسکرا کر کہا۔

''ارے...... ارے میں نے بس یہ مسکراہٹ تمہارے ہونٹوں پر دیکھنے کے لیے یہ بات کہی تھی۔ مروا نہ دینا کہیں۔'' الوینہ کچھ نہ کہہ سکی۔

آشی بازوؤں پر ہاتھ رکھے گھاس پر دراز تھا اور آسمان پر ابھرتے ہوتے ہوئے چاند کو دیکھ رہا تھا۔

وہ پھر دھیرے دھیرے گنگنانے لگا۔

لوٹ کر تیری محفل میں نہ آؤں گا کبھی۔

اچانک ہی الوینہ کا دل گھبرا اٹھا۔

''خدا کے واسطے آشی۔ یہ مصراعہ نہ دہراؤ میرا دل گھبراتا ہے۔''

''ارے بھئی میں یہ شعیب بھائی کے لیے نہیں کہہ رہا۔ وہ تو اب یہاں بار بار آئیں گے۔''

''خدا کے واسطے آشی۔ کیا ہمارے درمیان اس موضوع کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوسکتی۔''

الوینہ کی آواز رندھ گئی۔ آشی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''اب تو لگتا ہے ہمارے درمیان گفتگو کا ہر موضوع ختم ہوگیا ہے آؤ اندر چلیں۔ سردی بڑھ گئی ہے مجھے صبح روانگی کے لیے تھوڑی سی تیاری بھی کرنی ہے۔''

''میں نے تمہاری ساری پیکنگ کر دی ہے۔''

''وینی مت خراب کرو میری عادتیں۔'' ورنہ تمہیں بھولنا اور بھی مشکل ہوجائے گا۔''

باوجود کوشس کہ آشی اپنی بھرائی ہوئی آواز پر قابو نہ پا سکا۔ الوینہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن اس وقت لوالقین کی آواز پر اٹھ کر اندر چلی گئی شاید کسی مہمان کے لیے چائے بنوانی تھی۔

اس کے جانے کے بعد آشی نے بڑی فراغ دلی سے آنسوؤں کو بہنے کی اجازت دے دی۔

کہ اب وہاں انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

آج آشی نے وہ قرض اتار دیا تھا جو اس خاندان کا اس پر تھا۔ روح تو ہلکی پھلکی ہوگئی تھی لیکن اس دل کا کیا کرتا جو ایک انجانے غم کے بوجھ تلے دبا جارہا تھا۔

آشی کا خیال تو تھا کہ وہ الوینہ کی شادی میں نہیں پہنچ سکے گا۔ کیونکہ اسے ایکسر سائز پر جانا تھا

لیکن ایکسر سائز جلدی ختم ہوگئی اور وہ شادی سے چند دن پہلے آ گیا۔ راز یہ بیگم نے پرانی رسومات کی پابند تھیں۔ لہٰذا شادی سے پانچ چھ دن پہلے الوینہ کو مایوں میں بٹھا دیا گیا اور اس کے کمرے سے نکلنے پر مکمل پابندی تھی بلکہ سخت کرفیو نافذ تھا۔

عالی بھیا نے کئی دنوں سے الوینہ کو نہیں دیکھا تھا انہوں نے سوچا وہی جا کر الوینہ سے مل آئیں۔ ان کے کہنے پر آشی بھی ان کے ساتھ آ گیا۔ پیلے کپڑوں میں الوینہ بالکل سرسوں کا پھول لگ رہی تھی۔ عالی بھیا کی ڈاکٹروں والی رگ پھڑک اٹھی۔ وہ گھبرا کر اس کی آنکھوں، زبان اور ناخنوں کا معائنہ کرنے لگے۔ آشی نے بمشکل ان کو یقین دلایا کہ وہ پیلے لباس کی وجہ سے وہ کپڑوں کی ہم رنگ لگ رہی ہے تو انہیں کچھ اطمینان ہوا۔ وہ پرانے رواجوں کے خلاف چند جملے بول کر مطمئن ہوگئے کیونکہ راز یہ بیگم کے سامنے تو کچھ کہنے کی ہمت نہ تھی۔

کافی دیر تک خوشگوار ماحول میں باتیں ہوتی رہیں لیکن باتیں تو وہ دونوں ہی کر رہے تھے الوینہ تو بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ عالی بھیا نے یہی سمجھا کہ وہ گھر سے جدائی کے خیال سے رنجیدہ ہے اچانک عالی کو خیال آ گیا۔

''یار آشی کوئی گانا وانا ہی ہوجائے۔ شاید اس طرح الوینہ کی اداسی دور ہوجائے۔

گانے بجانے کی محفلیں ابھی ماند ہی تھیں کیونکہ نہ تو الوینہ کی کزن زیادہ تھیں اور نہ ہی سہیلیاں۔

''تھوڑی بہت رونق رات کو ہوجاتی تھی۔ جب محلے کی چند ایک لڑکیاں اکٹھی ہوجاتی تھیں دن بھر تو سناٹا ہی رہتا تھا۔ کزنز میں سے ابھی شیما ہی آئی تھی اور اسے راز یہ بیگم نے اپنے ساتھ مصروف کرلیا تھا۔

آشی کو نہ صرف ستار اور ہارمونیم بجانا آتا تھا بلکہ اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی لیکن وہ بہت کم گانا سنانے پر راضی ہوتا تھا پھر گھر کا ماحول بھی ایسا تھا کہ آشی کو گنگنانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی لیکن وہ نہ جانے کیوں آج فوراً ہی مان گیا شاید اس نے الوینہ کی نگاہوں کی التجا سمجھ لی تھی عالی بھیا کو اس بات پر خاصی حیرت ہوئی اور خوشی بھی۔

''اگر یہ بات ہے تو ہوجائے، آواز اور ساز کا سنگم۔ جاؤ میرے کمرے سے ہارمونیم تو اٹھا لاؤ۔'' کبھی فرصت کے دنوں میں آشی کا ستار دیکھ کر عالی بھیا کو بھی شوق چرایا تھا اور وہ ایک سیکنڈ ہینڈ ہارمونیم اٹھا لائے تھے اور اب ایک مدت سے کمرے میں بیڈ کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ آشی کے ستار کے تار بھی ٹھیک کرانے کی نوبت نہیں آئی تھی آشی کو یقین تھا کہ ہارمونیم یقیناً خراب ہوگا اس لیے اس نے نوکر سے منگوالیا۔ بڑی مشکلوں سے اس کی گرد صاف ہوئی اور آشی نے اس کے سروں پر اپنا ہاتھ پھیرا تو اسے انتہائی حیرت ہوئی کہ ہارمونیم ٹھیک تھا۔ مجبوراً آشی کو اُسے بجانا پڑا۔ ''عالی بھیا اجازت ہے......؟''

اس نے خالص گویوں کے انداز میں سروں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

اجازت ہے۔ عالی بھیا نے شاہانہ انداز میں جواب دیا۔

''کیا سناؤں......؟'' آشی نے پھر گویوں والا سوال کیا۔

''ارے بھئی جلدی کرو۔ تم تو ہمارے صبر کا امتحان لے رہے ہو۔ کچھ بھی سنادو۔''

''کچھ بھی سنا دوں......؟'' آشی نے عالی بھیا کی طرف دیکھا۔

''ہاں ...... ہاں کچھ بھی سنا دو۔ جلدی

کرو......" عالی بے قراری سے پہلو بدل کر بولے۔ آشی نے سروں پر انگلیاں پھیریں اور کان پر ہاتھ رکھ کر قوالوں کی طرح تان لگائی۔

بگڑی مری بنا دے اجمیر والا خواجہ

عالی بھیا ہمہ تن گوش تھے۔ وہ جھینپ سے گئے اور انہوں نے ایک دھپ آشی کی کمر پر جڑ دیا۔ پھر ہاتھ اٹھا کر بولے۔

"سناتے ہو سیدھی طرح یا دوں ایک اور ہاتھ۔"

نہ ...... نہیں سناتا ہوں......سناتا ہوں۔" آشی نے سہم جانے کی ایکٹنگ کی الوینہ جو اب تک بالکل خاموش بیٹھی تھی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور آشی کے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہی تو اس کا مقصد تھا۔ وہ الوینہ کو خوش دیکھنا چاہتا تھا اسے غمگین دیکھ کر اس کے دل کا بوجھ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

"اب جو کچھ بھی سنانا انسانوں کی طرح۔ سمجھے۔" عالی بھیا نے پھر آنکھیں نکالیں۔

"سمجھ گیا...... سمجھ گیا۔" آشی نے مسکرا کر کہا اور پھر سروں کو چھیڑ دیا۔

ناکام رہے مرے گیت، بدنام ہوا میرا پیار
مری دنیا کے کچھ ایسے ٹوٹے تار

غزل ختم ہوگئی۔ دونوں ہی اتنے محو تھے کہ کسی کو غزل کے ختم ہونے کا پتا ہی نہ چلا۔

"ہیلو......اجی میں نے کہا واپس آ جایئے۔ اب تو مجھے یقین ہوگیا کہ واقعی میری آواز بہت اچھی ہے۔" اس نے خود اپنا ہی شانہ تھپتھپا کر کہا۔

عالی بھیا محویت سے چونک پڑے۔ پھر انہوں نے آشی کو خوب خوب داد دی۔

اسی دوران آشی نے بتایا کہ اس کی پروموشن کی اطلاع اچانک آئی ہے اور اسے کیپٹن کی حیثیت سے کل صبح مری پہنچ کر جوائن کرنا ہے۔

"عجیب نالائق ہو تم۔ پروموشن کی خبر بغیر مٹھائی کے سنا رہے ہو۔ اور یہ کیا بات ہوئی تم شادی تک نہیں ٹھہرو گے......؟" تمہارے بغیر بھلا مزہ کیا آئے گا۔" انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔

"کیا کروں عالی بھیا ہم فوجیوں کی زندگی تو ایسی ہی ہوئی ہے کندھوں پر بوریا بستر اٹھائے پھرتے ہیں جہاں آڈر ہوا وہیں ڈیرہ لگالیا۔"

ماحول پر عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ آشی نے دو تین لطیفے سنا کر ماحول کو خوشگوار کر دیا۔

"اچھا بھیا اب میں چلوں۔ ممانی جان نے دو تین کام بتائے ہیں وہ کر لوں تو اپنی تیاری کروں۔ اللہ حافظ۔ وہ ہاتھ ہلاتا اور مسکراتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اور الوینہ سوچتی رہ گئی کہ ہر وقت ہنسنے اور ہنسانے والے آشی کی مسکراہٹ میں آنسوؤں کی نمی کیوں گھل گئی تھی۔

آج شادی کی رات تھی الوینہ سرخ غرارہ سوٹ میں ملبوس خوبصورت زیورات سے سجی بیٹھی تھی۔ سب کی تعریفوں کے باوجود اسے اپنا آپ اجنبی سا لگ رہا تھا۔ اس وقت اس کی سہیلیاں بارات کے استقبال کے لیے باہر چلی گئی تھیں۔ اسے لگا جیسے آشی اس کے سامنے کھڑا ہو اور کہہ رہا ہو۔ "سرخ کپڑوں میں ذرا بھی اچھی نہیں لگ رہیں۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔

اسی لمحے کسی نے ایک بڑا سا پیکٹ اس کے پاس رکھ دیا جس پر خوبصورت الفاظ میں لکھا تھا۔ "الوینہ کے لیے بہت سی دعاؤں کے ساتھ۔" الوینہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ پیکٹ کھولا تو ہلکے سبز رنگ کی ریشمی کامدار ساڑھی پھسل کر اس کے ہاتھوں میں آرہی۔ ایک چھوٹے سے سرخ مخمل کے ڈبے میں بہت نازک اور خوبصورت سونے

کے ٹاپس تھے۔اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔

الوینہ......سدا خوش رہو۔

آج تمہاری شادی کا دن ہے جب تمہیں یہ پیکٹ ملے گا تو تم سرخ لباس میں پیاری سی دلہن بنی بیٹھی ہوں گی سوچتا ہوں کہ اچھا ہوا جو میں اس وقت وہاں نہ ہوا۔ مجھے تو تم ہمیشہ سفید لباس میں ہی اچھی لگیں۔کہیں یہ بات منہ سے نکل جاتی تو کتنی بدشگونی ہوتی۔ممانی جان کس قدر ناراض ہوتیں۔ واقعی اللہ میاں کے ہر کام میں کوئی مصلحت ہوتی ہے یہ ساڑھی تم جیسی اتنے بڑے بزنس مین کی بیوی کے شایان شان تو نہیں مگر ایک غریب فوجی کی بس یہی حیثیت ہے جب ساڑھی خریدنے گیا تو ایک بہت ہی خوبصورت سفید ساڑھی خریدنے کو دل مچل اٹھا۔مگر ظاہر ہے میں ایسا نہیں کر سکتا تھا نہ جانے میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے جو چاہتا ہوں کر نہیں سکتا۔ خیر کہو تمہیں ساڑھی پسند آئی یا نہیں اور یہ ٹاپس میں نے اپنی پہلی تنخواہ سے خریدے ہیں نہ جانے کیوں......؟''

اب یہ ساڑھی اور ٹاپس نہ بھی پسند آئیں تو ایک بار ضرور پہن لینا کسی کا دل رکھ لینا اچھی بات ہوتی ہے اور نیلو صاحبہ کو دیکھو ہم ان کی نظر التفات کے منتظر ہی رہے اور انہوں نے دل رکھنے کے لیے بھی مسکرا کر ہماری طرف نہیں دیکھا۔خیر جو اللہ کی مرضی اب ایک بات سچی سچی بتانا۔تم خوش تو ہونا......؟'' ابھی تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ شعیب بھائی کے گھر میں کتنی بے شمار مسرتیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں تم بھی کتنی نادان تھیں اپنی زندگی کی اتنی ساری خوشیوں کو اپنی بے وقوفی کی وجہ سے ٹھکرا رہی تھیں۔

اس دن جب میں صبح صبح جانے کی تیاری کر رہا تھا تو مجھے ایسا لگا کہ تم میرے لیے چائے لے کر آ رہی ہو پھر مجھے اپنے پاگل پن پر ہنسی آ گئی۔ بھلا تم کیسے آ سکتی تھیں۔تم تو شاید اس وقت اپنے ہاتھوں پر مہندی رچائے بیٹھی تھی۔گھر سے نکلتے ہوئے نہ جانے کیوں ایک شعر لبوں پر آ گیا تم بھی سن لو۔

کسی کی آنکھ میں آنسو نہ لب پہ حرف دعا
کوئی چراغ تو ہوتا رہ سفر کے لیے

مجھے ابھی تک کوارٹر نہیں ملا۔خیر مل جائے گا ہم جیسے لوگوں کو گھر کی ضرورت بھی کیا ہے یوں بھی ساری عمر گھر کے بغیر ہی گزاری ہے میں اس وقت PMA میں اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھا تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ تمہارے نام کا پہلا اور آخری خط۔ میرے سامنے مری کی برف پوش پہاڑ ہیں۔ جہاں تک نظر جاتی ہے برف ہی برف نظر آتی ہے کل ساری رات برف باری ہوتی رہی ہر طرف ایک جمود ایک ویرانی سی چھائی ہوئی ہے۔ جسے دیکھ کر دل خواہ مخواہ ڈوبتا جاتا ہے یا شاید مجھے ایسا لگ رہا ہے آج نہ جانے کیوں دل بہت ہی اداس ہے اب خط ختم کرتا ہوں کہیں خدانخواستہ میری اداسی کا سایہ تم پر بھی نہ پڑ جائے۔ نہ جانے کیا کچھ لکھ دیا۔ معاف کر دینا فقط آشی۔

الوینہ خط ہاتھ میں تھامے سوچ رہی تھی۔ آشی آخر وہی ہوا نا جس کا مجھے خدشہ تھا۔تم مجھے کیا سمجھتے۔تم تو اپنے آپ کو بھی نہ سمجھ سکے یا شاید دوسروں کی خوشیوں کے لیے جان کے انجان بن گئے۔ آشی مجھے تم خوش دیکھنا چاہتے ہو نا تو میرا وعدہ ہے۔ میں خوش رہنے کی پوری کوشش کروں گی اور تمہیں کبھی یاد نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں۔خدا کرے تم بھی مجھے بھول جاؤ۔خدا کرے......'' الوینہ نے اپنے حنائی ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیے اور دو آنسو آنکھوں سے نکل کر اس کے زرتار دوپٹے میں جذب ہو گئے۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

''میں بھی تھانے میں ہی قید تھا آج ہی رہا ہوا ہوں۔'' وہ دو قدم اور آگے بڑھا اجالا نے پوری قوت سے اسے تھپڑ مارا پھر اس نے ناخنوں سے نوچنا شروع کر دیا۔ ''کتنے جھوٹ بولو گے تم گھٹیا انسان۔'' اجالا نے اس کا گریبان جھنجھوڑ ڈالا اسے زمین کی گردش رکتی ہوئی......

آخری حصہ

اُس دوشیزہ کی کتھا، جس کی ایک لمحے کی خطا نے اُس کی ساری زندگی کو مجسم خطا بنا ڈالا تھا

''رحمان میں نے اپنا کام پوری دیانتداری سے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا ہے ذرا بھی بد دعا نتی نہیں گلے تک نہیں لگایا اُسے، اب لا میری رقم۔'' فاروق یہ کیسی باتیں کر رہا ہے۔'' ایئر پورٹ پر لگایا تو تھا۔'' رحمان ہنسا تھا مکروہ ہنسی۔

''ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے یہ تو ضروری ہے نا ورنہ وہ پولیس والا یار ہمیں رنگے ہاتھوں کیسے پکڑتا۔'' دونوں ہاتھوں پر ہاتھ مار کر ہنسے۔

''وہی تصویر تو میں نے اخبار میں چھپوا کر نیچے خبر لگوائی تھی ڈاکٹر سعد مرتضیٰ کی بہن اپنے آشنا کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑی گئی پولیس کا چھاپہ، ہاہاہا اخبار دیکھ کر سعد مرتضیٰ بس دیواروں میں ٹکریں مار مار کر خود کو لہولہان کرتا رہا۔ میں ہر وقت اس کے ساتھ تھا، اس کی دل جوئی کے لیے، میرے دل میں سکون اترتا رہا، وہ ساری زندگی عیش کرتا رہا اور میں آنے کے لیے ترستا رہا کہتا جا رہا تھا میری اُجالا ایسی نہیں ہو سکتی، میری اجالا ایسی نہیں ہے۔''

''ویسے یار ایک بات ہے دونوں بہن بھائی ہیں بہت اچھے۔'' فاروق نے تاسف سے تمسخر اڑایا۔

''کل تیرے اکاؤنٹ میں پانچ لاکھ پہنچ جائیں گے۔''

ان آوازوں نے ان باتوں نے اجالا کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ وہ بھربھری مٹی کا ڈھیر بن گئی تھی، عزت نفس اس کی انا اس کی محبت سب کو تماشا بنا دیا تھا۔ اس کا دل چاہا کمرے کی ہر چیز کو تہس نہس کر ڈالے ان مردوں کو نوچ لے سب کچھ تباہ کر دے۔ سوچیں دیمک کی طرح اس کے دل کو چاٹنے لگیں دل کا درد سو گنا بڑھ گیا۔ اجالا نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔

''فاروق تم یہاں......'' سب کچھ اپنے کانوں سے سننے کے بعد نہ جانے وہ کس خوش فہمی

میں مبتلا تھی یا پھر اس کے منہ سے روبرو سننا چاہ رہی تھی۔

''ہاں جان میں......'' وہ اٹھ کر اس کی طرف آیا۔

''مجھے تھانے میں چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے۔'' وہ رودی۔

''میں بھی تھانے میں ہی قید تھا آج ہی رہا ہوا ہوں۔'' وہ دو قدم اور آگے بڑھا اجالا نے پوری قوت سے اسے تھپڑ مارا پھر اس نے ناخنوں سے نوچنا شروع کر دیا۔

''کتنے جھوٹ بولو گے تم گھٹیا انسان۔'' اجالا نے اس کا گریبان جھنجھوڑ ڈالا اسے زمین کی گردش رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی درد کی تیز چبھن نے سارے وجود کو چور چور کر ڈالا تھا۔

''بتاؤ کیوں کیا تم نے ایسا، میری توہین کی، محبت کا مذاق بنایا کیوں کیا ایسا۔''

''میرا کام ہے یہ، مجھے رحمان نے تمہارے پیچھے لگایا تھا پانچ لاکھ میں ہماری ڈیل ہوئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اجالا میں کبھی شکاگو گیا ہی نہیں، میں یہیں تھا میں تو شکاگو جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا میں تمہیں یہیں سے فون کرتا تھا۔'' وہ ہولے کہتا اجالا کی ہستی فنا کرتا جا رہا تھا۔ اجالا اسے مارتی رہی روتی رہی۔ اس نے اپنے دفاع میں اجالا کے ہاتھ نہیں جھٹکے۔

''محبت بیچ ڈالی تم نے، اجالا کا سودا کر ڈالا۔ اتنی کم قیمت میں، اتنی ارزاں تھی۔ کیا میری محبت۔'' اس کی آنکھوں میں اتنی بے یقینی تھی شاک اور صدمے سے نڈھال وہ شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

''اجالا نے تو اپنی ایک ایک سانس تمہیں دان کر دی تھی دل و جان سے تمہاری ہوگئی تھی، پیسوں کی ضرورت تھی تو مجھے کہا ہوتا، اتنی کم مایہ تھی اجالا، اتنے کم دام، اتنی سستی بک گئی۔'' وہ جیسے ہوش وخرد سے بے گانہ ہو کر خود کلامی کرتی رہی روتی رہی۔

☆......☆......☆

سعد مرتضٰی جب سو کر اٹھا تو چوکیدار نے اسے بتایا کہ اجالا بی بی اپنی گاڑی میں علی الصبح کہیں چلی گئی ہے گیٹ کھلا ہوا تھا جب وہ نماز پڑھ کر واپس لوٹا۔ سعد مرتضٰی سمجھا کہیں قریبی پارک تک گئی ہوگی۔ آجائے گی وہ بھی جاگنگ کے لیے چلا گیا واپس آیا فریش ہوا ناشتا کیا اجالا ابھی تک نہیں لوٹی تھی تو اسے فکر ہونے لگی اس نے رحمان کو فون کیا رحمان فوراً چلا آیا وہ سعد کے غم اس کی پریشانی میں شامل رہا۔ سعد کے ساتھ رحمان نے شہر کا کونہ کونہ چپہ چپہ چھان مارا مگر اجالا شہر میں ہوتی تو ملتی نا۔ سعد اب صحیح معنوں میں پریشان ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

دن شام میں ڈھل گیا۔ شام نے رات کے وجود میں پناہ لے لی۔ سعد ساری رات روتا رہا دعائیں مانگتا رہا۔ رحمان اسے تسلیاں دیتا رہا اس کی ڈھارس بندھواتا رہا اجالا کے لوٹ آنے کی امید دلاتا رہا۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب رحمان نے زبردستی اسے نیند کی گولی دی تھی جب سعد سو گیا تو وہ اپنے گھر چلا گیا۔ گھر جاتے ہی اس نے فاروق کو چند ضروری ہدایات دیں اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ حرص اس کی مسکراتی نظروں میں ناچ رہی تھی وہ جو کر رہا تھا جو وہ اتنے لمبے عرصے سے پلان کر رہا تھا وہ کسی کا گھر اجاڑنے کا سوچ رہا تھا کسی کا معصوم آنچل داغدار کرنے کی ٹھان بیٹھا تھا وہ کتنے بڑے گناہ کا مرتکب ہو رہا تھا اور اسے ندامت نہیں تھی۔

وہ اجالا اور سعد کی تباہی بربادی کا سامان کر چکا تھا اس کے دل پر بے حسی کی مہر ثبت ہو چکی تھی وہ نفس پرستی کا شکار کمزور انسان تھا وہ عیش سے جینا چاہتا تھا اور بہت سارا جینا چاہتا تھا۔ انسانیت کو چھوڑ کر انسان بت کر فرعون بن جاتا ہے۔ دوسروں کی زندگی میں سیاہی گھول دیتا ہے کسی کی لٹی پٹی حالت پر خوشیاں منانے والا انسان بھول جاتا ہے کہ ظالم کی رسی اللہ دراز کرتا ہے۔ اور پھر جب رسی کھنچتا ہے طنابیں ٹوٹ جاتی ہیں آخرت میں نجات نہیں ملتی بس اتنا سا کھیل اور انجام سے بے خبر انسان۔ دنیا میں رحمان جیسے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں جو گناہ کر کے بھی تمام عمر مطمئن رہتے ہیں۔ ساری زندگی رائیگاں کر کے تمام عمر تہی داماں رہتے ہیں۔

رحمان کی آنکھوں میں مستقبل کے سہانے سپنے تھے وہ مسرور تھا۔

☆......☆......☆

اگلا دن سعد مرتضی کی زندگی کا سیاہ دن تھا رحمان ابھی ابھی لاہور سے نکلنے والا اخبار ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا اور پھر کسی خاص جگہ پر رحمان نے اشارہ کیا سعد نے اخبار دیکھا اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اجالا کسی نوجوان کے سینے سے لگی کھڑی تھی۔ دوسری تصویر میں اجالا پولیس والوں کے نرغے میں پھنسی ہوئی کھڑی تھی۔

''نہیں میری اجالا ایسی نہیں ہوسکتی۔ وہ ضرور کسی سازش کا شکار ہوئی ہے۔'' سعد رو رہا تھا اپنے بال نوچ رہا تھا۔ دیواروں سے سر پھوڑ رہا تھا وہ پاگل ہو رہا تھا۔

''اجالا کل سے گھر سے غائب ہے مگر رحمان ایک بار بھی کوئی ایسا خیال مجھے چھو کر نہیں گزرا کہ وہ کسی مرد کے ساتھ...... نہیں اجالا ایسی نہیں ہے سعد کی بہن ایسی نہیں ہوسکتی اسے پتا ہے وہ سعد کی لاڈلی ہے وہ ایسی نہیں ہے وہ بہت معصوم ہے۔''

''اخبار گھر گھر جا رہا ہے۔ بہت بدنامی ہوگی سعد ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔'' رحمان نے دبے الفاظوں میں اسے جتایا تھا۔

''رحمان تم کسی طرح پتا چلاؤ کے اجالا تھانے میں ہے؟ ہم لاہور چلتے ہیں اس کی ضمانت کروا دیتے ہیں پھر ہی اصل حقائق سامنے آئیں گے۔'' رحمان چاہ رہا تھا کہ بدنامی و رسوائی کے خوف سے سعد چپ کر کے گوشہ نشین ہو کر بیٹھ جائے مگر سعد کو ابھی صرف اجالا کی جان کی عزت کی سلامتی کی فکر تھی کون کیا کہہ رہا تھا اسے کوئی سمجھ نہیں آرہی تھی۔

''سعد ہم چلتے ہیں لاہور، تم پریشان مت ہو مگر یار ایک حقیقت تسلیم کرلو کہ اجالا کا اس فاروق نامی شخص سے گہرا تعلق ہے وہ خود اس کے گھر سے گئی ہے۔ اپنی مرضی سے، رائمہ بھابی کو شاید پتا ہو۔''

''رائمہ، رائمہ۔'' سعد نے با آواز بلند اسے پکارا وہ بھاگی چلی آئی۔

''اجالا کا فاروق سے کوئی تعلق تھا کیا وہ اس سے ملتی رہی ہے دیکھو تمہیں میرے سر کی قسم جھوٹ مت بولنا۔'' سعد نے اسے شانوں سے پکڑ کر کہا رائمہ کا سر جھک گیا۔

''جی ان کی دوستی تھی فون پر بھی بات کرتے تھے وہ اس سے ملتی تھی کہ نہیں یہ مجھے نہیں پتہ۔''

''سعد اجالا خود اپنی مرضی سے لاہور گئی ہے۔ یہ تو ظاہر ہوگیا۔ رحمان نے کہا۔

''مان لیا یہ سب مان لیا مگر پھر بھی میرا دل نہیں مانتا، اجالا گھر سے بھاگ جانے والا اتنا بڑا سنگین قدم نہیں کبھی نہیں اٹھا سکتی۔ وہ سعد مرتضی کو

اتنا بڑا دکھ نہیں دے سکتی۔'' سعد چیخا تھا پھر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا کر بے چارگی سے رو دیا اس کی انگلیاں خون سے تر ہو چکی تھیں۔اس کا سر دیواروں سے ٹکرانے کی وجہ سے جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔اس کی شرٹ خون سے داغ دار ہو چکی تھی مگر وہ روئے جا رہا تھا رائمہ دیوار پار رو رہی تھی اپنے محبوب شوہر کی ایسی حالت دیکھ کر اس کا دل کٹ رہا تھا۔اس گھر کی عزت خطرے میں تھی سکون کیسے آ سکتا تھا۔

رحمان کو سعد نے پتا کرنے کا کہا تھا رحمان کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے اس نے اپنے کسی بے حد قریبی دوست کو فون کر کے اجالا کو تھانے سے لے جانے کا کہا تھا وہ اس کا دوست اجالا کو تھانے سے لے گیا تھا اب وہ اپنے آبائی گھر اجالا کو لے گیا یہ پشاور کا کوئی علاقہ تھا جہاں تا حد نظر پتھر ہی پتھر نظر آتے تھے۔

سعد اور رحمان جب لاہور پہنچے کوئی اجالا کی ضمانت کروا کر لے گیا تھا۔ضمانت کروانے والا کون تھا کسی نے کچھ نہیں بتایا تھا۔سعد کی بے بسی رحمان کے جلتے دل پر سکون اتار رہی تھی۔وہ سعد کو یوں ہی تڑپتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔وہ اسے اذیتیں دے دے کر مارنا چاہتا تھا۔

رحمان بزدل مرد سعد کی پشت پر وار کر کے لطف اندوز ہو رہا تھا۔منافق دھوکے باز احسان فراموش۔سعد لاہور کی سڑکوں پر دیوانوں کی طرح روتا پھر رہا تھا۔اجالا کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔اجنبی شہر غیر لوگ، کون تھا یہاں اپنا۔ جو اپنے تھے انہوں نے ڈس لیا تھا ساری خوشیوں کو چاٹ لیا تھا برباد کر دیا تھا۔سعد کے آشیانے کا تنکا تنکا بکھیر دیا تھا۔

☆......☆......☆

اس گھر میں عورتیں بھی تھیں بچے بھی تھے مرد بھی تھے مگر کوئی اجالا سے ہم کلام نہیں ہوتا تھا ایک نوعمر سی لڑکی اجالا کے پاس کھانا رکھ جاتی اور خود باہر چلی جاتی تھی۔

''میں نے سعد بھیا سے دھوکا کیا تو کیا ملا مجھے، عمر بھر ذلت رسوائی، میں خواہشوں کے گرداب میں الجھی کہاں بھٹکتی پھر رہی ہوں۔خواب دیکھنے کی یہ سزا ہے کہ میری آنکھیں بنجر ہو گئیں میں نے کیوں بھروسہ کیا فاروق پر، کیوں گھر سے نکلی کہ واپسی کے راستے نہیں مل رہے ہیں بہت بری ہوں۔میرے اللہ میں اندھیروں میں بھٹک رہی ہوں میں کیا کروں میری رہنمائی فرما میرے حال پر رحم فرما میری حفاظت فرما۔'' اجالا نے وضو کر کے نماز پڑھی دعا مانگی تھی۔

اجالا اپنے کمرے سے باہر نکلی دبے پاؤں چلتی وہ آگے بڑھنے لگی یہ بہت بڑا گھر تھا وہ گھر کے اندر چکراتی رہی گھر کے اندر اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

''یہاں سے بھاگ جاتی ہوں۔'' ایک خیال کوندے کی مانند اس کے ذہن میں لپکا اور وہ چوکنا نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی لوہے کا بڑا سا پھاٹک ادھ کھلا تھا اجالا کا تنفس تیز ہو گیا۔وہ جلدی سے باہر نکلی اور پہاڑوں سے نیچے اترنے کا راستہ ڈھونڈنے لگی مگر اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ راستہ کیسے ڈھونڈے تبھی اس کے پیچھے آوازوں کا شور ابھرا تھا۔دو صحت مند پٹھان عورتیں اپسے قہر آلود نظروں سے گھورتی نجانے اپنی زبان میں کیا کہہ رہی تھیں دونوں نے اسے دبوچا اور لا کر بیڈ پر پٹخ دیا۔وہ رو رو کر کہتی رہی مجھے جانے دو مگر ان کو کون سا سمجھ آتی تھی یا سمجھ آتی

بھی تو کون سا انہوں نے اسے چھوڑ دینا تھا اجالا نے رورو کر آنکھیں سجالیں تھیں کھانا اٹھا کر پھینک دیا۔ ایک مجرمانہ سا احساس اجالا کی رگیں کاٹ رہا تھا۔ محبت کرنے والے بھائی کو دھوکا دینے کا احساس۔ اس عشق کے ہاتھوں وہ برباد ہوگئی گمراہ ہوگئی۔ جس نے اسے ذلت کی پستیوں میں گرادیا۔ فاروق کی اصلیت اتنی کریہہ ہوگئی اس کی آنکھ میں سجے خواب کی ایسی تعبیر، اسے خود سے گھن آرہی تھی۔

''مجھے نفرت ہے تم سے فاروق، تم نے میرے دل سے میرے جذبات سے کھیلا ہے۔ محبت تمہیں معاف نہیں کرے گی، تم مجرم ہو تم محبت کے گناہ گار ہو، میں تمہاری تلاش میں بھٹک گئی۔ اجالوں سے اندھیروں میں کھوگئی تمہارا گناہ چھوٹا نہیں ہے۔ میری عزت کی دھجیاں بکھر گئیں میں دربدر ہوگئی۔'' اجالا کی روح کو جیسے اس انکشاف نے زخمی کر ڈالا تھا۔ اس کی روح جسم میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اس کا ہر ہر عضو زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جیسے بلبلا رہا تھا۔

''محبت کو تماشا بنانے والوں کو محبت معاف نہیں کرتی، یاد رکھنا فاروق تمہیں بھی محبت معاف نہیں کرے گی۔'' وہ اکیلی پھنکار رہی تھی۔ سلگ رہی تھی۔ اس کے حواس ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس دن محبت نے اجالا کے دل میں آخری ہچکی لے کر دم توڑ دیا اس کے شہر دل پر بھیانک رات اتری تھی محبت کو کسی بھوت نے نگل لیا تھا۔ اس کی آتی جاتی سانسیں پشیمانی وندامت سے بوجھل تھیں، وہ ان سانسوں سے نجات چاہتی تھی۔ اس کی بنجر آنکھوں میں رتجگوں کے عذاب اتر آئے تھے۔

☆......☆......☆

''مجھ سے شادی کرلو۔'' رحمان نے کہا۔

''بکواس بند کرو، تم گھٹیا انسان دشمن۔'' اجالا بھوکی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹ پڑی وہ اسے مار مار کر بے حال ہورہی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی واویلا کررہی تھی۔ رحمان ساکن تھا اسے ابھی اجالا سے بہت کام تھے جو نکاح کے بغیر ممکن نہیں تھے۔ بات اگر جسم حاصل کرنے کی ہوتی تو وہ بغیر اجازت کے بھی حاصل کرسکتا تھا۔ مگر وہ تو بہت ساری خواہشوں کا جہنم دھکا کر بیٹھا تھا۔ اسے دولت چاہیے تھی دنیا چاہیے تھی۔ عیش وعشرت چاہیے تھی۔ اسے اس کی حاسد فطرت سب کچھ چھین لینے پر اکساتی تھی۔

''اجالا مجھ سے شادی کرلو یہی تمہارے لیے بہتر ہے شکر ادا کرو میں تمہیں عزت کے ساتھ اپنی زندگی میں شامل کررہا ہوں۔'' رحمان نے اجالا کے ہاتھوں کو چھوا۔ اجالا نے نفرت سے ہاتھ جھٹکے۔

''نفرت ہے مجھے تم سے۔''

''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تمہاری محبت یا نفرت سے۔'' وہ مسکرایا۔

''میں تھوکتی ہوں تمہاری شکل پر۔'' وہ زہر خند لہجے میں چلائی۔

''مجھے اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ اسے تپا رہا تھا۔

''میں خود کو مار ڈالوں گی۔ میری برداشت میرے دکھ سے ہار گئی تھی۔ میرا روم روم اذیت میں جکڑا ہوا ہے۔ اس آبلا پائی کے سفر میں زخموں سے چور چور ہوں بہت بے سکونی ہے۔

''تمہیں کس نے اختیار دیا کہ تم اپنی جان لو۔'' رحمان خباثت سے ہنسا۔

''میری جان ہے۔'' وہ دھاڑی۔

''نہیں میری جان ہے۔'' رحمان ذومعنی لہجے میں بولا اجالا نے تلملا کر دانت کچکچائے۔
''تمہیں کیا ملا ہمیں برباد کر کے۔
''سب کچھ، دولت سکون۔''
''تمہیں کبھی سکون نہیں ملے گا۔ رحمان تم حاسد ہو۔ تم نے ہماری خوشیوں کو آگ لگائی ہے۔ ہماری ہنسی بستی زندگی اجاڑی ہے۔'' وہ ایک بار پھر جھپٹ پڑی تھی اس پر۔
''بہت لمبی پلاننگ کی ہے میں نے اور بہت انتظار کیا ہے بات اگر صرف تمہاری ہوتی تو جس دن میری مہندی کی رات تھی اسی دن میں تمہیں لوٹ لیتا اس دن لگ بھی تو بہت آفت رہی تھی۔ بہت عرصے سے میری نظریں تم پر لگی ہوئی تھیں۔ مگر میں سعد کا اعتماد نہیں کھونا چاہتا تھا۔ اور اس کی نازوں پلی لاڈلی بہن یہاں رو رہی ہے مجھے بہت سکون ہے۔''
''اللہ دیکھ رہا ہے تمہارے جیسے بے ضمیر بد کردار انسان کی کرتوتیں۔''
''کہاں ہے اللہ کہاں سے دیکھ رہا ہے۔'' وہ کفر بک رہا تھا خود کو خدا سمجھ بیٹھا تھا۔''
''اللہ سب دیکھ رہا ہے تمہارا ظلم تمہاری درندگی تمہاری سرکشی و بے رحمی سب دیکھ رہا ہے اللہ میرا درد میری تکلیف میری آنکھ سے نکلا ایک ایک آنسو دیکھ رہا ہے، مت بھولو کہ خدا دیکھ رہا ہے میری نیت کو بھی، تمہارے دھوکے کو بھی۔''
''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب میری پلاننگ کا اگلا حصہ سعد اور رائمہ کی موت ہے۔'' اس نے بہت آرام سے کہہ کر اجالا کی ہستی ہلا دی تھی۔ وہ فق ہوتے چہرے کے ساتھ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ کوئی شخص اتنا ظالم و جابر بھی ہوسکتا ہے۔ جو خدائی فیصلوں کو اپنے ہاتھ میں لے لے دوسروں کی زندگی موت کے فیصلے کرنے لگے۔
''تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' اجالا کی آواز کسی گہرے کنویں سے نکلی تھی۔
''میں ایسا ہی کروں گا۔'' وہ بولا پھر ذرا توقف سے دوبارہ بولا۔
''مجھ سے شادی کر لو تو سعد اور رائمہ کی زندگی بخش دوں گا۔'' وہ سب فیصلے کیے بیٹھا تھا۔
''مجھے منظور ہے۔'' اس کی سانس کی ڈوری جیسے ٹوٹ رہی تھی۔

☆......☆......☆

ان کا نکاح ہو گیا وہ ایک زندہ لاش تھی۔ جو اب رحمان کے دسترس میں تھی رحمان نے اس کو حاصل تو کر لیا لیکن وہ اندر سے بالکل مر چکی تھی۔ اس کا دل اس کی روح مردہ ہو چکے تھے۔ وہ شدید بیمار پڑ گئی۔ رحمان آتا جاتا رہتا تھا۔ اجالا کا علاج گھر پر ہی ہو رہا تھا۔
دوسری طرف رحمان نے موقعہ پا کر سعد کی گاڑی کی برک فیل کر دیے اسی دن سعد رائمہ کے ساتھ باہر نکلا اور ایک بہت بڑے حادثے کا شکار ہو کر رائمہ سمیت جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔
رحمان سوگوار و غم زدہ تھا۔ چالیس دن تک وہی آئے گئے کو دیکھتا رہا۔ تعزیت کرنے والے اجالا کا ذکر نکال کر بیٹھ جاتے اور رحمان خوب نمک مرچ لگا کر بات بتاتا۔ سب لوگ کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کرتے۔
رحمان نے دھونس سے دھمکی سے اجالا سے جائیداد کے کاغذات پر دستخط کروا لیے تھے۔ اب وہ سعد مرتضی کی ساری جائیداد کا مالک بن چکا تھا۔ اور وہ بہت شادان و فرحان تھا۔
ابھی اس کو ہنسی آرہی تھی کیونکہ جو اس نے چاہا تھا وہ پا لیا تھا۔ وہ اپنی چال کے چلنے پر خود کو

عقل کل سمجھتے ہوئے اپنے ہی شانوں پر تھپکی دے رہا تھا۔ اپنے ہم نفس فریبی کو داد دے رہا تھا۔

مگر بھول بیٹھا تھا کہ زندگی بہت ناپائیدار چیز ہے سانسوں کا تسلسل زندگی ہے اور سانسوں کا تھم جانا موت ہے دینا اتنی بے وفا ہے کہ خوبصورت گھروں کے مالکوں کو، اتنی آسائشوں اور آرام کے عادی ہینڈسم مردوں کو، اعلیٰ تعلیم یافتہ حسیناؤں کو ایک گڑھے میں اتار آتی ہے، اس مرنے والے کے اپنے پیارے اپنے ہاتھوں اسے قبر میں اتار آتے ہیں حسن وذہانت، چال ومکاری، سب منوں مٹی تلے دب جاتی ہے۔ سب اس گڑھے میں چھپ جاتے ہیں۔

قبر کے بارے میں فرمان ہے کہ'' وہ یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا پھر جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔'' عارضی سی زندگی کے لیے اپنے اصل کو بھول جانا کہاں کی دانشمندی ہے۔

''کاش دوسروں کو تباہ کرنے کی کوششیں کرنے والے یہ سمجھ لیں۔''

☆......☆......☆

سعد اور رائمہ کو مرے ہوئے دو ماہ ہو گئے تھے۔

رحمان آج بھی بہت دنوں کے بعد اجالا کے پاس آیا تھا۔ اور وہ اجالا کے پاس بیٹھا تھا۔ اجالا کو خبر نہیں تھی کہ سعد اور رائمہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

اجالا اداسی وسوگواری کا مجسمہ لگ رہی تھی۔ رحمان نے اس کا خوبصورت موی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ اجالا کا تابندہ حسن، اس کا سفید گلابی مخملیں سراپا دیکھ کر رحمان کا دل جیسے اس کے بس میں نہ رہا اس کی قربت اجالا کو بے پناہ اذیت سے دو چار کر رہی تھی۔ اس کے ساحرانہ نقوش اپنے اندر دل موہ لینے والی کشش رکھتے تھے۔

''میرے خدا مجھے قرار دے دے۔'' ناپسندیدہ مرد کی قربت سے بڑا آزار اور کیا ہوگا۔

'' میرے خدا مجھے نجات کا راستہ دے دے۔ مجھے سکون کے انمول لمحے دے دے۔'' وہ لاچار تھی بے بس تھی کیا کر سکتی تھی۔

اجالا خاموش کیوں ہو ملکہ عالیہ تم بہت حسین ہو گلابوں کا سا گداز، یہ گلابی چمکتا سراپا، آہ بس مجھے تو مدہوش ہی کر ڈالتا ہے۔''

''اجالا اتنی سرد کیوں ہو، میری طرف دیکھو۔'' وہ اس کے احساسات سے بے خبر اپنی ہی ذات میں مگن تھی۔

اجالا نے نگاہیں اٹھائی تھیں اور گویا اس کی نظر رحمان کے چہرے سے چپک کر رہ گئی۔ اجالا کا سارا اعصابی نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اجالا کے احساسات ایسے تھے کہ زبان لفظوں کی ادائیگی سے لاچار ہو گئی تھی۔

پھر اس کے سرد وجود نے نفرت بھری پھریری لی اگلے ہی لمحے وہ پاگلوں کی طرح رحمان پر جھپٹ پڑی۔

''بتاؤ مجھے کیا بولوں درندے شیطان، میری بربادی کے ذمے دار تم ہو۔ سفاک بے رحم بھیڑیے میرا سب کچھ ختم کر دیا میری وفا میری آبرو کو داغدار کرنے والے ذلیل انسان، تو نے کھیل کھیلا اور مجھے سر تا پا لوٹ لیا۔ تو حیوان ہو۔'' وہ اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ وہ اسے نوچ رہی تھی۔ اس کا سانس دھونکی کی مانند چل رہا تھا۔ اجالا کی رگوں میں جیسے آگ بسنے لگی تھی اس کی آنکھیں نجانے کیسی وحشت سمیٹ لائی تھیں۔

'' کیا کر رہی ہو۔'' رحمان نے اس کے

دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔
''تم نے مجھے گھر سے بے گھر کیا مجھے اپنی بے روائی بے سائبانی اور بے وقعتی کا دکھ کہتا ہے میں تمہاری جان لے لوں، میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔'' وہ پھر ایک بار اپنے ہاتھ چھڑانے لگی۔
''کیا کرلوگی تم۔'' رحمان نے اب ایک ہاتھ سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے زناٹے دار تھپڑ اجالا کے گال پر مارا وہ درد سے کراہ اٹھی اور زیادہ طاقت صرف کر کے اپنے ہاتھ چھڑوانے لگی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں پاگل ہو رہی تھیں۔
تمہارا وہ حال کروں گی کہ تم ساری زندگی یاد رکھو گے۔''
''کس سے میرا حال برا کرواؤ گی مجھے عبرتناک سزا دلواؤ گی، اپنے سعد بھیا جسے قبر میں سوئے ہوئے دو ماہ ہوگئے۔ الفاظ تھے کہ انگارے، جیسے کسی نے منوں تیزاب اجالا کر اوپر پھینک دیا تھا۔ جیسے کہیں بجلی گری تھی۔ اور سب کچھ جل کر کاکستر ہو گیا تھا۔ ذہنی ہیجان وخلجان کی انتہا یہ تھی وہ سرنفی میں ہلاتے ہوئے اپنے بال نوچ رہی تھی اس پر عجیب کربناک سی دیوانگی طاری تھی۔ رحمان جا چکا تھا اور اگلے دن ہی اس لڑکی نے طلاق کے کاغذات اجالا کو تھمائے جو اس کے کمرے میں آتی جاتی تھی۔

پرانی باتیں، پرانی رسمیں سب پلٹ رہی ہیں
تم اس گھڑی سے ڈرو کے جب تم بھی سر جھکائے
قطار شہزادگان شہر وفا میں بے بس کھڑے ہو لیکن
وہ شہر الفت کی شاہزادی
وہ خواب یادوں کے نرم پھولوں پر پاؤں رکھتی
ہتھیلیوں پر گلاب زخموں کی سرخ کلیوں کے ھار لے کر
تمام تر حسن تمکنت سے
قطار شہزادگان شہر وفا کی جانب بڑھے تو لیکن
تمہارے آگے سے ایسے گزرے
تمہاری آنکھیں سوال کرنا بھی بھول جائیں
تم اس گھڑی سے درو کہ جس دم
وہ شہر الفت کی شاہزادی
تمہیں دکھا کر، تمہارے ہوتے
فقیر راجہ کو اپنی چاہت کا ہار پہنائے اور
تمہاری یہ خشک آنکھیں
سوال کرنا بھی بھول جائیں

''اللہ......'' اجالا کے دل سے درد بھری پکار ابھری تھی۔
''فاروق تمہیں 'محبت' معاف نہیں کرے گی۔
''رحمان اللہ دیکھ رہا ہے۔''
اجالا کومے میں جانے سے پہلے آسمان کی طرف نگاہ کر کے صدا دی تھی۔

☆......☆......☆

تین ماہ بعد جب وہ ہوش کی دنیا میں لوٹی تو وہ رحمان کے گھر میں تھی۔ خالہ کے گھر تھی وہ گم صم سی خالی خالی نظروں سے اردگرد دیکھا کرتی نجانے کب کا اس کا بی اے کا رزلٹ آچکا تھا۔ رحمان نے پی ٹی سی کی بنیاد پر خود ہی اس کی نوکری لگوا دی تھی۔ ساتھ ہی خالہ کو تائید کی تھی کہ سائے کی طرح اجالے کے ساتھ رہے۔
خالہ اسے اسکول چھوڑنے جاتی تھی۔ شروع شروع میں فاخرہ کا دل پڑھانے میں نہیں لگتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ اسے بچوں کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگنے لگا۔

''خالہ وہ مجھے اپنے گھر جانا ہے۔'' ایک دن اسکول سے واپسی پر فاخرہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''کیوں وہاں کیا رہ گیا، تمہاری آوارگی نے سب کچھ تو اجاڑ دیا۔''

''میرا بھتیجا بھتیجی ہے وہاں۔''

''کوئی نہیں ہے وہاں، ذرینہ چلتر گھر سے بھاگ گئی جاتے ہوئے بچے بھی لے گئی۔''

''کہاں گئی زرینہ۔''

''مجھے کیا پتا بی بی، تم بھاگنے سے پہلے مجھے بتا کر گئی تھی جو وہ بتا کر جاتی۔''

''خالہ میں گھر سے بھاگی نہیں تھی۔''

''مجھے صفائیاں دینے کی ضرورت نہیں ہے سارا زمانہ تم جیسی آبرو باختہ پر تھو تھو کر رہی ہے جو اپنے بھائی بھابی کو کھا گئی ہنستا بستا گھر ویران کھنڈر بن گیا۔'' خالہ نے اس کی پسلی میں ٹھوکا دیا۔

فاخرہ نے کسی کو بھی دوبارہ صفائی پیش نہیں کی تھی وقت اور حالات ایسے تھے کہ کوئی اس کا یقین نہیں کر رہا تھا۔

اس کا کہا ہر لفظ جھوٹا ڈرامہ لگتا تھا ان لوگوں کو بھی کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان سچا ہوتا ہے مگر وہ اپنی سچائی ثابت نہیں کر پاتا رحمان نے وقت کی بساط پر ایسی چال بچھائی تھی کہ فاخرہ کے تو سارے مہرے پٹ گئے تھے۔ وہ بری طرح مات کھا گئی۔

عائشہ بھابی طنز کے تیروں سے فاخرہ کا جگر چھلنی کرتی رہی۔ لبنیٰ اسے دیکھ دیکھ کر آنسو بہاتی رہتی۔

ایک دن جب خالہ وہ عائشہ ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی تھیں تب لبنیٰ اور وہ گلے لگ کر بہت روئیں۔

''اجالا......''

''پلیز لبنیٰ مجھے اجالا مت کہو میں سعد کی اجالا تھی مجھے نفرت ہے اس نام سے جس نے میرے بھیا کی زندگی نگل گئی، مجھے خود سے نفرت ہے۔'' فاخرہ پہلے دن سے لے کر آخر تک کی ساری کہانی لبنیٰ کو سناتی چلی گئی لبوں پر ہاتھ رکھے لبنیٰ روتی رہی۔

''رحمان بھائی اتنے گھٹیا ہو سکتے ہیں مجھے یقین نہیں آ رہا، ایسی بے رحمی و سفاکی کا مظاہرہ، میں فرقان کو بتاؤں گی۔''

''اس سے کیا ہوگا لبنیٰ، جو ہماری بربادی ہوئی تھی وہ تو ہو چکی، میرا ماں جایا سعد کبھی واپس آئے گا نہیں کبھی نہیں۔''

میں ہوں قاتل اپنے بھائی اور بھابی کی۔''

''رحمان بھائی نے گھر آ کر بتایا تھا کہ سعد بھیا نے گلے میں پھندا ڈال کر خود کو پنکھے سے لٹکا لیا تھا مگر رحمان نے بر وقت دیکھ لیا تھا اور ان کے گلے سے پھندا نکالا تھا سعد بھیا کی گردن پر زخم آ گئے تھے رائمہ بھابی ڈرائیور کے ساتھ سعد بھیا کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جا رہی تھیں کہ بریک نہ لگ سکی اور یہ خوفناک جان لیوا حادثہ ہو گیا اور وہ تینوں موقع پر ہی دم توڑ گئے۔'' لبنیٰ روتے ہوتے بتا رہی تھی۔ اور فاخرہ کے ذہن میں ایک ہی بات آ رہی تھی اور بار بار آ رہی تھی۔

''لبنیٰ میرے بھائی اور بھابی کو بھی رحمان نے مارا ہے وہ قاتل ہے خونی ہے۔'' ایک بار پھر اس کی آنکھیں خون رو رہی تھیں۔ اس کے بدن کے ریشے ریشے سے جان نکل رہی تھی۔

''اس نے ضرور گاڑی کے اندر کچھ ایسا کیا ہے کہ گاڑی رک نہیں سکی اگر ایسا نہ ہوتا تو رحمان کی سعد بھیا کے ساتھ ہمدردی کا ڈھونگ جہاں

بھی چلتا وہ ساتھ جاتا مگر نہیں......"
"مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا فاخرہ۔" لبنیٰ ہچکیاں بھر رہی تھی۔
"مجھے بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔" وہ بڑبڑائی۔

☆......☆......☆

چھٹی کی کوئی سندیس
جانے وہ کون سا دیس
جہاں تم چلے گئے

فاخرہ روز اس شیشوں والے ڈبل اسٹوری گھر کے سامنے رک جاتی تھی۔ جہاں اس نے کبھی پرنس کی طرح وقت گزارا تھا بے پناہ خیال رکھنے والا، ٹوٹ کر چاہنے والا، دیوانگی کی حد تک محبت کرنے والا سعد مرتضیٰ کی محبت نے اجالا کو اعتماد کے ساتھ ایک تمکنت اور شششان بھی بخشی تھی لہجے کی کھنک سننے والے کو متوجہ کرتی تھی کیسی مکمل پرسکون زندگی تھی۔

"چل دفع ہو آگے لگ، اتنی اچھی ہوتی تو اپنے یار کے ساتھ بھاگتی کیوں۔" خالہ روزا سے لعن طعن کرتی تھی وہ پھر بھی روز اس گھر کے آگے رُکتی ضرور تھی۔

رحمان نے آخری چال کے طور پر فاخرہ کا نکاح زمان کے ساتھ کر دیا فاخرہ کو واویلا مچانا چاہیے تھا۔ مگر وہ چپ رہی اب طنز کرنے والوں میں زمان بھی شامل ہو گیا تھا۔ فاخرہ خود اذیتی کا شکار تھی۔ اسے لگتا کہ وہ اسی قابل ہے کہ اس کے ساتھ اتنا برا سلوک کیا جائے فاخرہ نے اس عرصے میں جیسے تیسے ایم اے اردو بھی کر لیا تھا۔ اس کی تنخواہ میں اضافہ ہو گیا رحمان اور فرقان اس گھر کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔

امن، صبا، فضا نے فاخرہ کی درد کی داستان سنتے ہوئے رو رو کر آنکھیں سجالی تھیں۔

"آپ بہت عظیم ہیں آنٹی۔"

"مما مجھے فکر ہے کہ آپ جیسی صابر عورت میری ماں ہے۔" صبا اور فضا اٹھ کر فاخرہ کے گلے لگ گئیں وہ اپنی اولاد کی نظروں میں معتبر تھی سرخرو تھی، وہ سب سے زیادہ اپنی اولاد کی نظروں میں گرنے کے خوف میں مبتلا رہی تھی اور اس نے بہت دعائیں مانگی تھیں اور آج یقین کا دن تھا کہ فاخرہ کی دعائیں اللہ کے ہاں مستجاب ٹھہری تھیں۔

"مما آپ نے اتنے دکھ جھیلے ہیں اتنا صبر کیا۔" صباء نے فاخرہ کے ہاتھ چوم لیے یہ عقیدت کا اظہار تھا۔

"مجھے 'صبر' نہیں آتا تھا مجھے سکون بھی نہیں ملتا تھا پھر مجھے صبر کرنا کیسے آ گیا میں زار و قطار روتی تھی مجھے کوئی چپ نہیں کرواتا تھا روتے روتے میری ہچکی بندھ جاتی تھی۔ مجھے اللہ نے بچپن سے جوانی تک اتنا نوازا کہ کچھ مانگنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی، مجھے نہیں پتا تھا کہ مانگا کیسے جاتا ہے، پھر مانگتے مانگتے مجھے مانگنا آ گیا، میں نے سکون مانگا صبر مانگا اولاد مانگی، اولاد کے لیے ہدایت مانگی، مجھے سب مل گیا مجھے قرب الٰہی مل گیا بیٹا میں شانت ہو گئی میج دنیا کی فکروں سے آزاد ہو کر اپنے رب کی یاد میں گم رہنے لگی اللہ نے مجھے سوخرو کر دیا وہ شان کریمی وہ بزرگی والا اللہ میرا رازداں اللہ اس نے مجھے مالا مال کر دیا۔"

"مما آپ نے اتنے دکھ اٹھائے۔" فضا رو دی۔

"لمحوں نے خطا کی تھی۔
صدیوں نے سزا پائی۔

"میری ماں نہیں تھی میرے لیے دعائیں کرنے والی ماں نہیں تھی جوان ہوتی بچیوں کی

ماؤں کو ان پر کڑی نگاہ رکھنی ہی چاہیے مگر اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے بیٹیوں کی کل امت مسلماں کی بیٹیوں کی عزتوں کی حفاظت کے لیے گڑ گڑا کر رو کر دعا مانگنی چاہیے تاکہ وہ کسی فاروق ترمذی کی لچھے دار گفتگو کی اسیر ہو کر در بدر ہونے سے بچ جائے کسی رحمان کے بھوکے نفس کا شکار ہونے سے محفوظ رہے۔'' فاخرہ کی گھٹی گھٹی سسکیاں فضا میں سوز بھرا ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔

☆......☆......☆

عروہ رحمان گھر سے بھاگ گئی۔ رحمان جیولر والے کی بیٹی گھر سے بھاگ گئی۔'' یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی تھی۔

عروہ جاتے ہوئے کروڑوں کی مالیت کا سونا بھی گھر سے لے گئی تھی۔ رحمان ابھی کل ہی تو سہو بازار سے کروڑوں کا سونا لے کر آیا تھا۔ رحمان کی اس خبر نے گویا کمر توڑ ڈالی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح عروہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ہر آنکھ اسے اپنے اوپر ہنستی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ لوگوں سے نظریں چراتا پھر رہا تھا۔ بدنامی و رسوائی نے اس کا طنطنہ اس کا سارا دم خم کر دیا تھا وہ دیواروں سے سر پھوڑ رہا تھا۔ رحمان لہولہان ہو گیا آج نجانے کیوں رحمان کی نظروں کے سانے بار بار سعد مرتضیٰ کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ آ رہا تھا۔ رحمان جھنجھلا کر سر جھٹکتا مگر سعد کا چہرہ تو جیسے رحمان کے سامنے سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔

فرقان اور لبنیٰ ان کی دلجوئی کر رہے تھے لیکن ایسے موقعوں پر طفل تسلیاں کہاں زخموں پر مرہم کا کام کرتی ہیں لبنیٰ کو رہ رہ کر یاد آ رہا تھا کہ لبنیٰ نے جب جب فرقان کو بتانا چاہا تھا کہ رحمان نے فاخرہ کے ساتھ کیا کیا تھا تب تب فرقان نے لبنیٰ کو جھٹلایا تھا فاخرہ کو جھوٹا کہا تھا۔

رحمان پر ایک جنونانہ سی وحشت چھائی ہوئی تھی اس نے اپنا سر پھوڑ لیا تھا۔ سارے گھر میں اس کا خون بکھر رہا تھا مگر وہ تو جیسے پاگل ہو گیا تھا۔ عزت بھی نیلام ہوئی کاربار بھی ٹھپ ہو گیا۔

کسی دوسرے کی آنکھ سے آنسو ٹپکے تو درد کی لذت سے بھی وہی دل آشنا ہوتا ہے۔ جس کی آنکھ روئی ہو تو ہم تو محض تماشائی ہوتے ہیں اور جب آنسو ہماری آنکھ روئے تب ادراک ہوتا ہے کہ پہلے غم دل میں اٹھتا ہے سارے بدن میں پھیلتا ہے تب بے بس ہو کر آنکھ سے پانی بن کر بہتا ہے۔

رحمان کے گھر صف ماتم بچھی ہوئی تھی سارے میں بات پھیل چکی تھی۔ عورتیں بہانے بہانے سے کن سوئیاں لینے آتیں تھیں طرح طرح کی دل جلانے والی باتیں کرتیں عائشہ بھی تو ایسی ہی تھی مگر اب اسے یہ سب عورتیں زہر لگ رہی تھیں جو ہمدردی کی آڑ میں نشتر چبھوتی تھیں عائشہ کا بس نہیں چلتا تھا کہ گھر آنے والی ہر عورت کا ہاتھ پکڑ کر دھلیز کے پار چھوڑ آئے اور دھڑام سے دروازہ بند کر لے کسی کو اندر نہ گھسنے دے مگر زمانہ کا تو یہی چلن رہا ہے صدیوں سے۔

فروہ عائشہ کی ایک فون کال پر گھر آ گئی تھی مقام حیرت تھا۔ فروہ اور ایسی سعادت مندی۔ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کے گلے لگ کر خوب روئی تھیں۔ دونوں نے اپنی اپنی بھڑاس نکالی تھی۔ دونوں اپنے اپنے دکھ پر رو رہی تھیں۔ فروہ صرف اپنے دکھ پر تڑپ رہی تھی وہ رحمان کی بیٹی تھی جو صرف اپنے لیے جیتی تھی اپنے لیے روتی 'صرف' اپنے لیے ہی روتی تھی۔

فرقان نے ڈاکٹر کو گھر ہی بلوا لیا تھا۔ رحمان

کی مرہم پڑی کے بعد اسے نیند کا انجیکشن لگا دیا تھا۔ عائشہ رحمان کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی اسے ایک ایک کر کے اپنی کوتاہیاں یاد آ رہی تھیں۔ کیا بچوں کو پیدا کرنا ہی بہت بڑا کام ہے کیا ان کو ان کی مرضی پہ چھوڑ دیا چاہیے جو جی چاہے کرتے پھریں۔

اسے اپنی ساری لاپرواہیاں رلا رہی تھیں۔ بچوں کے حوالے سے ماؤں کی کتنی بھاری ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ بچے کہاں جاتے ہیں، کس سے ملتے ہیں ان کے دوست کون ہیں، عائشہ نے کبھی نہیں پوچھا تھا الٹا بچوں کے بے جا فرمائشیں پوری کر کے ان کے ناز نخرے اٹھا کر بگاڑ دیا۔

لڑکیاں کہاں جاتی ہیں کس سے فون پر بات کرتی ہیں کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی، کیا ماں ایسی ہوتی ہے ماؤں کو تو اپنی بچیوں کے اسکول و کالج بیگ چیک کرنے چاہیں ان کے موبائل دیکھنے چاہیے ان کے آنے جانے پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ مگر عائشہ نے ادھر اُدھر پھر کے بے کار وقت گزار دیا اولاد کب شتر بے مہار ہوگئی اسے خبر ہی نہیں ہوئی کیا مائیں اتنی گافل ہوتی ہیں اور جب خبر ہوئی تو سب لٹ چکا تھا خاک ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

امن نے فاخرہ کی باتوں سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ امن نے بھی اللہ سے لو لگا لی تھی۔ وہ پانچ وقت کی نماز پڑھتی اور رو رو کر اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی تڑپتی گریہ زاری کرتی اپنے لیے دعا کرتی اپنی مما کا دل صاف ہونے کی دعا کرتی۔ وہ جان چکی تھی کہ اس نے لاحاصل کی تلاش میں گھاٹا کھایا تھا وہ جانتی تھی کہ اس صبر سے اس کا غم چھپ جائے رحم مانگتی تھی اسے خدا کے آگے سجدہ ریز ہونا طمانیت بخشنے لگا یہ اس بات کی نشانی تھی کہ اللہ کو امن کی عاجزی وانکساری اس کی ندامت پسند آ گئی تھی۔

ہم تمام عمر اپنے سے منسوب لوگوں کو راضی کرنے میں لگے رہتے ہیں مگر ہماری ہزار ہا کوششوں اور جتنوں کے بعد بھی ہمارے اپنے ہم سے راضی نہیں ہوتے سب سے جلد اور آسانی سے مان جانے والی ذات باری تعالیٰ کی ہے اور ہم اسے ہی منانا بھول جاتے ہیں دنیا کمانے میں لگے رہتے ہیں اور جب سانس رکتی ہے تو اپنے گناہ یاد آتے ہیں آخرت کی تو کوئی تیاری ہی نہیں۔

فاخرہ نے امن کو بری طرح روتے دیکھا وہ جائے نماز پر دعا کی حالت میں تھی اس کا سارا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ فاخرہ کو امن پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

''آنٹی عروہ کا کچھ پتا چلا۔'' امن نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بیٹا! ابھی کچھ علم نہیں کہاں ہے لبنیٰ نے فون کیا تھا مجھے؟''

''مما ٹھیک ہیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے بس عروہ کی وجہ سے پریشان تھی۔''

''آنٹی آپ کیوں پریشان ہیں آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔''

''نہیں بیٹا! ایسا نہیں سوچتے، مجھے بہت دکھ ہوا ہے بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔''

''آپ کے ساتھ انہوں نے اتنا برا کیا حیوانوں جیسا سلوک، آپ کی ساری زندگی داؤ پر لگا دی۔''

وہ سب رحمان نے کیا، عروہ کا تو کوئی قصور نہیں ہاں یہ الگ بات ہے کبھی کبھی ماں باپ کی

کرنی اولاد کو بھگتنی پڑتی ہے۔'' فاخرہ ہولے سے بولی۔

''آنٹی آپ نے سعد انکل کے بچوں کو ڈھونڈنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔'' یہ سوال بہت دنوں سے امن کے دماغ میں کھلبلی مچارہا تھا مگر وہ فاخرہ کی دل آزاری کے باعث پوچھ نہ سکی۔

''امن بیٹا! میں زندگی میں کبھی اتنی بااختیار اور مضبوط نہیں رہی کہ ان کو ڈھونڈنے نکل سکتی میں خود کمانے والی عورت ہونے کے باوجود بھی اپنی کمائی خرچ نہ کرسکی نہ میرے پاس پیسا تھا نہ آزادی پھر میں کیا کرتی، ہاں ان کی زندگی کی خیروعافیت کی دعائیں بہت مانگتی رہی ہوں مانگتی رہوں گی خدا ان کو اپنے حفظ امان میں رکھے۔'' فاخرہ آبدیدہ ہوگئی۔

''آمین۔'' امن نے صدق دل سے کہا۔

☆......☆......☆

رحمان نشہ آور انجکشن کے باعث ابھی تک سورہا تھا۔ یہ انجکشن سکون بھری نیند کے لیے تھا عائشہ ہراساں سی ساری رات اس کی پٹی سے لگ بیٹھی روتی رہی تھی فجر کی اذانیں ہورہی تھیں۔ عائشہ نے نجانے کتنے عرصے بعد نماز پڑھی تھی دعا مانگی تھی اس کا دل گھبرارہا تھا۔

وہ دوبارہ رحمان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے دن چڑھ گیا۔ عائشہ نے فروہ کا دروازہ بجایا احتشان اور ریان کا دروازہ کھٹکھٹایا وہ دونوں بھائی اٹھ کر واش رومز میں چلے گئے تو عائشہ نے دوبارہ فروہ کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا وہ آنکھیں مسلتی جمائیاں لیتی اٹھی۔

''جی ......'' اس نے کڑے تیوروں سے عائشہ کو گھورا تھا۔

اٹھ جاؤ بیٹا! دن چڑھ آیا ہے۔'' عائشہ نے لجاجت سے کہا۔

''روز ہی دن چڑھتا ہے پہلے تو کبھی نہیں جگایا۔'' وہ کیسی قہر آلود نظروں سے دیکھ رہی تھی اور لہجہ کیسا تھا۔

''بیٹیوں کو دن چڑھتے تک نہیں سونا چاہیے، اچھا نہیں لگتا۔'' عائشہ آج اچھی ماؤں والی باتیں کررہی تھی وہ بدل گئی تھی تو ضروری نہیں تھا کہ فروہ بھی بدل جاتی۔

''اچھا......'' فروہ نے سوالیہ انداز میں اچھا لفظ کو طول دے کر کھینچا تھا۔

''ہاں جی بیٹا......'' عائشہ کو آج اس کا گستاخانہ انداز بہت چبھن دے رہا تھا۔ وہ گھر کی بڑی بیٹی تھی اسے خیال رکھنا چاہیے تھا احساس ہونا چاہیے تھا کہ اس کے والدین پر کیسی قیامت ٹوٹی ہے کیسی جگ ہنسائی ہوئی ہے مگر وہ تو الٹا تمسخر اڑا رہی تھی عائشہ کا دل ملال کی زد میں آ گیا۔

''ویسے مما کچھ جلدی خیال نہیں آ گیا کہ بیٹیوں کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں مگر آہ افسوس اب کیا فائدہ۔'' فروہ نے تنفر سے کہا اور دروازہ بند کردیا۔ فروہ کی بے حسی اسے پہلے تو کبھی ایسے محسوس نہیں ہوئی تھی۔ جیسے آج اور ابھی ہورہی تھی ایسے بے مروتی ایسی بے لحاظی، حد تھی خودغرضی کی۔

آہ عائشہ نے خود احتشام اور ریان کو ناشتہ بنا کردیا اپنی نگرانی میں کھلایا (نخرے کرکے کھاتے تھے) وہ دونوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی پیشانی تفکرات کی لکیروں سے پر تھی ٹرٹر کرتی زباب اب خاموش تھی۔ بچے اسکول جا چکے تھے۔ عائشہ برتن دھوتے سوچوں میں گم تھی سر تمام رات جاگنے کی وجہ سے گویا سر درد سے پھٹا جارہا تھا۔ عائشہ نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے

پیشانی مسلی۔

دو دن سے اس کے حلق سے کچھ نہیں اترا تھا۔ اتنی پریشانی میں کھانے پینے کا کسے ہوش تھا بھوک تو جیسے مر گئی تھی۔ عائشہ نے ایک کپ چائے بنائی بچوں کا چھوڑا ہوا سلائس کا ٹکڑا زہر مار کیا سر درد کی گولی نگلی اور چائے کا کپ اٹھائے پھر رحمان کے پاس آ گئی۔

رحمان کے چہرے پر نگاہیں ٹکائے عائشہ رو دی کیسے دو دن میں رحمان کا چہرہ اتر گیا تھا۔

''سعد......'' رحمان کے باہم پیوست ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ عائشہ خاموشی سے اسے تکتی رہی۔

''عروہ......'' عروہ کا نام ایک آہ کی طرح رحمان کے دل سے نکلا عائشہ کٹ کر رہ گئی یہ بہت بڑا داغ تھا۔ جو رحمان کی پیشانی پر سج گیا تھا۔ وہ یہ دھچکا سہہ نہیں پا رہا تھا۔ سنبھل کیسے سکتا تھا اس کی لاڈلی بیٹی نے تو اسے کسی سے نظریں ملانے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔

''رحمان......'' عائشہ نے ہولے سے پکارا رحمان نے آنکھیں کھول دیں رحمان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ عائشہ نے بے اختیار رحمان کی پیشانی کو چھوا وہ بری طرح بخار میں پھنک رہا تھا۔ عائشہ نے بے ساختہ رحمان کے گال اور گردن چھوئے اس کا دل دھک سے رہ گیا وہ اٹھی اور لبنیٰ کے گھر کی طرف بھاگی تاکہ فرقان کو بلا سکے۔ اب اور کون تھا جسے وہ بلاتی۔

عائشہ روتی کرلاتی گرتی پڑتی جب گھر واپس آئی تو فروہ کہیں جا رہی تھی۔ عائشہ نے ایک کٹیلی اور سرد نگاہ اس پر ڈالی مگر فروہ کی جانے بلا۔

وہ دروازے تک پہنچی تھی کہ انتہائی غصے کی حالت میں عائشہ نے اسے جا کر کندھے سے دبوچ لیا عائشہ کا انداز قہر بھرا تھا اس کی گرفت میں انتہائی طیش اور جارحیت تھی۔

''تمہارے بابا بیمار ہیں بخار میں بے سدھ پڑے ہوئے ہیں گھر میں اتنا بڑا حادثہ ہو گیا اور تمہیں کوئی پروا ہی نہیں۔'' عائشہ نے دانت پیستے ہوئے آواز آہستہ رکھی تھی۔

''تو......'' فروہ نے جواباً ایک جھٹکے سے اپنا کندھا چھڑا کر عائشہ کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔

''تو گھر میں رہو، جا کہاں رہی ہو، پہلے ہی لوگ تمہاری باتیں کر رہے ہیں اتنے عرصے گھر سے باہر اکیلی رہی ہو۔'' عائشہ کی آواز اب بھی دبی دبی تھی۔ (کاش عائشہ شروع سے ہی معاملا فہم ہوتی)

''کرنے دیں باتیں، مجھے کیا لینا لوگوں دینا لوگوں سے، اور عروہ تو گھر کے اندر رہتی تھی نا، باتیں تو آج اس کی بھی بنا رہے ہیں اب کیا کریں ان لوگوں کا۔''

''نہ جاؤ فروہ گھر رہو۔'' عائشہ کا درشت لہجہ اب پگھل کر نرمی بلکہ لجاجت میں ڈھل گیا تھا۔

''کام ہے مجھے، جلد آ جاؤں گی، بے فکر رہیں میں گھر سے نہیں بھاگوں گی۔'' اس نے در پردہ عروہ کا طعنہ دیا تھا کہ آپ اتنی باخبر ہوتیں تو عروہ گھر سے کیسے بھاگ سکتی تھی۔

عائشہ کی بیٹیاں ہاتھوں سے نکل گئی تھیں۔ سوائے ہاتھ ملنے اور رونے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔

فروہ سیدھی اریز چوہدری کے گھر گئی تھی۔ اس نے بیل بجائی تو چوکیدار باہر نکلا۔

''یہ اریز چوہدری کا گھر ہے کیا، مطلب ابرار چوہدری۔''

''جی ابرار چوہدری کا ہے۔''
''مجھے ملنا ہے ان سے۔''
''ٹھیک ہے میں پوچھ کر آتا ہوں۔''
چوکیدار واپس پلٹ آیا تھوڑی دیر بعد لوٹا اور فروہ کو اندر آنے کا اشارہ کیا فروہ کو یادوں نے گھیر لیا اس کی آنکھوں سے بے طرح آنسو بہنے لگے چوکیدار اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا۔ فروہ کچھ دیر ادھر اُدھر دیکھتی رہی۔

''جی کون ہو تم۔'' ایک پاٹ دار آواز قریب سے ابھری فروہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

''جج جی میں فروہ ہوں۔'' آپ کی طبیعت کیسی ہیں آنٹی۔''

''مجھے کیا ہوا تھا...... اور یہ آنٹی کس کو کہا تم نے جان نہ پہچان اور......'' وہ خاتون تو جیسے انگارے چبائے بیٹھی تھیں اللہ ایسے کڑے تیوروں سے بے چاری فروہ کا سر سے پاؤں تک نظروں کی نظروں میں پوسٹ مارٹم کیا کہ بس فروہ جیسی دیدہ دلیر لڑکی بھی پانی پانی ہو گئی۔

''وہ میں آپ کے بیٹے اریز کی دوست......''

''میرے بیٹے کا نام اریز نہیں نایاب لودھی ہے لڑکی، ویسے تم کس کی بیٹی ہو۔''

''رحمان احمد، رحمان جیولر والے۔'' وہ بھول گئی تھی اب رحمان جیولر والے کا نام اپنی آب و تاب کھو چکا تھا۔ اس خاتون نے کانوں کا ہاتھ لگا کر زمین کو ہاتھ لگائے پھر توبہ توبہ بے حیائی کی انتہاء کہتے ہوئے پھر کان پکڑ لیے۔

''ایک بیٹی سارا سونا پیسے گھر سے لے کر بھاگ گئی نجانے کدھر خوار ہو رہی ہے کہ موں جلی اور دوسری اپنے یار کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔'' نایاب کی مما نے پھر فروہ کی وہ بے عزتی کی گالی گلوچ کی دھکے دے کر اپنے گھر سے نکالا ہاتھ پکڑ کر اسے گھر سے باہر پھینک گئی جیسے وہ کوئی گندگی کی پوٹ ہو جسے کوئی لمحہ بھر بھی اپنے گھر میں رکھنا پسند نہیں کرتا فروہ روتی دھوتی اپنے زخم چاٹتی گھر لوٹی تھی آج پہلی بار اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہو گیا ہے گھر جانے سے پہلے اس نے ڈھیر ساری سلیپنگ پلز خریدی تھیں۔

☆......☆......☆

ایک دن فاخرہ لبنیٰ کے گھر آئی تو لبنیٰ نے خود ہی روتے ہوئے امن پر گزری ساری داستان فاخرہ کو سنا دی دونوں روتی رہیں پھر فاخرہ نے اسے بتایا کہ یہ ساری بات وہ پہلے سے جانتی تھی اسی لیے وہ امن کو اپنے گھر لے گئی تھی لبنیٰ فاخرہ کی ممنون تھی جس طرح اس نے امن کو لبنیٰ کو اور سارے گھر کو سنبھالا یہ اسی کا حوصلہ ظرف تھا۔

صغریٰ نے اپنے گھر فاخرہ کی دعوت کی تھی، فاخرہ پہلی بار ان کے گھر جا رہی تھی اس نے فروٹ اور مٹھائی خریدی بشیراں اور امن بھی ان لوگوں کے ساتھ جا رہے تھے۔ وہ بہاولپور کے کسی گاؤں میں رہتے تھے صغریٰ کا چھوٹا سا پختہ مکان تھا۔ صغریٰ اور نیہات بہت محبت سے ملے فاخرہ ،صبا، فضا، اسوہ اور اسد کے آنے پر ان سے اپنی خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی اور ان کو ایسا لگ رہا تھا جیسے فاخرہ نے گھر آ کر بہت عزت دی ہے اور امن کو دکھ کر بھی نیہات کو گونا گو سکون ملا تھا۔ اپنی پسندیدہ اپنی منظور نظر ہستی کو اپنے گھر میں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا کیسی بے خودی طاری کر دیتا ہے یہ آج نیہات کو پتا چلا تھا۔

بہت خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا تھا۔ صغریٰ سب کے لیے چائے بنا لائی۔

''اب ہم چلیں گے۔'' فاخرہ نے چائے کے

بعد کہا۔

''فاخرہ بہن مجھے آپ کو کسی سے ملوانا ہے۔''

تب ہی اچانک صغری نے کہا۔

''کس سے......'' فاخرہ نے اچھنبے سے اسے دیکھا۔

''ابھی آئی......'' صغری کمرے سے باہر نکل گئی پانچ منٹ بعد وہ واپس آئی تو اس کے ساتھ کوئی خاتون تھی جو لگ بھگ فاخرہ کی ہم عمر لگ رہی تھی۔

''پہچانا......'' وہ عورت قریب آئی اور فاخرہ سے پوچھا۔

''ہاں شکل جانی پہچانی لگ رہی ہے کون ہو تم......'' فاخرہ بولی۔

''زرینہ......''

''زرینہ......'' فاخرہ کا دل جیسے حلق میں دھڑ کنے لگا۔ اور آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

''ہاں میں......'' زرینہ فاخرہ کے گلے لگ کر رو دی تھی۔ سب ان کو دیکھ کر رو رہے تھے۔

''کہاں چلی گئی تھی تم......؟ اور بچے......''

''نیہات اور ضویا سعد صاحب کے بچے ہیں۔'' زرینہ کے الفاظ پر فاخرہ کو سکتہ سا ہو گیا وہ شاک کی کیفیت میں نیہات اور ضویا کو دیکھے جا رہی تھی کمرے میں موجود ہر ذی نفس کی کم و بیش یہی حالت تھی آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ بے یقینی بھی تیر رہی تھی۔

''پھپھو......'' سب سے پہلے نیہات نے ہی اس سکتے کو توڑا تھا اور فاخرہ کے گلے لگ گیا دونوں ایسے روئے کہ سب کو رلا دیا ان کے ملن میں محسوس کی جانے والی تڑپ تھی۔

''میں بھی کہوں کہ میرا دل ان بچوں کی طرف کیوں کھنچتا ہے مجھے ان میں اتنی کشش کیوں محسوس ہوتی ہے کہ میرا ہر ہر عضو میرے بدن کا رواں رواں ان کی طرف لپکتا ہے یہ تو خون کی کشش تھی جو مجھے مائل کرتی تھی۔'' فاخرہ فرط جذبات سے نیہات اور ضویا کو چومے جا رہی تھی۔

''ایک منٹ میرے بچوں میں دو نفل شکرانے کے ادا کرلوں اس اونچی شان والے اللہ کے حضور سجدہ کرلوں جس نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ میرے سعد کے بچوں سے ملوا دیا وہ رحمان نے رحیم ہے کریم ہے وہ میرا اللہ جس نے آسمان کو بغیر ستونوں کے کھڑا کر دیا تو وہ اللہ یہ معجزہ کیوں نہیں رکھ سکتا تھا۔'' فاخرہ روتی ہوئی وضو کرنے چلی گئی تو پیچھے سارے بچے روتے ہوئے ایک دوسرے سے ملنے لگے صبا جو رشتوں کے لیے اندر ہی اندر ترستی رہتی تھی کی محسوس کرتی تھی۔ اب مسکراتے لبوں روتی آنکھوں سے ضویا اور نیہات سے مل رہی تھی وہ جو پہلے ہی اپنے تھے اب تو بہت اپنے تھے تمام عمر کے لیے مل گئے تھے۔

فاخرہ کے آنسو رک ہی نہیں رہے تھے وہ بار بار نیہات اور ضویا کو گلے لگا رہی تھی چوم رہی تھی۔

''پھوپھو مجھے اور نیہات بھیا کو پتا تھا کہ آپ ہماری پھوپو ہیں اسی لیے ہم آپ سے اتنی عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔ نیہات بھیا صبا فضا سے اسی لیے محبت کرتے ہیں۔'' ضویا کی آواز رندھ گئی۔

''میرے سعد کے بچے میری جان میرا میکہ۔'' فاخرہ ہچکیاں بھرتے نیہات کے سر کو چوم رہی تھی وہ اونچا لمبا لڑکا چھوٹے بچوں کی طرح رو رہا تھا برسوں کے بچھڑے مل گئے تھے مگر برسوں کی تڑپ دنوں میں تو نہیں مٹ سکی تھی نا۔ اتنے سال دوری رہی تھی۔ اب اپنوں کا قرب ایک عرصے

بعد نصیب ہوا تھا۔

''زرینہ تم ان کو گھر سے لے کر کیوں بھاگی اور کہاں چلی گئی تھی میں اتنی مجبور و لاچار عورت کہاں ڈھونڈتی پھرتی زندگی کی تلخیوں اور صدمات نے مجھے بہت کمزور کر ڈالا تھا۔ میں نے کب زندہ لوگوں جیسی زندگی گزاری ہے زندگی نے مجھے گزارا ہے۔'' پھر فاخرہ اپنی روداد غم ان کو سنانے لگی ان کو سنانا ضروری تھا۔

اجالا میں نے رحمان کو کسی سے یہ ساری باتیں کرتے سن لیا تھا مجھے یہ بھی پتا ہے کہ سعد بھیا اور رائمہ کے قتل کا منصوبہ بھی اسی کا ہے وہ کسی سے کہہ رہا تھا وہ اب بچوں کو بھی مار دے گا میں نے سن لیا۔ ہم نے برسوں سے آپ کا نمک کھایا ہے جی اسی لیے میں ان معصوموں کو لے کر بھاگ کر شیخوپورہ اپنی پھوپھی کے پاس چلی گئی وہاں میں نے محنت مزدوری کر کے ان کو پالا بہت سال میں وہاں رہی جب نیہات نے میٹرک کر لیا تو میں اسے آپ کی سعد بھیا کی تصویریں دکھائیں اور اسے سب کچھ بتا دیا میں نے ان بچوں کی خاطر شادی نہیں کی، میں چاہتی تھی کہ یہ آپ سے ملیں۔ مجھے کسی نے بتا دیا کہ آپ یہیں پر ہو۔ کسی طرح میں نے ان کو یہاں بھیج دیا۔ صغریٰ میری خالہ زاد ہے شکر ہے میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔

''تم بہت عظیم ہو زرینہ تم نے بہت بڑا عمل کیا ہے بہت بڑا ظرف ہے تمہارا، میں یہ تمہارا احسان ساری زندگی نہیں اتار پاؤں گی۔ تم نے غیر ہو کر ہماری نسل کو بچا لیا جبکہ یہاں تو اپنوں نے ہی ہماری جڑیں کاٹ ڈالیں مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا میری زندگی کو تماشا بنا دیا۔''

''زرینہ میری بہن تمہاری محبت قرض ہے۔''

فاخرہ زرینہ کے گلے لگ کر رو دی۔

☆......☆......☆

رحمان کا بخار ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ عائشہ ہر وقت روتی رہتی لبنیٰ اور فرقان آجاتے تھے۔ رہی فروہ تو وہ نیند کی گولی لے کر سارے غموں سے آزاد ہو کر سوئی پڑی رہتی۔ جب بھی اس کی آنکھ کھلتی خیالات کے آوارہ بگولے اسے اڑائے پھرتے وہ ہوش میں آنا ہی نہیں چاہتی تھی کیونکہ ہوش میں آتے ہی اس کے خیالات کے سارے کنارے اریز سے جا ملتے تھے۔

رحمان کو انتہائی رنج و عالم اور افسردگی کی حالت میں رہنے کی وجہ سے شوگر ہوگئی تھی۔ وہ سوکھا کانٹا بن چکا تھا۔ فرقان اس کو غم سے نکالنے کے لیے تگ و دو کرتا رہتا اسے سمجھاتا کہ ''جو ہوا بہت برا ہوا مگر یوں ہمت مت ہارو، باقی اولاد کی طرف بھی دیکھو۔''

دو ماہ بعد رحمان گھر سے باہر نکلا تھا۔ بڑھی ہوئی شیو بڑھی ہوئی، کندھے جھکے ہوئے، چال میں کسی شرابی جیسی لڑکھڑاہٹ تھی وہ سر جھکائے آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے ہر نظر خود پر ہنستی ہوئی لگ رہی تھی وہ دو کانوں کا کرایہ لینے گیا تو وہاں روح فرسا انکشاف نے اس کی روح تک کھینچ لی کوئی اریز نامی لڑکا ساری دکانیں بیچ گیا تھا۔ جو عروہ اور فروہ کے نام تھیں۔ رحمان اشتعال سے یوں لرزنے لگا جیسے سوکھا ہوا پتا ادھر سے ادھر لڑھکتا پھرتا ہے۔ رحمان بینک گیا وہاں اس کے اکاؤنٹ میں ایک بھی دھیلا نہیں تھا اریز خالی چیک پر کر کے یہاں بھی اپنا کام دکھا چکا تھا۔ رحمان کے دماغ میں غم واندوہ کے جھکڑ چل رہے تھے۔

رحمان گھر آیا اور سیدھا فروہ کے کمرے میں

گھس گیا۔ اس نے فروہ کو روئی کی مانند دھک کر رکھ دیا۔

''اریز چوہدری کون ہے؟'' رحمان نے فروہ کو بہت مارا زخمی کر دیا اور فروہ الف سے ی تک بتاتی چلی گئی۔ رحمان ایک بار پھر اپنے بال نوچ رہا تھا دیواروں سے ٹکریں مار رہا تھا اب کی بار وہ بستر سے لگا تو اٹھ نہیں سکا جب بھی وہ فروہ کو دیکھتا چیخنے لگتا رونے لگتا عائشہ فروہ کو اس کے کمرے میں دھکیل دیتی۔ اس نفرت بھری زندگی سے تنگ آ کر ایک رات فروہ نے ڈھیروں نشہ آور گولیاں کھا لیں اگلی صبح وہ زندہ اٹھ نہیں سکی تھی۔

رحمان کی کربناک چیخیں سننے والوں کا دل دہلا رہی تھیں اس گھر میں صف ماتم بچھ گئی تھی رحمان کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اس نے نا جائز ذرائع سے جیسے دولت اکھٹی کی تھی ویسے ہی اس کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔ ملتان والا گھر بھی اریز بیچ چکا تھا۔

رحمان کے پاؤں کا انگوٹھا زخمی ہو گیا تھا چوٹ تو ذرا سی تھی، مگر شوگر کی وجہ سے زخم ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔ رحمان کے علاج کے لیے پیسے کی ضرورت تھی عائشہ نے اپنا گھر بیچ دیا۔ (یہ گھر عائشہ کے نام تھا) حیرت کی بات تو یہ تھی کہ رحمان نے اپنے بیٹوں کے بجائے اپنی بیٹیوں کے نام جائیداد کر رکھی تھی۔ بہت لاڈلی تھیں۔ رحمان کی بیٹیاں، ہیرے موتیوں میں تولتا تھا وہ ان کو۔ عائشہ ایک چھوٹے سے کرایے کے گھر میں شفٹ ہو گئی تھی رحمان کا علاج معالجہ ہو رہا تھا۔

''وہ سعد جو تھا نا۔'' ایک دن رحمان کی ذہنی روح بھٹکی تو وہ سب کچھ عائشہ کو بتاتا چلا گیا عائشہ لبوں پر ہاتھ سختی سے دبائے فق ہوتی رنگت کے ساتھ سنتی رہی۔

''اللہ......'' رحمان درد کی شدت سے کراہ رہا

''میں کہتا' مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

رحمان نے کتنا غلط کیا تھا کتنی چھوٹی اور غلط افواہیں اجالا کے بارے میں پھیلائی تھیں آج عائشہ کو پتا لگ گیا تھا۔

وہ ایک جامد چپ لبوں پر سجائے سب کے عتاب سہتی رہی اوہ میرے خدا۔''

عائشہ اجالا کے دل سے نکلی آہ نے مجھے کھا لیا۔

میں نے اجالا کو اس کے گرین ہاؤس سے دربدر کیا اور وہی گرین ہاؤس اپنی بیٹی عروہ کے نام کر دیا، کچھ باقی نہیں بچا نہ عزت نہ مال۔''

امن کی دعائیں قبول ہو چکی تھیں۔ اب کہ بار اس نے لبنیٰ سے معافی مانگی تو لبنیٰ نے اسے معاف کر دیا اب امن بھی نیہات کے کوچنگ سینٹر میں پڑھانے لگی تھی نیہات کو بی کام کے بعد بینک میں نوکری مل گئی تھی۔

ساری لڑکیاں اگلی کلاسز میں چلی گئی تھیں۔ زندگی رواں دواں تھی امن پہلے سے بھی زیادہ پر اعتماد ہو چکی تھی اس کے زندگی کی طرف لوٹنے میں فاخرہ کا بہت بڑا ہاتھ تھا امن کو راہنما ملا، مسیحا ملا خدا نے اسے مزید بھٹکنے سے بچا کر صراط مستقیم پر چلا دیا۔

آہ......فروہ بہت سارے دل توڑ کر ان ٹوٹے دلوں پر قدم دھرتی، مستی و خماری میں ڈوبی اپنا دل بسانے نکلی تھی۔ ایسے دل کہاں بسا کرتے ہیں جو خود غرض ہوں خود غرضی اور محبت کا کیا میل تال، محبت تو کائنات ہے پوری، محبت تو روح کو داغوں سے بچاتی ہے اللہ سے ملاتی ہے اپنے اصل سے ملاتی ہے، مگر فروہ آہ قصہ پارینہ بن گئی۔

تھا اس کی صدا واپس لوٹ آئی۔
ڈاکٹر نے رحمان کا انگوٹھا کاٹ دیا تھا وہ روتا چلاتا مگر اللہ اس کی نہیں سنتا تھا کیونکہ رحمان کفر بکتا رہا تھا اللہ کے بندوں پر ظلم ڈھاتا رہا تھا۔
رحمان کا زخم ٹانگ میں سرایت ہونے لگا تھا اس کی ٹانگ گلتی سڑتی جارہی تھی اس کی پیپ سے پلپلی ٹانگ پر مکھیاں بیٹھی تھیں بدبو کے بھبکے اٹھتے تھے۔ عائشہ اس کے ساتھ لگی رہتی۔ احتشام اور ریان قریب بھی نہیں آتے تھے۔
ڈاکٹرز نے رحمان کی پوری ٹانگ کاٹ دی تھی۔ پھر اس کی کمر نیچے سے گلنا شروع ہوگئی۔ اب تو رحمان میں بولنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔
وہ چت لیٹا رہتا بے جان مردوں کی طرح بہت ہفتے وہ اسی حالت میں پڑا کراہتا رہا ایک دن عائشہ نے بہت زور لگا کر فرقان کی مدد سے رحمان کو کروٹ دلوائی تھی۔ عائشہ کی چیخ بے ساختہ تھی رحمان کی کمر میں کیڑے اندر تک دھنسے ہوئے تھے اور اتنی سڑاند آرہی تھی کہ عائشہ تیورا کھا کر گری اور بے ہوش ہوگئی اس کا دل اس کی ناک بدبو سے بند ہورہی تھی۔

☆......☆......☆

نیہات نے کچھ پیسے جمع کر رکھے تھے وہ اپنا ذاتی مکان شہر میں لینا چاہتا تھا اس نے فاخرہ سے مشورہ کیا تو فاخرہ نے بھی اپنے اکاؤنٹ سے سارے پیسے نکلوا کر اسے دے دیے۔ وہ سب ایک فیملی بن کر اکھٹے رہنا چاہتے تھے۔ نیہات آج گھر دیکھ رہا تھا۔
نایاب لودھی نے نیہات سے معافی مانگی تھی نیہات کو اسی نے پٹوایا تھا کیونکہ اسے غلط فہمی ہوگئی تھی کہ اُسے کالج سے نکلوانے والا نیہات ہے۔ نیہات نے بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے دل سے معاف کردیا تھا۔
''پھپھو آپ کے لیے سرپرائز ہے اٹھیے ابھی چلیے۔'' ایک دن وہ آیا تو اس نے جلدی مچا دی۔
اب وہ اسی گھر کے سامنے کھڑی تھی جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا تھا۔
''یہ......'' فاخرہ نے الجھ کر پوچھا۔
''میں نے خرید لیا اب یہ گھر پھر ہمارا گھر ہے سعد مرتضیٰ اور اجالا کا گھر۔''
''مگر سعد نہیں ہے۔'' فاخرہ نے دیکھا نیہات رو رہا تھا۔
''پھوپھو آیئے۔'' وہ اس کے کندھے پر بازو رکھے اسے اندر لایا تھا اور سیدھا گارڈن میں ہی چلا آیا زرینہ اسے بتا چکی تھی کہ وہ گارڈن پر کتنی توجہ دیتی تھی۔
''پھوپھو میں سعد مرتضیٰ تو نہیں مگر آئی پرامس یو کہ میں اپنی پھوپھو کا مان اور میکہ ضرور بن کر دکھاؤں گا میں آپ کا بیٹا ہوں آپ میری ماں ہیں، آپ نے بہت غم اٹھائے ہیں اور ہم نے بھی دردر کی ٹھوکریں کھائی ہیں بہت کسمپری کی حالت میں وقت گزرا ہے ہم سب مل کر ایک دوسرے کے غموں کا مداوا کریں گے۔ جو ہوا سے بھول جائیں۔'' نیہات نے سعد کے انداز میں فاخرہ کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر سر پر بوسہ دیا تو فاخرہ جی اٹھی۔
''کبھی رونا نہیں پلیز۔'' نیہات کتنی محبت سے اس کے آنسو صاف کررہا تھا۔
''زرینہ کو بھی اس گھر میں لانا وہ بھی تمہاری ماں ہے۔''
''جی ضرور انشاء اللہ...... اور پھپھو کسی اور کو

بھی آپ کی خدمت کے لیے یہاں بہو بنا کر لانا ہے۔''

''کیسے......'' اب وہ پتھر کی بینچ پر لیٹ کر فاخرہ کی گود میں سر رکھ چکا تھا فاخرہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی اسے سعد کی باتیں بتاتی رہی گزرے لمحوں بیتی گھڑیوں کو دھراتی رہی وہ پورے دھیان سے سنتا رہا وہ بتاتی رہی ہر بات، آنکھیں بھیگتی رہیں چھلکتی رہیں۔

''اچھا میں بھول جاؤں گی کون ہے وہ۔''

''امن......'' نیہات کا چہرہ جگمگا اٹھا اور فاخرہ کا ہاتھ جھٹکا کھا کر بالوں میں ساکت ہوگیا۔

''پھپھو کیا ہوا، آپ چپ کیوں ہو گئیں کیا آپ کو امن پسند نہیں۔''

''امن مجھے بہت پسند ہے وہ میری بیٹی ہے مگر مسئلہ تمہارا ہے۔''

''ارے تو کیا میں آپ کو اپنی بیٹی کے لیے پسند نہیں۔'' وہ ہنسا

ار سعد مرتضٰی کے بیٹے کا ظرف اپنے باپ جیسا ہو تو مجھے اپنی بیٹی کے لیے نیہات پسند ہے۔''

پھپھو کیا مطلب۔'' وہ اٹھ بیٹھا۔

''پھر بتاؤں گی، ابھی تو میں اس خوشی کو پوری طرح محسوس کرنا چاہتی ہوں کہ میں اپنے گھر میں ہوں مجھے یقین نہیں آرہا سب ایک دوسرے سے مل چکے ہیں اور میں اپنے گارڈن میں بیٹھی ہوں۔''

''آپ یقین کریں پھپھو سب پہلے جیسا ہو گیا ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے اس ذات نے کرم کر دیا۔ اللہ سعد بھیا اور رائمہ بھابی کو جنت میں جگہ دے ان کی قبروں کو ٹھنڈا رکھے۔'' فاخرہ بھری آنکھوں سے اپنے گھر کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی یادیں لپک لپک کر اس کے گلے مل رہی تھیں۔

''کیا کبھی سعد بھیا اور رائمہ بھابی کو میں بھلا سکوں گی۔'' اس نے خود سے سوال کیا۔

''نہیں کبھی نہیں، مگر اب مجھے اپنے بچوں کے سامنے نہیں رونا، اس نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا۔

☆......☆......☆

فاخرہ اور زمان بچوں سمیت اس گھر میں شفٹ ہو گئے۔ نیہات فاخر کے کہنے پر زرینہ کو بھی لے آیا تھا اس نے بھی ماں بن کر دکھایا تھا اصل بات تو احساس کی ہے نا زرینہ کا دل احساس سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے نیہات اور ضویا کے نام کے ساتھ اپنے باپ کا نام ضمیر لگایا تھا۔ اسکول کالج میں بھی وہ اسی نام سے پکارے جاتے تھے ان کی ڈگریوں میں بھی ولدیت کے خانے میں یہی نام تھا۔

باپ جو ہوتا ہے وہی رہتا ہے۔ زندگی سے کچھ بھی قیمتی نہیں اور زرینہ نے ان بچوں کی جان بچانے کے لیے بلاشبہ بہت قربانیاں دی تھیں وہ اس گھر کے مکینوں کے لیے بہت قابل احترام ہستی تھی۔

ساری خوشیاں لوٹ آئی تھیں سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔

''کیا واقعی سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا ہاں مگر فاخرہ کے اندر کا ادھورا پن خالی دل۔''

روشنی مزاجوں کا کیا عجب مقدر ہے
زندگی کے رستے میں، بچھنے والے کانٹوں کو
راہ سے ہٹانے میں
ایک ایک تنکے سے آشیاں بنانے میں
خوشبوئیں پکڑنے میں
گلستان سجانے میں

عمر کاٹ دیتے ہیں
عمر کاٹ دیتے ہیں
اور اپنے حصے کے پھول بانٹ دیتے ہیں
کیسی کیسی خواہش کو قتل کرتے جاتے ہیں
درگزر کے گلشن میں ابرین کے رہتے ہیں
صبر کے سمندر میں...... کشتیاں چلاتے ہیں
یہ نہیں کہ ان کو اس روز شب کی کاوش کا کچھ صلا نہیں ملتا
مرنے والی آسوں کا...... خون بہا نہیں ملتا
زندگی کے دامن میں...... جس قدر بھی خوشیاں ہیں
سب ہی ہاتھ آتی ہیں
سب ہی مل جاتی ہیں
وقت پر نہیں ملتیں، وقت پر نہیں آتیں
یعنی ان کو محنت کا اجر مل تو جاتا ہے
لیکن اس طرح جیسے
غرض کی رقم کوئی قسط قسط ہو جائے
اصل جو عبادت ہو...... پس نوشت ہو جائے
فصل گل کے آخر میں پھول ان کے کھلتے ہیں
ان کے صحن میں سورج...... دیر سے نکلتے ہیں۔

☆......☆......☆

وہ اونچا لمبا خوبصورت مرد عجیب مجنونانہ سی حرکتیں کرتا تھا بولنے پر آتا تو گھنٹوں اولفول بولتا رہتا۔ خاموشی اوڑھتا تو دنوں خاموشی کی بکل میں چھپا رہتا۔

اسے بظاہر کوئی بیماری نہیں تھی نفسیاتی دورے پڑتے تھے وہ روتا تھا اس کی رال بہنے لگتی تھی اس کا کوئی رشتے دار تھا یا نہیں کسی کو کچھ خبر نہیں تھی وہ نجانے کتنے سالوں سے ایسے ہی ہسپتالوں میں دھکے کھاتا پھر رہا تھا۔

''میرا نام فاروق ترمذی ہے میں شاعر ہوں۔'' آج کل وہ بہت بول رہا تھا۔

''وہ اجالا تھی بڑی بڑی روشن آنکھوں والی۔''

''میرا کوئی گھر نہیں ہے میں نے اس کا گھر چھینا تھا وہ جو سراپا محبت تھی،

''اس کی آنکھوں مین اتنی بے یقینی تھی اتنی بے یقینی کہ وہ بے یقین آنکھیں میرا اقرار لوٹ کر لے گئیں میرا چین میری نیند سب ختم ہو گیا۔''

''محبت بہت کرتا ہوں اس لڑکی سے بہت زیادہ۔''

''محبت مجھے مار دے گی، محبت مجھے مار دے گی۔''

وہ تڑپ رہا تھا اور اسے تڑپتے ہی رہنا تھا جب تک محبت اسے معاف نہیں کر دیتی کیا پتا محبت اسے معاف کرے نہ کرے، تب تک اسے یونہی آدھی ادھوری زندگی سکتے ہوئے گزارنی تھی اس نے کسی معصوم کے دل سے کھیلنے کا سنگین جرم کیا تھا وہ محبت کا مجرم تھا محبت کو اس کے گھناؤنے وجود سے گھن آتی تھی۔ وہ رلتا پھرتا تھا۔

فاخرہ اس دن نیہات کی پسند کا قیمہ مٹر پکا رہی تھی زرینہ اور بشیراں بھی اس کے ساتھ لگی ہوئی تھیں چھٹی کا دن تھا نیہات سارے لڑکے لڑکیوں کو گھمانے لے کر گیا ہوا تھا وہ تینوں خواتین کچن میں کاموں میں مشغول خوش گپیوں میں مگن تھیں۔

''فاخرہ...... تبھی زمان نے آواز دی۔''

''جی آئی......'' اس نے بشیراں کو سالن کا خیال رکھنے کو کہا۔

جب وہ زمان کے پاس پہنچی تو دیکھا عائشہ زمان کے پاس بیٹھی رو رہی ہے۔

''سلام......'' فاخرہ نے جھجک کر سلام کیا۔

''فاخرہ میں تمہارے پاس بہت امید لے کر آئی ہوں رحمان کو معاف کردو اس نے تم پر اور اس گھر پر جو بھی مظالم کیے ہیں وہ سب مجھے بتا چکا ہے۔ وہ سعد اور رائمہ کا قاتل ہے۔''

''عائشہ بھابی یہ کیا کہا تم نے۔'' زمان ہکا بکا کہہ رہا تھا۔

''ہاں زمان بھائی حقیقت وہ نہیں ہے جو رحمان نے ہم سب کو بتائی بلکہ......'' عائشہ اب رحمان سے سنی ساری بات سنا رہی تھی اور زمان بےچینی سے پہلو بدل رہا تھا۔

''مگر رحمان تو کہتا تھا......'' عائشہ نے زمان کی بات کاٹ دی۔

''بکواس کرتا تھا جھوٹ بولتا تھا رحمان...... وہی فاخرہ کی تباہی کا ذمہ دار ہے۔ ہم سب نے زیادتیوں کی حد کردی۔ زمان بھائی ہم سب ظالم ہیں۔'' آج فاخرہ کے سارے آنسو عائشہ رو رہی تھی۔

''میں رحمان کو چھوڑوں گا نہیں۔'' زمان کے اندر بھی جھرجھری لے کر غیرت بیدار ہوئی تھی۔

''وہ عبرت کا نشان بن چکا ہے اس کا بدن گلتا جا رہا ہے اس کے بدن میں کیڑے رینگتے ہیں۔ خدا رسول ﷺ کا واسطہ فاخرہ رحمان کو معاف کردو تاکہ اس کی جان نکل سکے۔'' عائشہ نے زمین پر بیٹھ کر اس کے پاؤں جکڑ لیے فاخرہ کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس کے چہرے پر موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ فاخرہ نے عائشہ کو زمین پر سے اٹھا کر بیڈ پر بٹھا دیا۔

''نہیں فاخرہ رحمان کو معاف نہیں کرے گی میں بھی رحمان کو معاف نہیں کروں گا۔''

''میں نے اسے معاف کیا میرا اللہ بھی اسے معاف کرے گا مگر عائشہ ایک لمحے کے لیے عورت بن کر ماں بن کر سوچیے گا کہ جب فاخرہ کے ہر بچے نے اپنے بچپن میں ماں کے کندھے پر سر رکھ کر چاندی راتوں میں پوچھا۔

''مما چاند میں ماموں ہوتا ہے نا، مما چاند میں ماموں ہوتا ہے نا۔''

''مما ہمارا ماموں کہاں ہے۔'' فاخرہ بلکنے لگی۔

تب میرے دل پر کیسی قیامتیں ٹوٹتیں تھیں کیسا میرا دل کٹ کٹ کر گرتا تھا، ایک لمحے کے لیے اس کرب کو محسوس کرنا عائشہ محسوس کرنا۔''

محبت ہی تو کی تھی میں نے میری نیت صاف تھی، اور سزا اتنی طویل اتنی کھٹن کہ میں مر مر کر جیتی رہی اور جیتے جی مرتی رہی۔''

''رحمان کو مایا کی اتنی طمع تھی کہ اس نے میرے بھائی کی جان ہی لے لی، میرا میکہ گھر اجاڑ دیا۔ ارے سعد مرتضیٰ کا ایک بوسہ جو وہ میری پیشانی پر ثبت کرتا تھا اس کا کوئی مول نہیں ہو سکتا۔

پوری کائنات کا سحر ایک طرف سعد مرتضیٰ کا بوسہ پھر بھی زیادہ قیمتی تھا، خدا بن گیا مجھ سے سب کچھ چھین لیا خود ہی نکاح کیا مجھ سے خود ہی طلاق دے دی پھر بھی سکون نہیں ملا تو اپنے اندھے بھائی سے نکاح کر دیا جو انتہائی کمزور مرد ثابت ہوا جس کی آنکھیں ہی اندھی نہیں دماغ کی ساری کھڑکیں بھی بند تھیں جس نے جو کہا مان لیا۔''

''میری زندگی میں تین مرد آئے کسی کو مایا چاہیے تھی کسی کو میری تنخواہ چاہیے تھی سب نے میرے اندر گھٹن اور تشنگی پیدا کی کوئی میرا چہرہ دیکھتا کوئی میرا بدن ٹٹولتا تھا۔

کسی نے بھی میرے دل کے اندر جھانک کر نہیں دیکھا کہ دل میں کتنا درد کتنی تکلیف ہے کسی

نے بھی میرے غم میرے درد کو اپنی محبت واپنائیت سے بہاؤ کا راستہ نہیں دیا۔ میری تکلیف کو سب نے بڑھایا کسی نے بھی باہر نہیں نکالا...... '' آج وہ دونوں مل کر رورہی تھیں۔

'' فاخرہ میں بہت شرمندہ ہوں۔'' زمان بولا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے اب۔'' فاخرہ نے بے دلی سے کہا۔

''میں نے رحمان کو معاف کیا اللہ بھی اُسے معاف کرے گا۔''

☆......☆......☆

اللہ کا فرمان ہے کہ میں اپنے حقوق معاف کر دوں گا مگر حقوق العباد میں جو ظلم کسی نے کسی پر ڈھایا جب تک وہ بندہ معاف نہیں کرے گا ظلم کرنے والے کو میں بھی معاف نہیں کرسکتا۔''

رحمان مر گیا۔ اس کے بدن سے اتنے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے کہ کوئی اسے غسل دینے کو آگے نہیں بڑھ رہا تھا نیہات نے چند دوسرے لوگوں اور فرقان کی مدد سے غسل دیا تھا۔

اریز چوہدری بیا ہمدانی کو ساتھ لے کر جا رہا تھا۔ کسی نے اس کے کزن کو مخبری کر دی ان کا پیچھا کیا گیا اور پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ چھاپہ مارا گیا تو وہاں سے بہت ساری عورتیں اور بچے ملے تھے وہ بچوں اور عورتوں کی سپلائی کا کام کرتے تھے۔ جرائم پیشہ گروہ سے عروہ بھی برآمد ہوئی تھی ہاں جویریہ اور اس کے بچوں کا کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔

اریز اور نایاب کی لڑائی ہوگئی تھی نایاب ان کا راز دار تھا شہر کی امیر اسامیوں کے بارے میں معلومات دیتا تھا آج مخبری بھی اسی نے کی تھی۔ اس کا سرغنہ تو ہاتھ نہیں آیا تھا مگر لڑکیاں آزاد ہوگئی تھیں۔

☆......☆......☆

ایک دن جب نیہات اور فاخرہ جب گارڈن میں تھے شام کا وقت تھا صبا ان کو وہیں چائے دے گئی تھی۔ تب فاخرہ نے نیہات کو امن پر گزرے سانحے کا حرف حرف بتا دیا وہ سر جھکائے سنتا رہا اس کا چہرہ پل پل رنگ بدل رہا تھا۔

'' اب بتاؤ بیٹا......'' فاخرہ نے اس کا چہرہ نگاہوں کی گرفت میں لے کر پوچھا۔

'' پھپھو مجھے ہر حال میں امن سے ہی شادی کرنی ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

'' سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا بیٹے ایسا نہ ہو جلد بازی میں فیصلہ کرلو بعد میں مخصوص مردانہ تنگ دلی تمہاری محبت کو کھا گئی تو امن کی تو زندگی برباد ہو جائے گی نا۔''

'' نہیں پھپھو ایسا کبھی نہیں ہوگا میرا یقین رکھیں۔''

'' بیٹا ایک بات یاد رکھنا عورت کی فطرت محبت کے معاملے میں بچے کی سی ہوتی ہے جو صرف محبت سے بہلتا ہے بس محبت محبت بہت زیادہ محبت، کبھی اسے ماضی کا طعنہ مت دینا میری بیٹی کو بہت پیار اور اعتماد دینا عورت کو صرف تحفظ اور محبت چاہیے ہوتی ہے صرف محبت، امن کو بہت جتنوں سے میں نے دوبارہ زندہ کیا ہے۔''

'' پتا ہے امن کہتی ہے آنٹی آپ میرے لیے سانتا کلاز ہیں۔''

'' سانتا کلاز......' نیہات نے استفہامیہ ابرو اچکائے۔

'' سانتا کلاز ایک Image ایک تصور، جو کہ کرسمس کے موقعوں پر بچوں کے لیے تحائف لاتا ہے ان کے لیے خوشیاں ڈھونڈتا تھا ان کی

زندگی کے اندھیروں میں کرن بن کر جگمگا تا جینا سکھا تا تھا۔ جینے کی راہ کھا تا تھا...... ہاہ پگلی، میں تو زندہ حقیقت ہوں کوئی تصور تھوڑی ہوں۔''

''واؤ، فنٹاسٹک......'' نیہات نے توصیفی انداز میں ہونٹ سکیڑے۔

''خلیل جبران نے شاید مردوں کے لیے ہی کہا ہے کہ اگر تیرا دل کوہ آتش فشاں ہے تو تیرے ہاتھوں میں پھولوں کو کیسے تروتازہ رہنے دے گا۔''

''لڑکیاں تو پھول ہوتی ہیں ان کو بہت محبت سے رکھنا چاہیے۔ سخت گیر مرد اپنی بیویوں کو تروتازہ نہیں رہنے دیتے مرجھا جاتی ہیں تم امن کو پھول سمجھنا۔''

''اوکے جناب آپ کی بیٹی کو مابدولت پھولوں کی طرح رکھیں گے۔'' نیہات نے سرتسلیم خم کردیا۔ ''مجھے یقین ہے۔''

☆......☆......☆

عائشہ دو ماہ سے مکان کا کرایہ نہ دے سکی تھی، مالک مکان نے اسے گھر سے نکال دیا۔ یہاں بھی ایک بار پھر فاخرہ آگے بڑھی اور اس فیملی کو اپنے گھر لے آئی وہ جانتی تھی کہ دل بڑا کرنے سے رزق بھی کشادہ ہوجاتا ہے عائشہ اور عروہ کا سر ہی نہیں دل بھی فاخرہ کے سامنے جھک گیا تھا۔

گارڈن میں چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ سب خواتین اور لڑکیاں عشاء کی نماز پڑھ چکی تھیں۔ فاخرہ اور وہ سب رات کے اس روز اجتماعی دعا مانگا کرتی تھیں۔

فاخرہ دعا مانگتی باقی سب آمین آمین کہا کرتی تھیں۔ فاخرہ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، درود شریف پڑھا۔

''اے اللہ اے دو جہانوں کے مالک کل امت مسلماں کی بیٹیوں کی عصمتوں کی حفاظت فرما دے۔ اے آسمانوں کو بغیر سہارا کھڑا کرنے والے رب، تجھے تیری واحدانیت کا صدقہ ہماری بیٹیوں کو فاطمہ الزہرہ جیسا کج ویسی شرم وحیاء عطا فرما تاکہ ان کے بطنوں سے بیٹے پیدا ہوں۔''

فاخرہ کی آواز میں سوز تھا۔ گریہ زاری تھی پیچھے آمین آمین کی صدائیں بلند ہورہی تھیں۔

''اے اللہ! تجھے تیری کبریائی کا واسطہ تجھے تیرے محمد کا واسطہ شیطانوں کو نیست و نابود کر دے۔ اے اللہ ہمارے نوجوانوں میں محمد بن قاسم جیسے نوجوان پیدا کر دے۔ آمین کی صدائیں بلند ہوئی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

''دنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے ہم پر ہماری اولاد پر کل امت مسلماں پر اپنا رحم اپنا کرم نازل فرما۔ تیرا اعتاب سہنے کی تاب نہیں میرے اللہ محمد ﷺ کے رب ہمیں معاف فرمادے۔

ہمارے گناہوں کو نہ دیکھ اپنی رحمت کو دیکھ، تجھے تیری بڑائی کا واسطہ ہمیں معاف کر دے۔ ہم تجھے بھول گئے اپنے اصل کو بھول گئے اللہ تو اپنی نظر ہم پر رکھنا ہمیں معاف کر دے۔ ہمیں گناہوں سے بچالے۔'' آمین کہتی کہتی عروہ کی ہچکیوں نے گھگھی باندھ رکھی تھی۔

''تم حقیقتاً اجالا ہو دوسروں کی زندگیوں میں اجالا کردینے والی۔''

زمان دور کھڑا رو رہا تھا۔ یہ اجالا کا ظرف تھا کہ اس نے سارا خاندان ایک جگہ اکٹھا کردیا تھا۔

آج گارڈن میں ایک ایک پھول مسکرا رہا تھا اور دور افق پر چاند میں سعد مرتضی کا پرنور چہرہ مسکرا رہا تھا۔

(اس خوب صورت ناولٹ

جانم سمجھا کرو

”شٹ اپ بدزبان عورت۔“ احمر کا پورا ہاتھ اٹھا اور اس کے چہرے پر پانچ انگلیوں کے نشان ثبت ہوگئے وہ یک ٹک چہرے پہ ہاتھ دھرے اسے بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ ”سچ تو یہ ہے تم نے اس گھر کو اپنا گھر ہی نہیں سمجھا تم نے میری ماں کو اپنی ماں کے بجائے......

”بس بہت ہو چکا اب اس سے زیادہ برداشت کی مجھ میں تاب نہیں میں نے ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے سارے زمانے کو خوش کرنے اور خود اذیت اٹھانے کا۔

”پلیز صبا تم سمجھنے کی کوشش کرو، بے شک امی زبان کی تیز ہیں مگر دل کی بہت اچھی ہیں۔ تم تھوڑا لچک کا مظاہرہ تو کرو۔“

کیوں آخر کیوں میں ہی کیوں جھکوں ہر وقت کی روک ٹوک، اٹھتے بیٹھتے طنز، آنے جانے پر پابندی ہر کام کرنے پہ سو سو باتیں بناتی ہیں بڑی بی کیا کرایا مل جاتا ہے ناں سب کچھ، اس لیے باتیں بھی آجاتی ہیں آج اگر میں چلی جاؤں تو چھٹی کا دودھ یاد آجائے ان کو۔“

صبا کے کٹیلے لہجے نے احمر کے جسم میں انگارے بھر دیے۔

”ہاں تو جانے کا شوق ہے تمہیں یہ بھی پورا کر لو۔ آخر تمہارے اس گھر میں آنے سے پہلے بھی سب کچھ چل رہا تھا یہ امی جان ہی ہیں جن کی ٹھنڈی طبیعت کی وجہ سے گھر سنبھلا ہوا ہے ورنہ تم جیسی عورتیں تو منٹ نہ لگائیں گھر اجاڑنے میں۔“

احمر کے دل کی تمام تر تلخی لفظوں میں سمٹ کر صبا کی سماعتوں میں سیسہ انڈیل گئی۔

”میں گھر اجاڑنے والی ہوں تو بسانے والی لے آؤ۔ ایک یہ ہی تو حسرت ہے تمہارے دل میں اول روز سے تمہیں میرا وجود ناگوار گزرا ہے۔ تم نے مجھے بیوی سمجھا ہی نہیں اور تمہاری ماں اس نے تو مجھ سے سوتنوں والا رویہ رکھا ہے۔“

”شٹ اپ بدزبان عورت۔“ احمر کا پورا ہاتھ اٹھا اور اس کے چہرے پر پانچ انگلیوں کے نشان ثبت ہوگئے وہ یک ٹک چہرے پہ ہاتھ دھرے اسے بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

”سچ تو یہ ہے تم نے اس گھر کو اپنا گھر ہی نہیں سمجھا تم نے میری ماں کو اپنی ماں کے بجائے ساس سمجھا بڑھاپے کے باوجود وہ اپنی استطاعت بھر کام کرتی ہیں پھر بھی تمہیں بری لگتی ہیں مگر ایک

بات کان کھول کر سن لو میں اپنی ماں کی نافرمانی اور تضحیک برداشت نہیں کرسکتا۔ اگر تمہیں اس گھر میں رہنا ہے تو اپنا رویہ درست کرلو میں الگ گھر افورڈ نہیں کرسکتا۔

''مگر مجھے اس گھر میں ایک منٹ نہیں رہنا، اگر تمہیں اپنا گھر اور ازدواجی زندگی عزیز ہے تو مجھے الگ گھر چاہیے ورنہ میں واپس نہیں آؤنگی۔''

اس نے خودسر لہجے میں تیر چلاتے ہوئے اپنی چادر اوڑھی اور باہر کے دروازے کا رُخ کیا۔

''ایک بات غور سے سن لو اگر تم نے اس گھر کی دہلیز پار کی تو پھر واپسی کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔ میں نہ تو تمہیں بلاؤں گا نہ لینے آؤں گا اگر تم خود آنا چاہو تو یہ سوچ لینا کہ رہنا اسی گھر میں ہے۔ ادب اور تہذیب واخلاق کے دائرے میں ورنہ ہمارے راستے الگ ہوں گے، احمر نے اس کے تیور دیکھتے ہوئے خبردار کیا۔

''ہونہہ یہ تو آنے والا وقت بتائے گا کون کس کی مانتا ہے اور کتنے پانی میں ہے۔'' اسے چیلنج کرتی ہوئی وہ باہر نکل گئی۔

روڈ پہ آتے ہی اُسے ٹیکسی مل گئی اپنے میکے کا راستہ بتا کر پریشان خیالی سے توجہ ہٹانے کو وہ باہر کے مناظر میں خود کو گم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

یہی راستے تھے جن پر سے گزرتے ہوئے اس نے میکے سے سسرال تک کا فاصلہ طے کیا تھا۔ اور ایک نئی اور اصل زندگی کا آغاز کیا تھا اور آج

یہی راستے واپسی کا سفر کرتے ہوئے اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

جب احمر سے اس کی شادی ہوئی تو وہ بی اے کی سٹوڈنٹ تھی اور ابھی گھریلو ذمہ داریوں سے نبرآزما ہونا اس نے سیکھا بھی نہ تھا گھر میں تو ہمیشہ بھابی تمام کام کیا کرتی تھیں اسے نہ تو گھریلو کام کاج سے دلچسپی تھی نہ وہ اس کی ضرورت سمجھتی تھی بڑی بہنیں قریب میں بیاہی گئی تھیں اور ہفتے میں دو چکر لازمی ان کے گھر لگا کرتے ہمراہ شوہر بھی ہوتے اور بھابی کچن میں اکیلی لگی رہتی رشتے دار بھی کافی تھے کچھ امی کو دوستیاں بڑھانے اور ملنے ملانے کا خبط رہا کرتا تو ہر روز مہمان نوازی کا سلسلہ چلتا پھر مشروبات، چائے قیام وطعام کا طویل دور۔

بھابی بیچاری ہلکان ہو جاتیں امی کبھی جھوٹے منہ بھی نہ کہتیں کہ صبا بھابی کے ساتھ کچھ کروا دو ویسے بھی ان کے خیال میں یہ ہی تو اس کے آرام کے دن تھے ہلہ گلہ ٹیلیفونک فرینڈ شپ، پارٹیز یہ سب اور پڑھائی اتنا کچھ کرنے کے بعد صبا کے پاس ٹائم ہی کہاں بچتا تھا کہ کچھ کرتی، اتنا کچھ کر کے وہ تھکن کا شکار ہو جاتی تھی اور پھر اس کے ہفتے کا بیڈ ریسٹ پکا ہو جاتا اور ایسے میں جو بھابی سے اس کی ناز برداری میں ذرا سی بھی کوتاہی ہو جاتی تو پھر امی کی جوتی اور بھابی کا سر والی مثال صادق آتی۔

''تم کیوں چاہو گی کہ بچی صحت مند ہو۔ ارے بھابیاں کہاں دیکھ سکتی ہیں کہ نندوں ذرا آرام سکون ملے۔ ارے کیسی نازوں پلی بچی میری پل میں مرجھا گئی۔ جانے کس ڈائن کی نظر کھا گئی۔ (اشارہ صاف بھابی کی طرف تھا) مگر وہ ان سنی کر کے فرش سے وہ دودھ صاف کرنے میں لگی تھیں جو صبا نے خود ہی ہاتھ مار کر گرایا تھا اور عتاب کا نشانہ بھی وہ بنی تھیں۔

اسی طرح کے عذاب میں زیبا بھابی پستی رہیں وہ تو بھلا ہوا زیتون خالہ کا کہ انہوں نے اپنے جاننے والوں میں صبا کی بات کر کے ان کے عذاب میں کمی کر دی۔ احمر ان دنوں بینک میں اسسٹنٹ مینیجر تھا تنخواہ بیس ہزار انتہائی پرکشش پرسنالٹی متناسب خدوخال، دراز قد اور پروقار شائستہ انداز گفتگو یہ وہ صفات تھیں احمر کی جنہوں نے اکرام اللہ اور شگفتہ بیگم کو بھی پہلی ملاقات میں متاثر کر دیا۔

ان کے لیے سب سے زیادہ باعث اطمینان بات احمر کا اکلوتا ہونا تھا۔ باپ ٹریفک حادثے میں وفات پا چکا تھا اور ماں جو کسی زمانے میں سکول ٹیچر تھیں انہوں نے اپنی محنت ومشقت سے احمر کو پروان چڑھایا اور اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر تمام تربیت حسن کے پہلوؤں سے آراستہ کیا اور احمر کو ایک پراعتماد شخصیت بنانے میں اہم کردار ادا کیا شادی سے پہلے تو احمر اور اس کی والدہ کو صبا بہت اچھی لگی معصوم، خوبصورت، نازک اندام اور خوش اخلاق مگر شادی کے پہلے مہینے میں ہی اس کے جوہر کھل کر سامنے آ گئے۔ دن کے گیارہ بجے تک لیٹے رہنا اس کی روٹین تھی جس میں شادی کے بعد بھی فرق نہ آیا گیارہ بجے اٹھنے کے بعد وہ باتھ کے لیے تیار ہوتی پھر احمر کی والدہ اس کے لیے ناشتہ تیار کرتی اور ناشتے کے بعد وہ اپنی امی کو فون کرتی یا پھر کسی فرینڈ کو اور پھر احمر کو اس شغل میں دو گھنٹے صرف کر کے وہ ٹی وی لاؤنج کا رُخ کرتی، ڈی وی ڈی لگا لیتی یا کیبل کے پروگرام دیکھتی یونہی دن ڈھل جاتا اور ساس شام کے کھانے کی تیاری میں اکیلی لگی ہوتی۔

گھر کے کسی کام سے کوئی غرض نہ تھی صفائی ستھرائی کس کی ذمہ داری ہے کچن کون سنبھالتا ہے آئے گئے کی خاطر مدارت کون کرتا ہے اس کا کام بس عیش و آرام اور تفریح تھا۔

احمر لنچ ہمیشہ ہی کرتا تھا اور شادی کے بعد بھی یہ روٹین قائم تھی وہ دیکھتا تو سب تھا مگر کہتا نہ تھا آہستہ آہستہ جب شادی کے دو تین ماہ گزر گئے اور صبا نے گھر میں اپنی ذمہ داری کا احساس نہ کیا تو احمر نے اسے گھر کے کاموں کی جانب راغب کرنا شروع کر دیا۔ مارے باندھے بہانے گھر کے کام کاج میں حصہ لینا شروع کر دیا مگر جلد ہی وہ اس ناگوار ذمہ داری سے اکتا گئی اور اس نے گھر کے کاموں سے ایک بار پھر ہاتھ کھینچ لیا۔ جبکہ دھان پان سی صابرہ بیگم خرابی طبیعت کے باوجود جتی رہتیں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب احمر کو ناگوار گزرتا کہ جوان بیٹے اور بہو کے ہوتے وہ اپنی ہمت استطاعت سے بڑھ کے کام کرتیں تھک جاتیں تو وہ صبا کو بھی ٹوک دیا کرتیں اور یہ سب صبا کی برداشت سے باہر تھا۔ اسے روک ٹوک سننے اور کام کرنے کی عادت نہ تھی جبکہ احمر اور اس کی والدہ کو اس کا فارغ بیٹھ کے فون سے چپٹے رہنا اور مویز دیکھنا پسند نہ تھا اور اکثر اسی بات پر ان کا جھگڑا رہنے لگا حالانکہ دیکھنے کو یہ بہت چھوٹی بات تھی اور صبا کے لیے یہ سب کرنا مشکل بھی نہ تھا مگر پھر بھی اسے تین انسانوں کا ناشتا، کھانا، کپڑے دھونا، عذاب لگتا تھا اب تو احمر نے برتن مانجھنے اور جھاڑو صفائی کے لیے ماسی بھی رکھ لی تھی پھر بھی صبا کو صرف اپنے اور احمر کے دھوتی صابرہ بیگم کے کپڑے یونہی پڑے رہ جاتے وہ خود دھوتیں۔

آج بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا اپنے اور احمر کے کپڑے دھو کر الگنی پہ پھیلائے جبکہ صابرہ بیگم کے کپڑے وہیں چھوڑ سہیلی کا فون سننے لگی آدھ گھنٹہ باتوں میں لگا کر کیبل پر موودی دیکھنے لگی اور کھانے کا کوئی انتظام نہ کیا۔

احمر لنچ ٹائم میں آفس سے آیا تو صحن میں قدم رکھتے ہی اس کی پہلی نظر اپنی اماں پہ پڑی جو اپنے کپڑے اور بستر کی چادر دھو رہی تھیں اور دوسری طرف نظر لاؤنج میں میک اپ زدہ چہرے اور زبردست فٹنگ کے جدید تراش خراش کے سوٹ میں چپس کھاتی نئی انڈین مووی دیکھتی صبا پر۔

’’امی آپ خود کام کر رہی ہیں صبا کہاں ہے وہ دھو دیتی آپ کے کپڑے۔ اس نے ان کے ہاتھ سے کپڑے لے کر انہیں اٹھایا۔

’’بیٹے اس نے اپنے اور تمہارے کپڑے دھو لیے تھے۔‘‘ صابرہ بیگم یہ کہہ کر چپ ہو گئیں، تو پھر کیا ہوا آپ کے بھی دھو لیتی جب آپ کی بہو موجود ہے تو آپ کام کیوں کر رہی ہیں۔‘‘

مجھے اچھا نہیں لگتا کہ اب اس عمر میں بھی آپ اپنے کام خود کریں اس نے محبت سے ان کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگائے۔

نہیں بیٹا یہ کون سا بڑا کام ہے ویسے بھی تو اب عادت سی ہو گئی ہے آج نہ دھوؤں تو کل دھونے پڑیں گے انہوں نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔

’’کیا مطلب میں سمجھا نہیں۔‘‘ وہ الجھے ہوئے انداز میں بولا۔

’’بیٹا! اپنے کپڑے خود ہی دھوتی ہوں کیونکہ صبا تمہارے اور اپنے کپڑے دھو کے ٹی وی لاؤنج میں چلی جاتی ہے میرے کپڑے یونہی پڑے رہ جاتے ہیں اس لیے میں دھو لیتی ہوں، اور یہ وہ بات تھی کہ جس نے احمر کو چراغ پا کر دیا اس نے

جھٹکے سے لاؤنج میں بیٹھی صبا کو اٹھایا اور گھسیٹتا ہوا صحن میں لایا اور شدید غصے میں بولا۔

''جب میں نے سو بار بکواس کی ہے کہ امی کے کام تم خود کیا کرو تو پھر تم پر اثر کیوں نہیں ہوتا

''تو خود ہی تو کرتی ہوں آج اگر انہوں نے ایک سوٹ دھولیا تو کون سی قیامت آ گئی۔

''بات قیامت کی نہیں صرف احساس کی ہے اگر میری ماں کی جگہ تم خود اپنی ماں کو رکھو تو کیا پسند کرو گی تمہاری ماں اس عمر میں اپنے کام خود کریں۔''

''میری ماں کو ضرورت نہیں ہے ان کی بہو موجود ہے سب کچھ کرنے کے لیے۔'' اس نے کروفر سے کہا۔

''اور تم، تم خود بھی کسی کی بہو ہو اپنے متعلق کیا رائے ہے تمہاری۔''

احمر کا طنزیہ لہجہ اسے جلا گیا۔

''میرا کسی سے موازنہ مت کریں میں زر خرید لونڈی نہیں ہوں۔ میں نے اپنے گھر میں کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا کام کو مجھے عادت نہیں ہے ایسے کاموں کی اور رویے کی۔ ایسے نخرے اٹھانے کی۔ گھر شوہر اور ساس کو اپنا سمجھو برداشت اور نرم طبیعت پیدا کرو خود کو خوش رکھنے اور گھر کو سکون دینے کی کوشش کرو۔ اسی میں تمہارا بھلا ہے۔ اور یہ ہی وہ بات تھی جو صبا کو ناگوار گزری۔ احمد نے تنبیہ کی۔

''بس بہت ہو چکا میں نے ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے سارے زمانے کو خوش کرنے اور اذیت اٹھانے کا۔

ور پھر دونوں کی دو بدو لڑائی میں جھگڑا اتنا بڑھ گیا کہ اس نے گھر چھوڑ دیا۔

''باجی آپ کا گھر آ چکا ہے۔'' پٹھان ٹیکسی ڈرائیور کی آواز اسے خیالات کی دنیا سے باہر کھینچ لائی اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر پیچھے رہ جانے والے راستے کو دیکھا اور نیچے اتر کر پرس میں ہاتھ ڈالا جتنے پیسے آئے بغیر گنے ڈرائیور کے ہاتھ پہ رکھے اور آگے بڑھی۔

''ارے باجی باقی پیسے تو لے لو ڈرائیور کی آواز ان سنی کرتے وہ تیزی سے گھر میں داخل ہو گئی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر بھابی پر پڑی جو فون پر بڑے خوشگوار لہجے میں کسی سے بات کر رہی تھیں۔ وہ بھاگ کر تخت پر لیٹی امی سے لپٹ گئیں۔ بھابی نے خاصے ناگوار انداز سے اس ملاپ کو دیکھا۔ اور اس کے سلام کا جواب بھی شاید منہ میں ہی دیا کہ وہ سن نہ پائی اور پھر ٹی وی لاؤنج میں گھس گئی۔

انہیں اس بات سے غرض نہ تھی کہ صبا کتنے عرصے بعد آئی ہے امی کھانا کھلانے اسے کچن میں لائیں تو وہ وہیں بیٹھ کے اپنی کتھا سنانے لگی۔ تمام رام کہانی سننے کے بعد اسے اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے امی نے زبردستی اسے کھانا کھلایا اور آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں لے آئیں۔

شام کو اویس بھائی آفس سے لوٹے تو بھابی اپنے میکے جانے کے لیے تیار تھیں۔ کھڑے کھڑے صبا کی خیریت پوچھی اور انہیں لے کر چلے گئے۔

''امی یہ بھابی کیسی ہو گئی ہیں خودسر اور بدتمیز اور بھیا بھی کتنے بیگانے لگتے ہیں صبا کا دل دکھا تو امی سے شکوہ کیا۔

''ہاں جب سے تمہارے ابو کی وفات ہوئی ہے یہ تبدیلیاں از خود آتی گئیں زنیرہ اپنے میاں

کے ساتھ کراچی چلی گئی۔ سال کے سال بھی بمشکل چند دنوں کے لیے آتی ہے اور ثنا اس کو اپنے گھر کے بکھیڑوں اور بچوں سے فرصت نہیں ملتی پھر تم بھی نہ آتیں آہستہ آہستہ زیبا نے سب کام چھوڑ دیے، دیکھو پہلے بھرے پرے گھر کا کام خود کرتی تھی اور اب کُل تین نفوس ہیں مگر بیگم نازک مزاج ہوگئی ہیں۔

اویس تو اب خود بیوی کا دم بھرنے لگا ہے اسے سب کوتاہیاں ہماری نظر آتی ہیں جانے اس ناگن نے کیا جادو کیا ہے کہ بالکل بدل کر رہ گیا ہے آفس جاتے ہوئے نہ پہلے کی طرح سلام کرنے آتا ہے نہ آ کے پاس بیٹھتا ہے صبح گیٹ تک وہ چھوڑنے جاتی ہے اور شام کو بیوی کو لے کر سیر سپاٹے پہ نکل جاتے ہیں یا کھانا کھا کر کمرے میں بند ہو جاتے ہیں کپڑے دھونے کے لیے نوکرانی آتی ہے مگر وہ صرف بہو بیگم کے کپڑے دھوتی ہے میرے نہیں یہ تو دونوں بازار جاتے ہیں کھانا کھانے بچوں کو گھمانے کے بہانے اور میں اکیلی اپنے لیے پکاتی ہوں۔ بتاتے بتاتے رونے لگیں۔

''یہ تو غلط ہے سراسر زیادتی ہے اور ناانصافی۔ اتنے عرصے سے یہ سب ہو رہا ہے اور آپ نے مجھے بتایا نہیں حالانکہ میں روز فون کرتی رہتی تھی خیر اب بھیا آ جائیں پوچھتی ہوں اور بہو بیگم کی ایسی لگام کھینچتی ہوں کہ سر اٹھانا بھول جائے گی۔''

''نہیں تم کچھ مت کہنا حالات اب بس میں نہیں رہے اویس صرف بیوی کا دم بھرتا ہے، کسی کی نہیں سنتا اور زیبا بھی پہلے جیسی دبو اور ڈرپوک نہیں رہی تو کچھ کہہ سن کے بات گنوانے کا کیا فائدہ۔ زندگی کے چار دن ہیں روتے دھوتے گزر

خوبصورت دعا

اللہ کرے اگلے سال آپ اور آپ کے گھر والوں کے ہاتھوں کو غلافِ کعبہ پکڑنا نصیب ہو۔

آپ کے ہونٹوں کو حجر اسود کا بوسہ نصیب ہو۔

آپ کے قیام، آپ کے رکوع، سجدوں اور عبادتوں کو مسجد حرام کا فرش نصیب ہو۔

جب لب پر درودِ پاک ہو تو سامنے روضۂ رسول ﷺ ہو۔ وہاں مانگی آپ کی ہر دعا قبول ہو۔

حسنِ انتخاب: راز عدن۔ بحرین

جائیں گے۔

''مگر کیوں امی! آپ احتجاج کریں۔''

''جب بہویں خودسر ہو جائیں تو کچھ کہنا صرف اپنی بے عزتی کو دعوت دیتا ہے۔'' شگفتہ بیگم کی بات اسے یکدم ساکت کر گئی۔ کچھ اسی سے ملتے جلتے الفاظ صابرہ بیگم نے بھی تو کہے تھے احمد کی کہی بات کے جواب میں۔

''مگر نہیں انہیں تو عادت ہے یونہی بیکار بے تکا بولنے کی بھلا میرا اور زیبا کا کیا مقابلہ۔'' (واہ رے زمانے تیرے انداز اپنے لیے کچھ اور کسی کے لیے اور)

''امی آپ مجھے بات تو کرنے دیں وہ ہوتی کون ہے ایسا کرنے والی۔

''جب فائدہ ہی نہیں تو رہنے دو بس۔''

امی کے مجبور کرنے پہ وہ خاموش ہو گئی جبکہ بھابی خلاف توقع دوسرے دن ہی آ گئیں۔ موڈ وہی روکھا پھیکا سرسری سی بات چیت کی بچوں کو ٹیوشن کے لیے بٹھایا خود کچن میں مصروف۔ وہاں

سے فارغ ہو کے نہا دھو کر تیار ہوئیں اور ٹیرس پر ٹہلنے لگیں۔

صبا کو بہت تیز بھوک لگی ہوئی تھی بھوک ویسے بھی اس سے برداشت نہ ہوتی تھی وہ کچن میں آئی۔ بریانی، شامی کباب، دہی کا رائتہ، کڑاہی گوشت، تیار دیکھ کر اس کی بھوک اور بھی تیز ہوگئی اس نے پلیٹ میں بریانی ڈالی اوپر ایک کباب رکھا اور ذرا سا رائتہ ڈالا اور ابھی پہلا نوالہ منہ میں گیا تھا کہ بھابی پلیٹ پر چیل کی طرح جھپٹیں۔

''میری بہن اور بہنوئی آ رہے ہیں یہ سب تو میں نے ان کے لیے تیار کیا ہے۔ اتنی گرمی اور تپش میں لگی رہی خود چکھ کر بھی نہیں دیکھا اور تم بھوکوں کی طرح شروع ہوگئی تمہاری ماں کی پرہیزی والی مونگ اور چاول پکے ہیں وہی تم کھا لو۔'' وہ سخت لہجے میں کہتی نکل گئیں۔

صبا کتنی دیر بے یقینی کے عالم میں بیٹھی رہ گئی اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ وہی بھابی ہیں جو بے زبان گائے لگا کرتی تھیں اور سارا گھر انہیں بے طرح کوستا، جلاتا تھا مگر وہ منہ سے لفظ تک نہ نکالتی تھیں اور اب بولنے پر آئیں تو کسی کو کچھ کہنے کے قابل نہ چھوڑتیں۔ کیا یہ اس کا اپنا عکس نہیں تھا جو نظر آ رہا تھا مگر دماغ سمجھنے سے قادر نہ تھا۔

''بس کیا بتاؤں تم چپ ہی رہنے دو تو اچھا ہے پہلے تینوں چڑیلیں سر پر سوار رہتیں چھوٹی ڈائن ساس مل جاتی۔ بیاہ دیا ایک ایک کر کے کچھ سکون ملے مگر سکون نصیب میں تھا ہی نہیں تو ملتا کیسے ہر تیسرے دن پھر جیلر کی طرح موجود اور میں پہلے سے بھی تنگ شوہر تھے تو وہ ماں بہنوں کے دباؤ میں مجبور بس قیدی اور میں صبر پہ صبر کیے جاتی مگر کتنا تیسری محترمہ سے چھٹکارا سب سے مشکل ضدی، نازک مزاج اور خودسر فیشن زدہ مجال ہے جو ہاتھ سے پانی کا گلاس بھی اٹھا لے اس نے مجھے لوہے کے چنے چبوا دیے۔

بیاہ کر بھی جان نہ چھوڑی پہلی دونوں دور گئیں تو ذرا سانس ہلکا ہوا پھر یہ سر پر سوار اور چونچلے سنو جو لچھن میکے میں وہی سسرال میں کتنا برداشت کرتے آخر تنگ پڑنے لگے مگر لاڈلی بیگم نے اپنے اطوار نہ چھوڑے گھر چھوڑ آئیں۔

بھابی بہن کے ساتھ مصروف گفتگو تھیں وہ جو ان کی بہن سے سلام دعا کرنے کی غرض سے آ رہی تھی ٹھٹھک کر دروازے کے باہر ہی رک گئی۔

''مگر یہ سب آپ کو کیسے پتا چلا، اس نے تو کچھ بتایا نہیں ہوگا، بہن بولی۔

''ارے گھنی میسنی ہے خود سے کچھ نہیں پھوٹتی وہ تو میری ایک دوست کی بہن اسی محلے میں بیاہی ہوئی ہے اس سے سب پتا چلا ہے بلکہ وہ تو بتا رہی تھی احمد کا ضبط آخروں حدوں پہ ہے ذرا اور چھلکا تو طلاق ہو جائے گی۔''

''واقعی معاملہ اتنا بگڑ گیا گیا۔''

''اس سے بھی زیادہ مجھے تو نندیں اور ساس باتیں سناتی تھیں کہ گھر بسانے اور بنانے کا سلیقہ طریقہ نہیں بیٹی تو اپنی تھی اسے کیوں نہ سب طریقے سلیقے سکھا دیے وہ کیوں نہ بسنے والے گن خود میں لا سکی ارے میری طرح سب برا بھلا سہتی اور رہتی تو مانتی اچھے گنوں والی گھر بساتی ہیں نہ کہ اجاڑتی ہیں میرے سامنے تو تین نندیں ساتھ ساس بھی مقابلہ پر۔

وہاں تو ایسا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ زیبا بولی۔

''بس باجی ہر کوئی آپ کی طرح گھر بنانے والی نہیں ہوتی۔

صبا کے دل و دماغ میں جیسے آندھیاں سی چل

رہی تھیں سماعتوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھیں۔

وہ کیا کر آئی ہے اور کیا سن رہی ہے دل پہ جیسے ایک دم آگہی کے در وا ہوئے تھے۔

''گھر ایثار پسندی اور وفاداری کے اصولوں سے بنتے ہیں ایک دوسرے کی خامیوں کو نظر انداز کر کے محبتوں اور خلوص کے ہنر سے دل فتح ہوتے ہیں جو یہ وصف نہ ہوں تو گھر اجڑنے لگتے ہیں اور گھر اجڑ جائیں تو باقی کیا بچتا ہے نہ دل نہ دنیا۔''

''صباتم سے محبت مجھے سخت رویہ اختیار کرنے نہیں دیتی ورنہ جتنا تم ستاتی ہو بخدا برداشت نہیں ہو پاتا اور تمہیں بہت سخت سزا دینے کو دل کرتا ہے۔تو دیں دے سزا وہ اٹھلائی۔

''نہیں دے سکتا تو یہی انداز تو ہار دیتے ہیں۔'' وہ بے بسی سے کہتا اور وہ کھلکھلا کر ہنستی۔

یہی محبتیں تھیں جو وہ چھوڑ کر چلی آئی تھی یہی محبتیں جو سب خامیوں اور کمیوں کے ساتھ اسے برداشت کیے ہوئے تھیں اور وہ مسلسل ہٹ دھرمی کرتی رہی بھلا کیوں، میاں بیوی کے درمیان ناراضگی خفگی ہوتی رہتی ہے اور محبت اسے آرام سے دور کر دیتی ہے مگر انا اور ضد اسے بڑھاتے بڑھاتے نوبت لاتق تک پہنچا دیتے ہیں جدائی اپنے پر پھیلا دیتی ہے۔

''اور جو جدائی کی رت طویل ہو جائے تو میں کیا اس کے بغیر رہ سکوں گی وہ جو مجھے بری عادتوں کے باوجود مجھے برداشت کرتا رہا، اسے میں اکیلا چھوڑوں نہیں مجھے اس کے ہمراہ چلنا چاہیے خود کو بدل کے زندگی کو سنوارنا چاہیے گھر بسانا ہے بنانا ہے بگاڑنا نہیں۔'' وہ فیصلہ کر کے احمر کا سیل نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''احمر میں تیار ہوں گھر آنے کو آپ مجھے ابھی لے جائیں۔''

''مگر اس گھر میں کچھ نہیں بدلا تمہیں گھر بسانے کو اس گھر کا فرد سمجھ کے سب کو اپنانا ہوگا اور سب کو خوش رکھنا ہوگا احمر سنجیدگی سے بولا۔

''میں سب کروں گی کیونکہ مجھے میرا گھر اور گھر کی خوشی بہت عزیز ہے اور میں اپنے گھر اپنے پیاروں کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔'' وہ بھر آئی آواز میں بولی۔

''ایک بار پھر سوچ لو سمجھ لو کیونکہ کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے۔احمر بولا۔

''احمر میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور میرے لیے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

''ٹھیک ہے میں آفس سے واپسی پر تمہیں لے لوں گا۔آواز میں ہنسی شامل تھی۔

وہ فون بند کر کے مڑی تو زیبا بھابی اور امی کھڑی تھیں۔

''بہت اچھا، بروقت اور درست فیصلہ کیا ہے تم نے اور واقعی اس فیصلے سے بہتر تمہارے لیے کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ گھر بنانے بہت مشکل اور توڑنے بہت آسان ہوتے ہیں ٹوٹنے میں پل بننے میں صدیاں لگتی ہیں، زیبا بھابی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا صبا نے نگاہیں اٹھا کر شکوہ کناں انداز میں لمحہ بھر انہیں دیکھا اور پھر نگاہیں پھیر لیں۔

اور میری بہن جانے سے پہلے ایک غلط فہمی دور کر لو میری زبان سے جو نکلا جو تم نے سنا وہ سب معاف کرنا، مگر اتنا ضرور سن لو کہ وہ سب تمہاری بہتری کے لیے تھا تمہیں ایک برے فیصلے برے وقت کے اثرات اور نتائج سے بچانے کو میں نے اور امی نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت یہ

سب کیا تا کہ تم اپنے گھر کو بچانے کا سوچو، اپنے لیے کچھ درست فیصلہ کرو، سمجھو۔"

وہ تحیر سے آنکھیں پھیلائے انہیں دیکھتی جا رہی تھی۔

تمہارے جھگڑے کے بعد احمر بھائی نے فون کیا تھا اور ساری صورتحال بتا کر امی سے درخواست کی تھی کہ تمہیں سمجھائیں وہ ان سخت الفاظ پر شرمندہ تھے جو انہوں نے تم سے کہے مگر غصہ میں میری بہن ایسے الفاظ نکل ہی آتے ہیں۔ بس پھر ہم نے تمہارے آنے سے پہلے پلاننگ کر لی ورنہ تو نہ تو یہ گھر تم پہ تنگ ہوا ہے نہ یہاں کے مکینوں کی محبت اور خلوص میں کمی آئی ہے سب ویسا ہے جیسا تھا اور چھوٹی بہن سمجھ کر کہہ رہی ہوں ازدواجی و خانگی زندگی کے تقاضے سمجھو۔ ایک چھت کے نیچے رہنا ہی شادی نہیں ایک دوسرے کا احساس کرنا ساتھ دینا اہم ہے۔ برے وقت کو مل جل کر شیئر کرنا بھی ضروری ہے میاں بیوی کو ایک دوسرے کی طاقت بننا چاہیے نہ کہ کمزوری۔

بھابی نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور وہ ان کے گلے لگ گئی۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں بہت خوشیاں اور سکھ دے گا بشرطیکہ خود بھی خوش رہو اور دوسروں کو بھی رکھو۔" وہ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

شام میں احمر اسے لینے آ گئے وہ ان کے ساتھ جانے پر مسرور بھی تھی اور اپنے کیے پر نادم بھی۔

"کتنا اچھا ہے وہ شخص مسکرا کر سب غم بھلا دیے اور میں اس کو دکھ دیتے ہوئے کس حد تک جا رہی تھی۔" اس کی آنکھیں نم ہو کے چھلکنے کو بیتاب ہوئیں تو وہ اندر کو بھاگی۔ بھابی کچھ دیر بعد اسے نہا کر کپڑے بدلنے کا کہہ گئیں۔ اس کے شاور لینے تک کھانا تیار تھا، سب نے ایک ساتھ دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ احمر عین اس کے سامنے تھا گاہے بگاہے اس پہ گہری نظر ڈالتا اور وہ چور سی بن جاتی۔

پھر ڈھیروں محبتوں اور نصیحتوں کے ساتھ وہ احمر کے ہمراہ واپسی کے سفر پہ گامزن ہوگئی۔ اور گھر پہنچتے ہی وہ کچھ دیر صابرہ بیگم کے پاس بیٹھی پھر اپنے کمرے میں آ گئی وہی کمرہ جو اپنے شریک حیات سے اس کی محبتوں اور قربتوں کا گواہ تھا اس نے آنکھیں اٹھائیں تو گویا ساکت رہ گئی پورا بیڈ اصلی گلاب کے تر و تازہ پتیوں سے بھرا مہک رہا تھا اور عین میں درمیان ان کی شادی کی تصویر کے ساتھ بہت خوبصورت کارڈ اور گفٹ پیک تھا یہ خواب تھا یا حقیقت اس کی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں لرزتے ہاتھوں سے کارڈ اٹھا کر کھولا۔

I miss you I love you کے الفاظ کے ساتھ خوبصورت شعر تھے۔

رتجگوں کی داستاں کو تم کہو تو سنائیں تم کو
ہم تو جاگتے ہی رہتے ہیں چلو تھوڑا سا جگائیں تم کو

اس کی آنکھیں خوشی سے برسنے لگیں۔ اتنی محبت اتنی چاہت احمر نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے کو تھام کر رُخ اپنی طرف کیا۔ اور اس نے اپنے بہتے آنسو اپنی ہتھیلیوں کی پشت سے صاف کیے۔ بس کرو یار یہ رونا دھونا بہت ہو گیا اب صرف مسکراہٹیں اور پیار وہ شرارت سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائے۔

اور وہ بھی اپنے محبوب شوہر کو دیکھ کر مسکرانے لگی اور دور کہیں چاند کو بادلوں نے اپنی اوٹ میں چھپا لیا۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

شمع حفیظ

ہتھیلی پر دعا محفوظ رکھنا

یہ کوئی بات نہ ہوئی اماں کے نجومی کا کہا شیطان کا جھوٹ کہہ کر رد کر دیا جائے لکیروں کی زبان کو پڑھ کر مستقبل کا حال بتانا ایک فن ہے اس فن کی قدر کرنی چاہیے۔ یہ گناہ نہیں ہے اماں، آنے والے وقت کا علم اگر پہلے ہی ہو جائے تو بہت سی بلائیں ٹالی جا سکتی ہیں۔ ٹی وی والے بھی.....

اس کی گہری نظر اپنی گلابی ہتھیلی پر چمکتی قسمت کی لکیر پر جمی تھی۔ آج بھی روزمرہ کی مصروفیات کو نمٹا کر فیروزہ کچھ دیر قبل ہی اپنے پلنگ پر آ کر بیٹھی تھی۔ جو اس کے کمرے کی واحد کھڑکی کے

عین مقابل پڑا تھا۔ اماں فرشی دری پر پاس ہی کل کے دھلے کپڑوں کے ڈھیر کو تہہ لگانے کا کام کر رہی تھیں۔ فیروزہ کو ہاتھ پھیلائے لکیروں کو گھورتا پا کر ان کی تیوری چڑھ گئی، کلس کر بولی۔

''اے بنو۔'' کب تک گھورے گی ان موئے ہاتھ کو، آڑھی ٹیڑھی چند لکیروں کے سوا کیا دھرا ہے ان میں؟......'' فیروزہ نے چونک کر نظریں گھمائیں اور اماں کے ملیح چہرے کو دیکھا مگر وہاں ملاحت کی جگہ غصے کی چمک تھی، ان کے آف موڈ کا اندازہ ہوتے ہی اس نے بے ساختہ امڈ آنے والی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا اور قدرے سنجیدگی سے بولی۔''اماں یہ ہی چند لکیریں تو اہم ہیں میرے لیے......ورنہ سچ مچ ان ہاتھوں میں رکھا ہی کیا ہے۔

''اے لو،، بھلا ایسی کون سی اہم لکیریں ہیں ۔جو ہر وقت بڑی فرصت سے بیٹھ کر گھورتی رہتی ہو۔ سچ جانو فیروزہ تمہاری یہ منحوس عادت مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی، کیوں وقت ضائع کرتی ہو اپنا......''

''یہ وقت کا زیاں ہے نہ عادت ہے اماں، بلکہ ایک بہت دلچسپ اور پُر اسرار سا کام ہے، پتا ہے ہاتھوں پہ ابھری یہ لکیریں ہر روز کہیں نہ کہیں سے بدل جاتی ہیں، لیکن قسمت کی لکیر ہے نا یہ ٹھیک سے بنتی ہی نہیں۔ آج بھی ٹوٹی پھوٹی ہوئی ہے، نہ جانے یہ لکیر کب بدلے گی۔ اماں مجھے اپنی قسمت کا حال جاننا ہے کیا آپ کسی اچھے نجومی کو جانتی ہیں؟''

''ارے توبہ کر لڑکی، باؤلی کیوں ہوگئی......؟'' کیا یہ بھی نہیں جانتی کہ ہاتھ کی لکیر جھوٹ ہوتی ہیں یہ فقط نجومی جوتشیوں کا کھیل تماشا ہے بیٹا ،وہی لوگوں کو بے وقوف بنانے کی خاطر اپنی طرف سے الٹا سیدھا گڑتے ہیں اور پیسہ بناتے ہیں اور جو انسان ان کی بتائی گئی من گھڑت باتوں پر یقین رکھتا ہے وہ اللہ کا گناہ گار ہے اور جانتی ہو چالیس دن کی عبادت قبول نہیں ہوگی اس بندے کی۔''

''چالیس دن کی عبادت......؟'' فیروزہ نے تحیر سے آنکھیں پھاڑ کر ماں کو دیکھا۔'' لیکن کیوں اماں بھلا ہماری عبادت سے نجومیوں کی بات کا کیا تعلق ہے۔ عبادت تو اللہ کے لیے ہے۔''

''ارے تعلق ہے نا......'' اماں نے بڑے خشوع وخضوع سے ڈھلکتے دوپٹے کو دوبارہ اپنے سر پر جمایا تھا۔''غیب کا علم صرف اللہ کے پاس ہے فیروزہ۔ وہی جانتا ہے اس نے اپنے بندے کی لوحِ تقدیر میں کیا لکھا ہے کل کیا ہوگا، کیوں اور کیسے ہوگا؟ بس وہی جانتا ہے۔ یہ بھید اس نے کسی کو نہیں دیا۔ یہ جو نجومی اور جوتشی ہوتے ہیں نا، وہ محض اندازہ لگا کر معصوم لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں لیکن اللہ کے کاموں میں اندازے کی مداخلت بہت بڑا گناہ ہوتی ہے، ہمارا رب کہتا ہے جو ان لوگوں کی باتوں پر بھروسہ کرے وہ مجھ پر اپنا یقین کھوئے۔ اس لیے اللہ ایسے بندے کی عبادت قبول نہیں کرتا۔''

''اوفو! اس کا مطلب یہ ہوا کہ ماں نجومی جھوٹ بولتے ہیں نا......؟'' فیروزہ کچھ پریشان ہوگئی تھی۔

''ہاں میری بچی اللہ نے آنے والے کل کا بھید کسی کو نہیں دیا ہے تو پھر نجومی کیا کیا اوقات اندازے لگائے۔ وہ جو کہتے ہیں جھوٹ ہوتا ہے۔ ہمیں صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے کہ وہی دلوں کا حال اور ہماری قسمتوں کا حال جانتا ہے۔''

''وہ سب ٹھیک ہے ماں لیکن نجومی کا کہا کبھی کبھار سچ بھی تو ہو جاتا ہے اب دیکھیے نا، میری سہیلی شاہدہ شادی سے پہلے کسی اللہ والے کو ہاتھ دکھایا تھا۔ اس نے کہا تھا شاہدہ شاد کے بعد دیارِ غیر جا بسے گی اور ایک پردیسی کی سی زندگی گزارے گی اور وہ ہی ہوا اماں، آپ نے دیکھا آفتاب کے افریقہ جانے کے دور دور تک پتا نہیں تھا لیکن شادی کے بعد فوراً بھلا کیسے آناً فاناً وہ باہر چلا گیا، اس کی کمپنی کے بہت سے لوگوں میں سے صرف اُسے ہی چنا گیا تھا۔ عجلت کے باوجود آفتاب نے شاہدہ کا ویزا بھی لگوا لیا اور اُسے بھی ساتھ لے گیا تھا۔ اب بولیے، اگر نجومی جھوٹے ہوتے تو یہ کیا ہے اماں، کیا آپ اس پر یقین نہ کریں گی......؟''

اماں کھل کر مسکرائیں اور فیروزہ کو دیکھتے ہوئے رسان بولیں۔ ''یہ سب تکے ہیں فیروزہ، اندھیرے میں چھوڑے اندازے کے تیر، جو کبھی کبھار درست نشانے پر بھی لگ جاتے ہیں، اللہ اپنے بندے کی آزمائش کے لیے اکثر غلط کو صیح بھی کر ڈالتا ہے۔ وہ آزمائش ہوتی ہے فیروزہ، یاد رکھ شیطان کا دوسرا نام جھوٹ ہے۔ ایسی راہیں دکھاتا ہے جو بظاہر سیدھی اور صاف معلوم ہوتی ہیں، پر اس کی منزل دوزخ کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔''

فیروزہ نے الجھی نگاہوں سے ماں کو دیکھا اور منہ بنا کر بولی۔ ''یہ کوئی بات نہ ہوئی اماں کے نجومی کا کہا شیطان کا جھوٹ کہہ کر رد کر دیا جائے لکیروں کی زبان کو پڑھ کر مستقبل کا حال بتانا ایک فن ہے اس فن کی قدر کرنی چاہیے۔ یہ گناہ نہیں ہے اماں، آنے والے وقت کا علم اگر پہلے ہی ہو جائے تو بہت سی بلائیں ٹالی جا سکتی ہیں۔ ٹی وی والے بھی تو ہر روز موسم کا حال بتاتے ہیں کہ کل فلاں جگہ بارش ہوگی، فلاں شہر میں سورج چمکے گا۔ یہ بھی تو آنے والے وقت کی پیش گوئی ہوئی نا، تو کیا ٹی وی والے بھی جھوٹے ہیں، حالانکہ ان کی خبر پر سب ہی کو یقین آ جاتا ہے کہ اگر ان کے کہے پر کل بارش ہو جاتی ہے تو لوگ کہتے ہیں ہمیں یہ پہلے ہی پتا تھا کہ کل بارش ہوگی، موسم کا حال یہی بتایا گیا تھا، پھر بھی آپ کہیں گی اندازے کے تیر نشانے پر لگ گئے۔؟'' فیروزہ نے بحث کے سے انداز میں ماں کو قائل کرنے کی کوشش کی تو وہ قدرے چڑ گئی تھیں، تندی سے بولیں ''دیکھ فیروزہ بحث میں کچھ نہیں رکھا۔ کیا سچ ہے کیا جھوٹ...... یہ بس اللہ ہی جانتا ہے لیکن پھر بھی تیری سوچ کو الجھنے سے بچانے کے لیے فقط اتنا ہی کہوں گی، اللہ نے تین باتوں کا علم کسی بشر کو نہیں دیا، ایک پیدا ہونے والا لڑکا ہے یا لڑکی، دوسرا موت کب آئے گی اور تیسرا آنے والے کل میں کس کو کیا ملے گا۔ اور کیا نہیں۔ رزق، شفا، بیماری، غم اور خوشی سب ہی کچھ بندے کے نصیب سے ہیں اور ہر ایک کو اس کا کتنا حصہ ملے گا...... کوئی نہیں جانتا اس لیے تو بھی ایسی فضول باتوں پر اپنا دماغ نہ لگایا کر، اس قسم کی باتیں ذہن کو پراگندہ کرتی ہیں اور بندہ الجھنوں میں زندگی گزارتا ایک دن دیوانہ ہو جاتا ہے۔''

''ارے واہ...... آپ تو بندے کو دیوانگی تک لے آئیں اماں، کمال کر دیا آپ نے۔'' فیروزہ تمسخر سے ہنسی تھی، لیکن اماں نے ان سنی کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''فیروزہ جس بات کو چھپانا اللہ کی مصلحت ہے اس کریدنا خلاف فطرت ہوگا بیٹی۔''

ہمیں صرف اللہ کے بھروسے زندگی گزارنی

چاہیے کہ وہی سارے معاملات سلجھانے والا ہے بس اس پر ایمان شرط ہے۔''

''ہاں اماں آپ ٹھیک کہتی ہیں لیکن میرے نزدیک قسمت کا لکھا ٹالا جاسکتا ہے، دعا اور تدبیر انسان کے پاس دو ایسے ہتھیار ہیں، جن کی مدد سے مقدر کی کٹھنائیوں کو شکست دی جاسکتی ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا اماں......؟''

''آئے ہائے تو پگلا گئی ہے لڑکی، خالی دماغ یوں پلنگ پر چڑھ کے نہ بیٹھا کر...... یہ جو خالی دماغ ہوتا ہے نا یہی شیطان کا گھر ہوتا ہے، بندہ فراغت میں بیٹھ کر الٹی سیدھی سوچتا ہے جس کا نہ تو سر ہوتا ہے نہ پیر۔ تجھے بھی فراغت میں صرف شیطان سوجھتا ہے فیروزہ، تب ہی تو ایسی بے کار باتیں ذہن میں آتی رہتی ہیں۔'' اماں زچ ہو گئیں اور اس کی طرف سے رُخ موڑ کر جلدی سے کپڑوں کو سمیٹنے لگی تھی لیکن فیروزہ کو اپنی کومل ہتھیلی پر ٹوٹتی بنتی قسمت کی لکیر کو پھر سے دیکھنے لگی۔ نہ جانے تقدیر میں ابھی اور کتنے انہونے موڑ آنے تھے اور کب اسے ان حالات سے چھٹکارا ملنے والا تھا۔ جن کا اسے ہر روز سامنے کرنا پڑتا تھا۔

کتنی مشکل زندگی تھی ماں بیٹی کی، اماں بوڑھی ہو کر بھی گھر سنبھال رہی تھیں اور وہ اسکول میں پڑھانے کے بعد شام کو ڈھیر سارے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر گھر کا خرچہ نکالنے کی کوشش کرتی تھی، ابا کے گزرنے کے بعد آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ رہا تھا۔ ان کی پینشن اتنی معمول تھی کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ مہنگائی کے اس دور میں دو بندوں کا گزارہ بھی کس قدر مشکل تھا، اس پر بجلی گیس اور پانی کا بل ہر ماہ عذاب کی طرح نازل ہوجاتا تھا۔ فیروزہ کو لگتا ہے جیسے وہ ان بلوں کو بھرتے بھرتے زندگی ہار دے گی۔ وہ تو شکر تھا کہ چھت اپنی تھی ورنہ کرائے کے گھر میں رہنا ان کے لیے ممکن ہی نہ تھا، ابا نے زندگی ہی میں تھوڑی بچت کر کے دو کمروں کا فلیٹ بک کروالیا تھا، گو کہ وہ بہت چھوٹا تھا لیکن بڑی بہن کی شادی کے بعد اماں اور فیروزہ آرام سے زندگی گزار رہے تھے۔ آپا کی شادی کے فوراً بعد ابا دل کے دورے میں چل بسے تو فیروزہ کو مجبوراً اسکول میں نوکری کرنی پڑی تھی۔ اماں کے ساتھ فیروزہ نے باپ کی وفات کے بعد زندگی کو نئے سرے سے شروع کیا تھا۔ اماں نے شوہر کا دکھ اپنے اندر اتار لیا تھا۔ اور بیٹی کے سہارے بڑے حوصلے سے کسمپری کے دن گزار رہی تھیں۔

ابا کے بعد فیروزہ پہلے سے زیادہ ماں کا خیال رکھنے لگی تھی۔ وہ ابا کی طرح انہیں ہر طرح کا سکھ دینے کی خواہاں تھی لیکن قسمت کی بنتی بگڑتی لکیر نے جیسے سب ہی جگہ روک لگا رکھی تھی۔ گزارہ تو ہوجاتا تھا لیکن کھینچ تان کر، اور وہ کھینچا تانی فیروزہ کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی مہینے کے آخری دنوں میں اُسے اپنے خالی ہاتھوں سے وحشت ہونے لگتی تھی۔ رقم ختم ہوجاتی تھی تو گھر میں جیسے ہر چیز کی تنگی شروع ہوجاتی اماں صبر و سکون سے آخری تاریخوں کے وہ چند دن گزارتیں اور اُسے بھی شکر گزاری کی تلقین کرتیں لیکن فیروزہ دل برداشتہ وہ کر ہاتھوں کی لکیروں کو گھورنے لگتی اور سوچتی آخر مقدر میں اور کتنے سختی و تنگی لکھی ہے۔ زندگی میں کب وہ دن آنے والا ہے جب وہ بھی بڑی شان و کروفر سے ایک بڑے گھر کے کشادہ بیڈروم میں دن چڑھے اپنی مرضی سے سو کر اٹھے پاتی۔ آرام و آسائش بھری زندگی کی ہر نعمت سے لطف اندوز ہوتی اور آسودہ حال لوگوں کی طرح بے فکری سے

جیتی اور خوش باش رہتی۔
اچھی زندگی گزانا ایک ایسا من چاہا، کھلی آنکھوں دیکھے جانے والا خواب تھا، جو فیروزہ کی کمزوری بن چکا تھا۔ اسے اپنی زندگی سے بے حد شکایت تھی۔ اسے بھی وہ سب کچھ درکار تھا جو ایک مستمول گھرانے کے کسی بھی فرد کی ضرورت تھا۔ فیروزہ کو کسی شارٹ کٹ کی تلاش تھی۔ جو اسے قسمت کی سنگینی سے نکال کر سکھ بھری آسائش زندگی میں داخل کر دیتا۔
لیکن وہ شارٹ کٹ اس کی زندگی میں کہیں نہیں تھا کیونکہ اسے اپنی سفید کومل ہتھیلی پر موجود قسمت کی لکیر ابھی پوری طرح بنتی دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی سیدھی اور متوازی لکیر اچھی قسمت کی پہنچان ہوتی ہے۔ اُسے اپنی واحد سہیلی شاہدہ کی بات یاد آتی تو وہ بے چین ہو جایا کرتی تھی۔ شاہدہ ٹھیک کہتی تھی اس کے ہاتھوں کی ریکھا کتنی چمکدار اور خط مستقیم کی طرح سیدھی اور صاف تھی۔ وہ بھی ایک غریب گھر کی لڑکی تھی لیکن آفتاب سے شادی کے بعد کیسے کھٹ سے افریقہ جا پہنچی تھی۔ کیپ ٹاؤن خوابوں کی جنت تھا۔ جہاں وہ سکون بھری پُرتعیش زندگی گزار رہی تھی وہاں سے آنے والا ہر خط اور مسیج فیروزہ کو اپنی کم مائیگی کا احساس دلانے میں پیش پیش رہتا۔ شاہدہ بڑی تفصل سے اپنے محل جیسے گھر کا نقشہ کھینچا کرتی تھی۔ اس پر آفتاب کی محبت سونے پر سہاگہ کے مصداق تھیں، فیروزہ کو اپنی سہیلی دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی نظر آتی اور خیالوں میں الجھ کر اکثر دل میں تہیہ کیا کرتی کہ وہ بھی کسی امیر آدمی سے شادی کرے گی۔ جو اُس کی زندگی کا حلیہ بدل دے گا۔ قسمت کی لکیر بدلے یا نہ بدلے لیکن وہ اپنی کوشش اور تدبیر کو بدلنے کی حتی المکان کوشش کرے گی۔
ایسی سوچیں فیروزہ کے من میں طمانیت بھر دیا کرتی تھیں۔ اور وہ اپنی شادی کو لے کر بڑے ملٹی کلر کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ یہ خواب فرصت کی گھڑیوں میں جاگتی آنکھوں میں آیا کرتے تھے کیونکہ جو خواب فیروزہ کی چاہت تھے وہ بند آنکھوں اور سوئے دماغ سے دیکھنا نہ ممکن تھا۔ غربت بھری زندگی کا سب سے بڑا فائدہ شاید یہی ہے کہ انسان جاگتی آنکھوں سے وہ سارے خواب سپنے دیکھ کر آسودہ ہو جاتا ہے۔ جو اس کی تمنا اور خواہشات کی انتہا ہوتے ہیں۔ وہ سپنے زندگی میں پورے نہ بھی ہوں تو ان کا نشہ غربت و افلاس کے دنوں میں سو طرح کے غم بھلائے رکھتا ہے۔ فیروزہ بھی ویسے نشے میں مدہوش رہنا چاہتی تھی۔ لیکن اماں جو جوان جہان بیٹی کے یہ اطوار ایک آنکھ نہ بھاتے اور وہ اُسے اکثر ٹوکا کرتی تھیں۔
لیکن فراغت میں فیروزہ کے بس دو ہی مشغلے تھے، ہاتھوں کی لکیروں سے الجھ کر خواب بنتے رہنا۔ اور دوسرا کھڑکی کے مقابل پڑے پلنگ پر نیم دراز ہو کر باہر تکتے رہنا۔ جہاں سے دور تک پھیلے ہوئے بنگلوں کی قطار کا نظارہ فیروزہ کے لیے ایک نئی دنیا کا در کھولتا تھا۔ فیروزہ جس بلڈنگ کی رہائشی تھی، وہ سڑک کے رُخ پر واقع تھی۔ جس کے پار کافی دور تک پرائیویٹ بنگلوں کی ایک وسیع دنیا آباد تھی۔ فیروزہ جس کھڑکی میں منہ دیے ان بنگلوں میں بڑی آسانی سے تاک جھانک کر لیا کرتی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک چھوٹی دوربین بھی خرید لی تھی۔ جسے آنکھوں پر لگا کر وہ دور کے منظر کو بہت پاس سے بہت صاف دیکھا کرتی تھی۔ گو کہ تانک جھانک کرنا ایک قبیح

فعل تھا، لیکن فیروزہ کے لیے سب کچھ جائز تھا۔ ان بڑے گھروں میں بسنے والے بڑے لوگوں کی زندگی کے انوکھے رنگ ڈھنگ اور روزمرہ کے معمولات اس کے لیے بے پناہ دلچسپی کے حامل تھے، اپنی فراغت اور بوریت بھرے لمحات کو رنگین کرنے کی خاطر اس سے زیادہ دلفریب مشغلہ فیروزہ کے پاس کوئی دوسرا نہ تھا۔ وہاں ہر گھر کی زندگی دوسرے گھر سے مختلف تھی۔ کیونکہ رہائش اور طرز زندگی کا انداز رہنے والوں کی اپنی پسند، معیار اور سہولت کے مطابق تھا۔ وہ ایک طرح سے فیروزہ کا پڑوس بھی کہا جا سکتا تھا کیونکہ اُدھر کچھ بنگلوز کے مکینوں سے فیروزہ کی ذاتی جان پہنچان تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ان گھروں کے بچے فیروزہ کے پاس ٹیوشن کے لیے آیا کرتے تھے۔ ان بچوں کے توسط سے بھی فیروزہ کو ان گھروں کے دیگر افراد کے بارے میں بھی گھن سن مل جایا کرتی تھی۔

کشادہ اور خوبصورتی کی مثال بننے والے ان بنگلوں میں بسنے والے کی سی زندگی فیروزہ کی خواہش بن گئی تھی۔ وہ ان کی خوشی سے بھری بے فکری کی زندگی دیکھ کر خود بھی ان گھروں کا حصہ بن جانا چاہتی تھی لیکن ایسا ممکن نہ تھا، درمیان میں قسمت تھی اور وہ بھی بدقسمت۔ جو بگڑے کام بھی بننے نہ دیتی تھی۔ سو مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا نہیں کرتا کے مصداق وہ سچائی فیروزہ کا دل توڑ جاتی۔ انسانی تفرق اور اس کی درجہ بندی۔ بھی کس قدر اذیت بھرا احساس ہے، غربت و امارت کی تقسیم انسانیت کی جس درجہ بندی کرتی ہے وہی درجہ بندی فیروزہ کو بے حد گراں گرزتی تھی کیونکہ ایسی شاہانہ زندگی جینے اور ان خوبصورت پُرآسائش گھروں میں رہنے کا کوئی راستہ صاف اور سیدھا نہیں ہوتا۔ انہیں حاصل کرنے کے لیے چور راستے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ فیروزہ بھی ایسے ہی کسی چور راستے کی تلاش میں بھی جو اُسے زندگی کی تمام تر سہولیات کے ساتھ عزت و مرتبہ بھی فراہم کرتا۔ لیکن خواب دیکھنا اور ان کی تعبیر پانا دو الگ باتیں تھیں۔ ہر خواب سچا ہو، یہ ضروری نہیں ہوتا سو فیروزہ کی الجھی سوچیں خواب بنتے بنتے اب مایوسی کے سمندر میں اترنے لگیں۔

اماں کو فیروزہ کا اس طرح کھلی کھڑکی میں بیٹھ کر پہروں گم صم رہنا سخت ناپسند تھا۔ وہاں بے پردگی کے ساتھ غیروں کی نظروں میں آنے کا احتمال بھی تھا۔ غربت میں ایک عزت ہی ہوتی ہے۔ جو بڑی دولت کہی جا سکتی ہے۔ اور اماں کو اپنی وہ دولت بے پناہ عزیز تھی۔ وہ بارہا فیروزہ کو ٹوک چکی تھیں کہ یوں ننگے سر کھڑکی میں بیٹھ کر نہ جھانکا کرو۔ جانے کون گلی سے گزرتے اس پر گندی پر ہوس نگاہ ڈالتا ہو۔ لیکن فیروزہ کو کسی کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اب یہ کہ اس کی ماں کہاں جانتی تھیں کہ اس لڑکی کے بے تاب دل میں کیسے خیالات طوفان بن کر اُمڈا کرتے ہیں۔ جس بات پر اماں معترض تھیں۔ وہی بات درحقیقت فیروزہ کے دل کا ارمان تھ کہ کوئی ہوتا جو اس پر نگاہ غلط ڈال کر ترچھی نظر کا کوئی پیام دیتا اور زندگی گزارنے کے لیے اُسے اپنا ہم سفر چنتا ہاں وہ جیسا بھی ہوتا لیکن رہتا ان بنگلوں میں جہاں رہنا خود فیروزہ کی اولین خواہش تھی۔ کسی صاحب حیثیت بندے کی وائف کہلانا اور بیگمات کی طرح یہ بڑی بڑی گاڑیوں میں قیمتی پوشاک پہن کر گھومنا اُسے بے حد پرکشش اور اہم لگتا تھا۔

یوں تو فیروزہ کو اپنے کمرے کی کھڑکی سے نظر آتے ہوئے شاندار بنگلے کی زندگی طلسمی ہی دکھائی

دیتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر ارباز کا بنگلہ اُسے بطور خاص پسند تھا۔ ڈاکٹر ارباز ایک شادی شدہ مرد بلکہ دو خوبصورت اور صحت مند بچوں کا باپ تھا۔ اُسے اپنی بیوی سے از حد محبت تھی۔ وہ اکثر اوقات گھر کے بڑے سے گراسی لان میں بیوی کی رفاقت میں مسرور اور شام کام نظر آتا۔ اس کا والہانہ انداز سے بیوی کو تکنا اور کانوں میں سرگوشی سے کچھ ایسا کہنا جو فیروزہ کو فاصلے سے ہی محسوس ہو جاتا کیونکہ اس کی بیوی شوہر کی توجہ اور محبت کا کر بیر بیوٹی بن جایا کرتی تھی۔ اس کا لال چہرہ اور شرمگیں انداز خود فیروزہ کے من میں آگ سی دہکا دیتا تھا۔

ڈاکٹر ارباز عموماً شام کے اوقات میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ لان کی ٹیبل پر چائے سے لطف اندوز ہوا کرتے تھا۔ اس کے بچے پھولوں سے بھرے لان کی غالیچے جیسی سرسبز گھاس پر کھیلتے کودتے، شور مچاتے رہتے اور دونوں قریب بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ ان کے راز و نیاز جاری رہتے اور مسز رعنا کا حیا سے دمکتا چہرہ فیروزہ کو اتنا خوبصورت لگتا کہ وہ خود بھی کسی مرد کی محبت بھری سرگوشی سننے کی تمنائی رہنے لگی تھی۔ اور وہ رمنا عمر کے اس حصے میں فیروزہ کے دل میں خود سر اٹھایا کرتی تھی کیونکہ وہ ابھی محض بائیس سال کی ہی تھی۔ ڈاکٹر ارباز کا خوبصورت بنگلہ گلی کے کارنر کا پہلا بنگلا تھا، قریب تر ہوئے کی وجہ سے فیروزہ کو تاک جھانک میں سہولت رہتی اور ان میاں بیوی کے محبت بھرے انداز کی وجہ سے وہ گھر فیروزہ کی دلچسپی کا خاص مرکز تھا، اس گھر کی زندگی پرسکون اور دل آویز تھی۔ ڈاکٹر ارباز کے بچے ابھی بہت چھوٹے تھے۔ بیٹا چار سال کا اور بیٹی ڈھائی سال کی تھی۔

دونوں بچے والدین کی آنکھوں کا تارا تھے۔ فیروزہ کو اس گھر کی ہر روٹین کی تفصیل از بر ہو چکی تھی۔ کچن کہاں تھا، بیڈ روم کون سا تھا، بچوں کا کمرہ، ڈرائنگ روم اور ٹی وی لاؤنج کس سمت میں واقع ہے، اسے سب خبر تھی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے فیروزہ ڈاکٹر ارباز کے گھر سے مکمل آشنائی حاصل رکھتی تھی، اگر کبھی اسے ڈاکٹر ارباز کے گھر جانے کا اتفاق ہوتا تو وہ بہت سہولت سے ہر کمرہ اور ہر گوشے کو نا صرف شناخت کر لیتی بلکہ وہاں سجی ہوئی ہر شے کے بارے میں تفصیل سے بتا سکتی تھی۔ اس گھر کا معمول صبح سے شام تک اس کے لیے شناسائی کا واضح احساس رکھتا تھا، ڈاکٹر ارباز صبح کتنے بجے اسپتال کے لیے نکلتا تھا۔ اس کی بیوی کب سو کر اٹھتی تھی اور کس طرح بچوں کے ساتھ دن گزارتی فیروزہ کو ہر تفصیل سے از بر تھی۔ اسے اس گھر کے لوگوں کے ساتھ ان معمولات سے بھی دلچسپی تھی۔ شاید اسی لیے فیروزہ کی توجہ ہمیشہ ڈاکٹر ارباز کے گھر کی اور رہا کرتی تھی۔ باقی گھروں میں تانکا جھانکی کا معمول اس کے بعد ہوتا تھا۔

فیروزہ کے اسکول کی گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو اسے بھی گھر پر قدرے سکون سے بیٹھنا نصیب ہوا تھا۔ آج کل اپنے ہاتھ کی لکیروں سے اس کی دلچسپی عروج پر تھی۔ چند دن پہلے اخبار میں ایک مسہور پاسٹ کا انٹرویو شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر فیروزہ کو ہاتھ کی لکیروں کا کافی علم حاصل ہوا تھا۔ اس انٹرویو میں مختلف لوگوں کے ہاتھوں کے چند زائچے بھی شائع کیے گئے تھے۔ جن کے بارے میں ہاسٹ نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ان زائچوں کو دیکھ کر اس نے جو باتیں کہی تھیں وہ من وعن درست ثابت ہوئیں تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ

ہاتھوں کی لکیریں بولتی ہیں اور ان کی زبان کو سمجھنا ایک فن ہے اور حکومت کو اس فن کی سرپرستی کرنی چاہیے۔ کیونکہ مستقبل کا احوال بتانے سے آنے والے وقت کی بہت سی مشکلات سے چھٹکارا پایا جا سکتا تھا۔ لیکن لوگ خود میں مگن رہ کر آلام کے درمیان جانے کیوں اتنے مطمئن انداز میں جی رہے تھے۔

ایسی گفتگو فیروزہ کی کمزوری کہی جا سکتی تھی۔ وہ آپ مصیبت کے عذاب سے نجات کی خواہاں تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ کسی دن وقت نکال کر اس نجومی سے ایک بار تو ضرور ملے گی۔ کیا پتا وہ اُسے کسی بڑے آدمی کی بیوی بننے کا مژدہ سنا کر آسودہ حال زندگی گزارنے اور کسی بڑے گھر میں منتقل ہونے کی خوشخبری دے سکتا ہو لیکن اماں نے نجومیوں کو جھوٹا کہہ کر اس کا منہ کڑوا کر ڈالا تھا۔ لیکن فیروزہ کو یقین تھا کہ اتنے سارے نجومیوں میں سے کوئی ایک تو ایسا ہوگا۔ جو اللہ کے ودیعت کردہ غیب دانی کے علم سے ہر خاص و عام کے دکھ درد دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوگا۔ کوئی ایک تو ضرور ہوگا...... کوئی ایک، جو اس کی نیا بھی پار لگا دے گا۔

فیروزہ کی سوچیں الجھنوں کے جال میں لپٹ کر اسے بے چین کر جاتیں تو وہ کھڑکی کھول کر بنگلوں میں تانکا جھانکی شروع کر دیتی۔ اس کی کھڑکی سے ڈاکٹر ارباز کے گھر سے لے کر کالونی کے آخری بنگلے تک...... جہاں تک اس کی نگاہ کی رسائی تھی۔ اپنی دلچسپی کا مواد ڈھونڈ نکالتی اور وقت گزارتی تھی۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں ہی آپا کی ڈیلیوری کا وقت آن پہنچا تھا، فیروزہ کے بہنوئی صادق نے اماں سے درخواست کی تھی کہ وہ آ کر کچھ دن تک آپا کو سنبھال لیں، صادق بھائی کے والدین حیات نہ تھے اور بہن بھائی سب شادی شدہ اور دوسرے شہروں میں آباد تھے۔ سو دوری کی وجہ سے انہوں نے اماں سے مدد مانگی تھی۔ بیٹی کے سسرال کا معاملہ تھا، اماں انکار نہ کر سکیں یوں دوسرے ہی دن فیروزہ کو ساتھ لیے وہ اس کی آپا کے یہاں چلی گئیں۔ چند دن کے بعد آپا کے ہاں گول مٹول سا بیٹا پیدا ہوا تھا، صادق بھائی اور اماں کی خوشی دیدنی تھی، فیروزہ کو بھی اپنا پہلا بھانجا بہت پسند آیا تھا، لیکن آپا کی حالت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ انہیں سنبھلنے میں کچھ دن اور لگ گئے۔ اماں اور فیروزہ نے مل کر ان کی خوب خدمت کی تھی۔ نا صرف ان کا بلکہ شوہر اور بچے کا بھی خوب خیال رکھا تھا۔ تقریباً بیس دن بعد وہ دونوں اپنے گھر لوٹ کر آ سکی تھیں۔

فیروزہ کے گھر لوٹتے ہی ٹیوشن پڑھنے والے بچے روٹین کے مطابق اگلے ہی دن آ دھمکے تھے۔ بچوں کے آنے سے وہ اداسی دور ہونے لگی تھی۔ جو فیروزہ کو آپا کے گھر سے آنے کے بعد لاحق تھی۔ پھر وہی روزمرہ کی روٹین زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔ فیروزہ کام کاج سے فراغت پا کر کھڑکی میں آ کر بیٹھ جاتی اور نظارہ کرتی رہتی تھی۔ وہ جب سے آپا کے گھر سے لوٹ کر آئی تھی۔ ڈاکٹر ارباز کا بنگلہ ویرانی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ کوئی آواز اور کوئی ہلچل گھر پر چھائی خاموشی کو دور نہ کرتی تھی، جانے وہ سب کہاں چلے گئے تھے۔ پورا گھر ہمہ وقت خاموشی میں ڈوبا رہتا تھا۔

فیروزہ نے سوچا کہ ہو سکتا ہے وہ سب چھٹیاں گزارنے کسی ہل اسٹیشن پر چلے گئے ہوں گے۔ وہ اس گھر کے مکینوں کی کمی کو بہت محسوس کر رہی تھی۔ اور اکثر فراغت میں بے دھیانی کے ساتھ

اس بنگلے کے کالی در و دیوار کو تکتی رہتی تھی۔
ایک دن وہ بچوں کو ٹیوشن پڑھانے میں مگن تھی جب اچانک اس کے سر چڑھے شاگرد وقاص نے اپنی کاپی فیروزہ کے آگے رکھتے ہوئے کہا تھا۔
''آپی مجھے ایک خط لکھ دیجیے......''
''خط......؟'' فیروزہ نے حیرانی سے چار سالہ وقاص کو دیکھا۔ ''کیوں وقاص بھلا تمہیں کسے خط لکھوانا ہے۔''
''ذوہیب کو......'' اس نے معصومیت سے کہا۔
''کون ذوہیب......؟'' فیروزہ کو کچھ سمجھ نہ آئی تھی۔
''وہ، جو میرا دوست ہے اور گلی کے کارنر والے گھر میں رہتا ہے۔ آپ کو پتا ہے آپی وہ اب ہمیشہ کے لیے اپنی دادو کے پاس چلا گیا ہے۔''
''اوہ اچھا...... لیکن میں ذوہیب کو نہیں جانتی وقاص۔'' فیروزہ نے عدم دلچسپی سے کہا۔ تو وقاص برا مان گیا اور اٹھ کر کمرے کی کھلی کھڑکی میں کھڑا ہو کر ڈاکٹر ارباز کے گھر کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ''آپی وہ ذوہیب کا گھر ہے، کیا آپ اُسے نہیں جانتیں......؟''
فیروزہ کی نظر وقاص کی انگلی کا تعاقب میں ڈاکٹر ارباز کے بنگلے کی طرف اٹھی تو وہ از خود مسکرائی تھی، وقاص کے نزدیک جا کر نرمی سے بولی۔
''کیا تم ڈاکٹر ارباز کے بیٹے کی بات کر رہے ہو......؟''
''جی آپی، اس کا نام ذوہیب ہے اب وہ اپنی دادی کے گھر میں رہتا ہے، مجھے اس کے لیے ایک خط لکھوانا ہے کیا آپ لکھیں گی......؟''
فیروزہ اس کی محبت اور اسرار پر ہنس دی، اسے گود میں بٹھاتے ہوئے بولی۔ دیکھو وقاص اب گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے کو ہیں ذوہیب بھی اپنی فیملی کے ساتھ بہت جلد گھر لوٹ آئے گا۔ اسے بھی اسکول جانا ہوگا، پھر خط لکھنے سے کیا فائدہ ہوگا......؟''
''نہیں آپی! وہ اب کبھی نہیں لوٹ کر آئے گا۔ اس کے پاپا کہہ رہے تھے کہ ذوہیب اب اپنی دادو کے ساتھ ہی رہے گا۔''
''لیکن کیوں وقاص...... والدین کے ہوتے ہوئے بھلا وہ اپنی دادو کے پاس کیوں رہے گا......؟'' فیروزہ نے الجھ کر پوچھ لیا تو وہ روہانسا ہو گیا تھا۔
''اس لیے آپی کہ ذوہیب کی امی مر گئی ہیں اور اب اُسے کوئی سنبھالنے والا نہیں رہا۔
''کیا مطلب...... فیروزہ پر جیسے بجلی سی گر گئی، سانس جیسے سینے میں ٹھہر ہی گیا تھا۔ اسے لگا گھر کے در و دیوار ہل گئے ہوں۔
''یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے وکی نہیں، نہیں کیا ڈاکٹر ارباز کی بیوی مر گئی ہے......؟'' وہ دیوانوں کی طرح وقاص سے پوچھ رہی تھی۔
'میں سچ کہہ رہا ہوں آپی، شام کو میرے ابوان کے جنازے پر بھی گئے تھے۔ اس بار وقاص کے بجائے تفصیل ایک دوسرے بچے نے بتائی تھی، فیروزہ کی آنکھیں جل تھل تھیں، دل کے اندر جیسے کوئی کانچ سا ٹوٹا تھا۔ وہ بے اختیار رونے لگی تھی۔
''ہائے اللہ، کیا گزر رہی ہوگی ڈاکٹر ارباز پر...... وہ کس قدر چاہتے تھے اپنی بیوی کو......''
فیروزہ ان کی محبت کی گواہ تھی۔ وہ ان کی آپس کی انڈر اسٹینڈنگ کی عینی شاہد تھی۔ وہ خوب جانتی تھی ڈاکٹر ارباز بیوی کے لیے کس قدر جذباتی رہا

کرتے تھے۔ اور انہیں ہونا بھی چاہیے تھا کہ وہ عورت تھی ہی خوبصورت، اس کا نازک سراپا، شادابی اور حسن کا شاہکار تھا۔ اس پر اس کی نرم گفتاری اور شوہر کے التفات پر سمٹ سمٹ جانا اتنی دور ہو کر بھی فیروزہ کو صاف طور پر محسوس ہو جایا کرتا تھا۔ یقیناً ڈاکٹر ارباز کی بیوی ایک سلجھی ہوئی، پڑھی لکھی اور محبت کرنے والی عورت تھی۔ جسے شوہر کے دل میں گھر کرنے کا ہنر خوب آتا تھا۔

''اُف ...... کیسے مر گئی وہ......؟'' کیا ہوا تھا اسے جو یوں جھٹ پٹ آگے تیاری کر لی تھی۔''

فیروزہ نے احمر کو بے ارادہ ایک وحشت سے تھامتے ہوئے پوچھا تو وہ کچھ گھبرا سا گیا، بو کھلاہٹ سے بولا۔ ابو کہہ رہے تھے انہیں کینسر تھا۔''

''کینسر......؟'' فیروزہ کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔''ایسی موذی بیماری جو لا علاج ہے اب تک...... آئے ہائے......؟''

''جی آپا...... ان کے گھر کے لوگ بھی سب کو ایسا ہی کچھ بتا رہے تھے، میں امی کے ساتھ ذوہیب کے گھر گیا تھا۔ وہ بہت رو رہا تھا۔''

''ہائے بے چارے معصوم بچے...... کیسے جئیں گے اپنی ماں کے بغیر، اف اللہ کتنا سر چڑھا رکھا تھا اس عورت نے اپنے دونوں بچوں کو۔ وہ ان کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھی، نوکروں کے باوجود اس نے پورا گھر، بچے اور شوہر کی ذمہ داری بہ خوبی سنبھال رکھی تھی۔'' فیروزہ رونے لگی تھی۔

اس کی بے قرار نگاہیں ایک بار پھر ڈاکٹر ارباز کے گھر کی جانب اٹھی تھیں۔ لان میں پڑی کرسیوں پر نظر پڑتے ہی اسے بے اختیار مسز رعنا کا گلابی پڑتا چہرہ یاد آیا تھا۔ وہ شوہر کی محبت بھری سرگوشی سن کر شرم وحیا سے سمٹ جایا کرتی تھی۔ وہ ضبط کی کوشش کے باوجود سارے اختیار کھو بیٹھی اور اپنے پلنگ پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اس عورت کی اچانک موت فیروزہ کو گھر کے کسی فرد کی موت کا احساس دلا رہی تھی۔

پھر اگلے کئی دن تک فیروزہ اس صدمے سے نہ نکل سکی تھی۔ ڈاکٹر ارباز اور ان کی بیوی ہر چیز، ہر خیال پر حاوی ہو گئے تھے، فیروزہ جب سوچتی بس ان ہی کے بارے میں سوچتی۔ تب دل ٹکڑے ہوتا محسوس ہوتا۔ اور آنکھیں نمکین پانی سے بھر جاتی تھیں۔

گرمی کی چھٹیوں کے بعد اسکول کھل جانے پر بھی فیروزہ کی اُداسی دور نہ ہوئی تھی۔ زندگی ایک بار پھر مصروفیت کے دائرے میں چکرانے لگی تھی۔

وقت لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتا رہا اور پھر اگلے کئی دن گزرتے چلے گئے تھے۔ دل پر چوٹ پڑی تھی۔ سو فیروزہ نے کھڑکی میں بیٹھنا اور باہر کی سن گن لینا ترک کر دیا تھا۔ اب وہ موٹی موٹی کتابیں پڑھنے لگی تھی۔ کتابوں نے شعور بخشنے کے ساتھ خواب دیکھنے کی عادت کو اور بھی پختہ کر دیا تھا۔ وہ خود کو مصروف رکھنے لگی تھی۔ موڈ میں ہوتی تو اماں کے ساتھ سلائی کڑھائی کا کام بھی نمٹا دیا کرتی تھی، ہاتھوں کی قسمت کی ریکھا تو ترستے رہنا آج بھی جاری تھا۔ من کی خواہشات او لاکھوں تمنائیں پوری کرنے کا خواب وہ اسی ایک لکیر کی بنتی بگڑتی قوسوں اور زاویوں میں ڈھونڈا کرتی تھی، ہاتھوں کی لکیروں سے بننے والے دائرے، مربعے اور تکون فیروزہ کو معروف پامسٹ کے بتائے زائچوں کے مطابق دکھائی دیتے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں کے ابھار سے لے کر ہر قوس اور دائرے میں دولت کے انبار تلاش کرتی تھی اور

زندگی کی منہ بند خواہشات کو کھولنے کی تدابیر سوچتی رہتی تھی۔

اب اماں بھی اس کے ہاتھوں کو تکتے رہنے کے خبط سے چڑنا بھول گئی تھی۔، وہ جانتی تھیں ان کے سمجھانے کا فیروزہ پر مطلق اثر ہونے والا نہ تھا اور وہ ایسا سوچنے میں حق بجانب تھی کیونکہ اس دن اس نے اپنے اسکول کی ایک دوست ٹیچر کے ہمراہ فیروزہ ستاروں کا احوال صرف ہاتھ کی لکیروں سے جان کر ان کے راز بتانے والے ماہر نجوم بابا بڑے صاحب کے آستانے پر جا پہنچی تھی۔ وہاں اچھا کا صارش تھا۔ اس دن فیروزہ کو پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ ہاتھ کی لکیروں پر اعتقاد رکھنے والے اسی جیسے ہزاروں دیوانے تھے۔ ان کی تعداد فیروزہ کی سوچ سے بھی زیادہ تھی۔

ہر شخص زندگی میں در آنے والی الجھنوں اور آفتوں کو کم کرنے کا آرزومند تھا۔ لکیروں میں چھپی قسمت کا احوال دلچسپی غالباً اس لیے بھی تھی کہ وہ لوگ ایمان کے کچے اور زندگی کے عذاب فوری کم کرنے کے خواہش مند تھے۔ انہیں اس مدت سے سروکار تھا۔ جس کے گزرتے ہی ان کی زندگی کے گھمبیر مسائل سے نجات مل پا سکتی ہے۔ زندگی میں سہولت اور سکون نہ ہو تو جیسے لٹک جاتی ہے اور وہاں آنے والوں کی زندگی سولی پر ٹنگی تھی۔

وہاں سب کی باری لگی تھی۔ بابا صاحب خاصے مصروف انسان تھے، اُن کے آستانے کا رش ان کی مقبولیت کے گراف کو ظاہر کرتا تھا۔ فیروزہ کی باری آئی تو وہ اپنی ساتھی ٹیچر کے ہمراہ ہی بڑے صاحب کے کمرے میں داخل ہوئی۔ چھوٹا سا کمرہ دبیز ہرے اور سرخ رنگ کے پردوں کی باعث جیسے اندھیرے میں ڈوب رہا تھا۔ دیواروں پر عبارتوں اور ہندسوں سے مزین کئی کلینڈر جسے حساب کتاب کی صورت لگائے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ہاتھ کے بنے ذائچے اور نقش کئی جگہ آویزاں تھے۔ جو پنکھے کی ہوا سے جھول رہے تھے۔۔

بابا صاحب ایک لکڑی کے تخت پوش پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے آرام دہ انداز میں یوں بیٹھے تھے۔ جیسے کسی مشاعرے میں شراکت کے لیے بیٹھے ہوں۔ ان کے بال کندھے پر جھول رہے تھے۔ آنکھیں ابلی ہوئی اور ناک کھڑی تھی۔ ان کے آبرو بھی سفید تھے اور ہاتھ میں پکڑی بڑے منکوں والی تسبیح کا رنگ بھی سفید تھا۔ وہ ہرا چوغہ پہنے آنے والیوں کا عقابی نظر سے جائزہ لے رہے تھے۔ ادھر وہ دونوں لڑکیاں گھبراہٹ محسوس کرتیں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کمرہ اپنے ملگجے دھندلے ماحول کی وجہ سے خاصا پُراسرار نظر آ رہا تھا۔

''بیٹھو بی بی!......'' بڑے صاحب کی آواز خاصی بھاری بھرکم تھی۔ وہ دونوں چونک کر خجالت سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر قدم بڑھا کر اس کے سامنے پڑے بینچ پر جا بیٹھیں۔ فیروزہ کی دوست عصمت کچھ خوفزدہ تھی۔ لیکن فیروزہ متجسس اور مشتاق دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

''بولو! بیٹا کیا چاہتی ہو تم......؟'' بابا صاحب نے انہیں گھورتے ہوئے نرمی آمیز تحکم سے پہلا سوال پوچھا۔ تو فیروزہ نے بوکھلا کر انہیں دیکھا اور پھر تذبذب سے بولی۔'' فقط چاہنے سے کیا ہوتا ہے بابا جی...... چاہنے سے قسمت کہاں بدلتی ہے چاہنا تو عذاب ہوتا ہے۔''

بابا صاحب مسکرائے ''ہوں بات تو ٹھیک ہے قسمت چاہنے سے نہیں تدبیر سے بدلتی ہے، خلوص ولگن کی فراوانی ہو، اللہ پر بھروسہ اور ایمان پختگی ہو تو پھر تقدیر ازخود پلٹ جایا کرتی ہے۔ کیا تجھے اپنی تقدیر سے کوئی شکوہ ہے بی بی......؟''

''نہیں، شکوہ کیسا بابا جی......'' فیروزہ نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ ''میں اللہ کی مرضی اور رضا پر شاکر ہوں لیکن اپنے نامساعد حالات سے بددل ہوگئی ہوں اور آج اسی لیے آپ کے آستانے پر حاضر ہوئی ہوں مجھے آپ سے فقط اتنا جاننا ہے کہ میری قسمت میں حالات کی تبدیلی ہے کہ نہیں......''

بابا کے جلالی چہرے پر یکدم مسکراہٹ کی چمک ابھری تھی۔ وہ فیروزہ یک سوال سے محظوظ ہوئے پھر اسی بھاری آواز میں بولے۔ ''حالات کو بدلنے کا اختیار بندے کے اپنے ہاتھ میں ہے بی بی، کیونکہ حالات انسان کے اپنے پیدا کردہ ہوتے ہیں لیکن قسمت کا ہیر پھیر انسان کی زندگی کو بدل ڈالتا ہے۔ تو اپنی بات ذرا صاف لہجے میں بول لڑکی۔ کیا پریشانی ہے تجھے۔''

فیروزہ نے سٹ پٹا کر انہیں دیکھا پھر خشک لبوں کو تر کر کے بولی۔ ''میں جو کہنا چاہتی ہوں شاید وہ آپ سمجھ نہیں سکے۔ کچھ حالات اللہ کے پیدا کردہ ہوتے ہیں بابا جی، وہ بندے کے اختیار میں نہیں ہوتے مجھے ایسے ہی حالات کی تبدیلی چاہیے، میں غربت کی زندگی گزارتے تھک چلی ہوں، کیا آرام و آسائش کی تمنا کرنا گناہ ہے، کیا میں اپنے حالات کو بدلنے کی کوشش نہیں کرسکتی۔''

''کرسکتی ہو...... کیوں نہیں کرسکتیں، بندہ چاہے تو طوفان کا رُخ موڑ دے...... عقل اور تدبیر انسان کے ارادے کو مضبوط بناتی ہے۔ وہ حالات کے مقابل ڈٹ جائے اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کرے تو اللہ بھی اس کا ساتھ دیتا ہے۔ اور یوں تقدیر پلٹا کھاتی ہے لیکن بی بی تم تقدیر کا حال معلوم کرنا چاہتی ہو یا محض مجھ مشورہ کرنے آئی ہو۔

''میں دونوں کاموں کے لیے حاضر ہوئی ہوں بڑے صاحب، پلیز میرا ہاتھ دیکھیے اور لکیروں کے کے اس جال سے یہ اندازہ لگا کر بتایئے کہ میری زندگی میں دکھ بھرے دن کب آزاد بن کر میری آزمائش کرتے رہیں گے......؟''

بابا صاحب نے اپنے ناتواں بوڑھے ہاتھوں میں فیروزہ کا نرم گداز ہاتھ تھام لیا اور اس کی ہتھیلی لیمپ کی روشنی میں پھیلا کر بولے۔

''قسمت کا حال جاننا چاہتی ہو یا قسمت کی تبدیلی کو جاننے کی خواہش مند ہو۔ دونوں سوال یکسر مختلف ہیں، تم فقط وہ پوچھو جس کی تمہیں چاہ ہے، باقی باتیں ثانوی ہو جاتی ہیں لڑکی۔ اصل سوال واضح ہونا چاہیے۔

''میں قسمت کی تبدیلی کو جاننا چاہتی ہوں بابا صاحب، کیا میں خوشحال اور مطمئن زندگی جی سکتی ہوں......؟'' وہ عجلت سے بولی تھی۔ بابا جی نے پلٹ کر ایک دوسرے لیمپ کو بھی روشن کیا تھا۔ مرکری بلب کی دودھیا روشنی میں فیروزہ کے ہاتھ کی لکیریں جگمگانے لگی تھیں یا شاید وہ اس نمی کا کمال تھا جو گھبراہٹ میں فیروزہ کے ہاتھوں میں اتر آئی تھی۔ اسے اپنی ہتھیلیاں بھگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

بابا صاحب پندرہ بیس منٹ مراقبے کی سی کیفیت میں مبتلا رہے۔ فیروزہ کی ہتھیلی پر ان کی انگلی آہستہ روی سے حرکت کررہی تھی۔ وہ چونک کر جاگتے اور پھر قلم اٹھا کر کاغذ پر اعداد کے حساب

سے کچھ شمار کرنے لگتے تھے۔ وہ جو گراف، ہندسے اور اشکال ذائچے کی صورت میں کاغذ پر اتار رہے تھے۔ وہ فیروزہ کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ اس کی سہیلی عظمت بھی خوفزدہ نگاہوں سے اس عمل کو چپ سادھے تک رہی تھی۔

ایک طویل انتظار کے بعد بابا صاحب نے فیروزہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور لیمپ بند کر کے ایک گہرا سانس لے کر بولے تھے۔

''سنولڑکی، تم بہت نصیب والی ہو ماشاء اللہ دھنی ہو دھنی......تمہارے ہاتھ کی لکیریں اس بات کی گواہ ہیں کہ بہت جلد تقدیر کا بدلاؤ تم پر اپنا تسلط جمائے گا۔ وہ سارے اچھے خواب جو تم نے ان حالات میں دیکھ رکھے ہیں، ضرور پورے ہوں گے لیکن اس کے لیے تمہیں بس ایک کام کرنا ہوگا، ورنہ بات نہیں بنے گی......''

کون سا کام بابا جی؟ فیروزہ کا دل اندر ہی اندر بے قراری سے دھڑکنے لگا تھا۔ بابا نے بہ غور اس کا چہرہ دیکھا پھر بولے اپنے دل میں پہلے نرم گوشہ پیدا کر لڑکی، پھر خود کو متبادل بنانے کی تیاری کر۔ اگر تم اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ ڈھونڈنے میں کامیاب رہیں تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں عزت، دولت، خوشی اور مرتبے کے حصول سے نہیں روک سکتی۔''

فیروزہ کی دھم دھما بجتی دھڑکن میں جیسے ایک خوشگوار احساس جاگ ابھرا تھا۔ وہ ایک عجلت سے بولی۔'' آپ کی کہی بات تھوڑی الجھی ہوئی ہے بابا جی، میں تھوڑی وضاحت چاہتی ہوں۔ دل میں مرگوشہ تلاش کرنا سمجھ آتا ہے لیکن خود کو متبادل کیسے بناؤں......؟ یہ آخری بات بہت عجیب ہے بابا صاحب، پلے نہیں پڑی۔''

''پڑ جائے گی...... تجھے جلدی کاہے کی ہے بٹیا......'' وہ مسکرائے تھے۔

''نن......نہیں بات جلدی کی نہیں ہے بابا جی! دراصل آپ کا یہ جملہ میرے سر سے گزر گیا ہے'' وہ جیسے اپنی مشکل بتا رہی تھی۔

'' تو گزر جانے دے پر کانوں میں اٹکائے رکھنا۔ متبادل بنے گی تو راستہ نکلے گا۔ ورنہ قسمت کی دیوی نامہربان رہے گی۔ اور تیری زندگی اس کولہو کے بیل والے دائرے میں چکراتی رہے گی......تبدیلی نہیں آئے گی تبدیلی لانے کے لیے تجھے ساری کوشش خود کرنی ہوگی۔''

''میں پوری کوشش کروں گی بابا جی...... اس تبدیلی کو آنا ہی ہوگا ورنہ جینا مشکل ہو جائے گا۔''

'' تو پھر جاؤ زندگی سے کھٹنائیاں دور کرنے کے لیے دل میں وہ نرم گوشہ ڈھونڈو جو تمہیں متبادل بنا دے۔'' اس نے بات پوری کرتے ہی پاس پڑی بیل کی گھنٹی کا بٹن دبا کر اگلے بندے کو اندر بھیجنے کا اشارہ دے رہا تھا۔ چنانچہ فیروزہ اور عظمت کو اٹھنا پڑا۔ وہ اب بھی پلکیں جھپک کر بابا جی کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ ابھی بہت سے سوال من میں مچل رہے تھے لیکن بابا جی مزید وقت دینے کے موڈ میں نہ تھے۔ چنانچہ بادل نخواستہ فیروزہ کو اپنی دوست کے ساتھ اس حجرے سے باہر آنا پڑا تھا۔ اس کا دل اب بھی ایک تال دھڑک رہا تھا۔

پھر کئی دن گزرتے گئے، فیروزہ کی سوچیں متبادل بننے کی گتھی سلجھانے میں ناکام کوشش کرتیں مگر کوئی بھی سرا ہاتھ نہ آتا تھا۔ تھک ہار کے اس نے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ البتہ دوسرے لوگوں پر اس کی مہربانیاں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھیں، دل میں نرم گوشہ تلاش کرنے کا مطلب اُس کے نزدیک یہی تھا کہ دوسروں پر مہربان ہو جاؤ اور ان کے دکھ درد میں پورے دل

سے کام آؤ۔ دوسرے کا دل رکھنا ان کے درد دور کرنا ہی اُسے اپنے کڑے حالات میں تبدیلی لانے کا ذریعہ دکھائی دیتے تھے۔

فیروزہ نے خود کو پہلے سے زیادہ مصروف کرلیا تھا۔ اب وہ چھوٹے بچوں کو اور بھی محنت اور ایمانداری سے پڑھانے لگی تھی۔ نیتجتاً اور کئی بچے اس کی شاگردی میں آگئے تھے، یوں انکم بڑھی تو کڑے حالات کی تنی ڈور کس قدر ڈھیلی پڑگئی تھی۔ اب مہینے کے آخری دنوں میں اماں کے ہاتھ خالی نہ رہتے تھے، کھا پی کر بھی اتنی بچت ہو جایا کرتی تھی کہ آڑے وقت میں کام آسکتا۔ مگر فیروزہ کو تب بھی سکون نہ تھا۔ ایک آسودہ حال زندگی، کھلے اور بڑے سے گھر میں رہنے بسنے کا خواب اور کسی اپنے کی محبت میں زندگی کا مزہ لینے کی حسرت اس کی کمزوری بن چکے تھے۔ بابا جیسے ملاقات کے بعد فیروزہ کے اندر بہت مثبت تبدیلی رونما ہوئی اب وہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کا پلان بنا رہی تھی۔ ابا کی وفات کے بعد گھر کے حالات کو سنبھالنے کے لیے تعلیمی سلسلہ موقوف کرنا پڑا تھا۔ اور اب جب فیروزہ بیگم زندگی کی جنگ نئے سرے سے جیتنے پر کمر بستہ تھی، تو اس نے موقع دیکھ کر پرائیویٹ طور پر بی اے کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ تعلیمی سلسلہ ٹوٹے چھ سات سال گزر گئے تھے۔ اس لیے نئی توانائی کے ساتھ پڑھنے اور بہتر نتیجہ پانے کے لیے اُسے خود بھی ایک ٹیوٹر کی ضرورت تھی۔ ایک ایسے ٹیچر کی جو کم از کم اسے انگریزی اور تاریخ جیسے مضامین کی تیاری کرواسکتا ہو۔ ایک طویل عرصے بعد تعلیمی سلسلہ شروع کرنا فیروزہ کو بہت مشکل لگ رہا تھا۔

اس دن اسکول سے واپسی پر وہ اپنی سوچوں میں الجھی ہوئی گھر لوٹ رہی تھی کہ راستے میں ایک کوچنگ سینٹر کا بورڈ دکھائی دیا۔ وہ اس کا نام پڑھتے ہی بے سوچے سمجھے کوچنگ سینٹر کے اندر داخل ہوگئی۔ جب ہی اُس کی نظر ڈاکٹر ارباز پر پڑی جو اپنے دونوں بچوں کے ساتھ کوچنگ کے کسی استاد سے بات چیت کر رہے تھے۔ فیروزہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ آج انہیں اچانک سامنے دیکھ کر دل بے قرار اور مضموم ہوا تھا۔ وہ فاصلے پر رہ کر ڈاکٹر ارباز کی بات سننے لگی، جو اپنے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کے لیے کسی استاد کی خدمت چاہتے تھے اور وہ استاد ان سے معذرت کررہا تھا کہ وہ کوچنگ سینٹر کالج کے طلبہ طالبات کی سہولت کے لیے تھا اور وہاں بڑی کلاسز کو لیکچر دیے جاتے ہیں۔

اتنے چھوٹے بچوں کے لیے اس ادارے میں کوئی استاد نہیں تھا۔ اس کے صاف انکار پر ڈاکٹر ارباز کی پریشانی فیروزہ کو صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چاہتی تو ڈاکٹر ارباز کا مسئلہ چٹکی بجاتے حل کرسکتی تھی اور یہی سوچ کر وہ دل میں نرم گوشہ لیے ان کی جانب بڑھ گئی۔

آج پہلی بار وہ اُس شخص کے روبرو کھڑی تھی۔ جسے وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے کچھ فاصلے پر گھر کے لان یا اندر کسی کمرے میں آتا جاتا دیکھا کرتی تھی۔ اس نے پاس جا کر ڈاکٹر ارباز سے اپنا تعارف کروایا اور انہیں بتایا کہ وہ ان کی مدد کرسکتی ہے کیونکہ وہ ایک ٹیچر ہے۔

ڈاکٹر ارباز کے چہرے پر پھیلی ساری کوفت لمحوں میں زائل ہوئی تھی۔ وہ مطمئن انداز میں مسکرا کر فیروزہ کی جانب متوجہ ہوئے اور اپنا تعارف کروانے کے بعد پہلے فیروزہ کا شکریہ ادا کیا کہ وہ ان کی پریشانی سن کر از خود ان کے بچوں کے لیے پاس چلی آئی تھی یہ بہت بڑی بات تھی۔

فیروزہ نے ذوہیب اور اس کی تین سالہ ننھی گڑیا سی بہن مسکان کو دکھے دل سے پیار کیا اور ڈاکٹر ارباز کو اپنے گھر کا ایڈریس سمجھا کر ٹیوشن کے اوقات کار سے باخبر کیا، ڈاکٹر ارباز نے فوراً حامی بھری اور کہا کہ وہ بچوں کو اس کے گھر خود چھوڑنے آئیں گے۔''

فیروزہ کا بہت دل چاہا کہ وہ ان کی مسز رعنا کی موت پر اظہار ہمدردی کرے اور افسوس کے چند کلمات کہہ کر ڈاکٹر ارباز کا غم ہلکا کرنے کی کوشش کرے لیکن ایک تو وہ موقع مناسب نہ تھا، دوسرا سرراہ وہ خود کچھ کہنے کی ہمت پیدا نہ کرسکی۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد اس نے کوچنگ میں اپنے داخلے کا بندوبست کیا تھا اور پھر گھر چلی آئی۔ آج ڈاکٹر ارباز وہ دوبارہ سامنے پاکر وہ جیسے آپ ہی مطمئن اور خوش ہوگئی تھی۔

اسی شام ڈاکٹر ارباز مقررہ وقت پر ذوہیب اور مسکان کو لے کر اس کے گھر آئے تھے اور یوں فیروزہ نے انہیں اپنے ٹیوشن پڑھنے والے بچوں میں شامل کرلیا تھا۔ دونوں بچے کم عمر ہونے کے باوجود خاصے ذہین تھے، وہ اپنی ماں سے پڑھتے تھے شاید اسی لیے ان کی تربیت بہتر خطوط پر ہوئی تھی۔

اگلے دن جب ڈاکٹر ارباز جب بچوں کو ٹیوشن چھوڑنے کے لیے آئے تو وہ خاصے الجھے ہوئے تھے، ان کا چہرہ کسی انجانے تفکر پریشانی کے احساس سے بجھ رہا تھا۔ فیروزہ کچھ پل انہیں جانچتی رہی پھر ہمت کرکے پوچھ بیٹھی کہ انہیں کیا پریشانی تھی......؟ ڈاکٹر ارباز فیروزہ کے استفسار پر چونک کر اس لڑکی کو دیکھنے لگے جو ذمہ دار بھی تھی خوش خلق جو بھی۔ صورت کی بھلی تھی اور سیرت میں لاجواب تھی لیکن غریب تھی۔

فیروزہ ان کی نگاہوں کی گرمی سے الجھ کر قدرے پریشانی سے بولی۔ ''کوئی الجھن ہے آپ کو ڈاکٹر صاحب......؟''

''جی ...... میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں......'' وہ مہذب انداز سے گویا ہوئے لیکن اک جھجک سی مانع تھی۔

''پلیز ڈاکٹر صاحب کہیے، میں سن رہی ہوں۔'' وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔

''مس فیروزہ، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ گھر آکر میرے بچوں کو ٹیوشن دے دیا کریں؟'' انہوں نے قدرے ٹھہرے انداز میں اپنا مدعا کہا تو فیروزہ نے فوری معذرت کرلی تھی۔ نہیں ڈاکٹر صاحب، میرے لیے ایسا ممکن نہ ہوگا، مجھے بہت مشکل ہوجائے گا ایڈجسٹ کرنا کیونکہ بچے زیادہ ہیں۔''

''پلیز...... آپ چاہیں تو ایسا ہوسکتا ہے، تھوڑا وقت نکالنا آپ کے لیے مشکل نہ......''

''نہیں ڈاکٹر صاحب...... فیروزہ نے عجلت میں ان کی بات کاٹ دی۔'' دوپہر چار بجے سے چھ بجے تک میں گھر میں پڑھاتی ہوں، پھر شام سات سے نو بجے تک مجھے کوچنگ جانا پڑتا ہے۔ اپنی کلاسز کو جوائن کرنے کے لیے...... میں اپنی ادھوری تعلیم پوری کرنا چاہتی ہوں۔ ایسی ٹف سچویشن میں آپ کے گھر آکر آپ کے بچوں کو پڑھانا میرے لیے ممکن نہ ہوگا، کیونکہ نو بجے اپنی کلاس کے بعد تھکاوٹ سے چور ہوتی ہوں اور سونا چاہتی ہوں۔''

''اوہ...... تو پھر پرابلم ہوجائے گی میرے لیے۔'' وہ جیسے خود سے ہم کلامی کررہے تھے۔

''کیسی پرابلم......؟'' فیروزہ نے چونک کر انہیں دیکھا اور وجہ جاننا چاہی تو وہ بے کسی سے اس

کی صورت تکنے لگے۔

"بات یہ ہے مس فیروزہ شام چھ سے رات 10 بجے تک میرا کلینک ٹائم ہے، گھر سے غیر حاضری کی صورت میں، میں چاہتا ہوں کوئی میرے بچوں کو نا صرف پڑھائے بلکہ میرے آنے تک ذوہیب اور مسکان کو سنبھالنے کی ڈیوٹی بھی انجام دے، میں اس کام کے عوض ٹیوشن فیس کے علاوہ بھی اضافی رقم دوں گا،، بس مجھے چند گھنٹوں کے لیے کسی Attendent کی ضرورت ہے۔"

"اوہ! تو آپ کو اپنے بچوں کے لیے کوئی گورنس چاہیے......؟ یہی چاہتے ہیں نا آپ۔" فیروزہ نے انہیں پوچھا تھا۔

ارے نہیں بچوں کے لیے تو گورنس موجود ہے اور وہ ایک بوڑھی خاتون ہیں دراصل وہ میری وائف رعنا کی آنا ہیں، انہوں نے ہی رعنا کو محبت سے پالا پوسا تھا۔ شادی کے بعد بھی وہ رعنا سے الگ نہ رہ سکیں تھی لیکن اس کے انتقال کے بعد وہ غم سے نڈھال ہیں، رعنا کی موت نے انہیں شدید ذہنی دھچکا لگایا ہے۔ ورنہ وہ ذوہیب اور مسکان کو آسانی سے سنبھال سکتی تھیں۔ میری والدہ یہاں نہیں رہتیں، انہوں نے کچھ دن بچوں کو اپنے ساتھ رکھا تھا لیکن میں انہیں تعلیم کی وجہ سے وہاں پر نہیں چھوڑ سکتا تھا کیونکہ میری نوکری یہاں کے سرکاری اسپتال میں ہے اور شام کو میں اپنا ذاتی کلینک چلاتا ہوں۔ رعنا کی بے وقت موت نے میرے گھر کو تنکوں کی طرح اڑا دیا ہے۔ ہم سب بے حد Suffer کر رہے ہیں۔

"ٹھیک کہتے ہیں آپ،" فیروزہ بھی ڈاکٹر ارباز کے ساتھ اُداس ہوگئی۔ مجھے آپ کی مسز کا دلی صدمہ ہے، وہ ایک خوبصورت اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ یقیناً ان کا اچانک چلے جانا آپ کے لیے نا قابل تلافی نقصان ہے۔"

جی ......ڈاکٹر ارباز نے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔" رعنا واقعی بہت مثالی بیوی تھی، وہ اچھی ماں بھی تھی، اس کی موت نے مجھے ہی نہیں میرے بچوں کو بھی اعتماد سے محروم کر دیا ہے...... ہم سب بہت اکیلے پڑ گئے ہیں مس فیروزہ اور بہت الجھ گئے ہیں۔"

ان کا لہجہ حسرت و قیاس کا غمز تھا، فیروزہ کا دل ہمدردی سے بھر گیا، پُرسوچ انداز میں بولی۔" اگر آپ چاہیں تو میں بچوں کے لیے دوپہر میں کچھ وقت نکال سکتی ہوں۔ کیا ذوہیب اور مسکان ایک بجے تک ٹیوشن کے لیے Avaiable ہوں گے......؟

"دوپہر ایک بجے تک؟" ڈاکٹر ارباز نے چونک کر فیروزہ کو دیکھا۔ "نہیں مس فیروزہ ایک بجے تو بچے اسکول سے گھر لوٹتے ہیں وہ کھانا کھا کر کچھ دیر آرام ضرور کریں گے، اسکول سے آنے کے بعد انہیں فوراً ٹیوشن کے لیے تیار کرنا ظلم ہوگا۔"

"سوتو ہے...... پھر میں کیا کروں؟ میرا اپنا دن بھر کا شیڈول بہت ٹائیٹ ہے میں شام کے بعد کسی بھی طرح دونوں بچوں کے لیے وقت نہیں نکال سکتی۔ یہ میرے لیے پاسبل نہ ہوگا کیونکہ مجھے بھی اپنی پڑھائی کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔"

"جی میں جانتا ہوں آپ کا لگا بندھا روٹین ہے مس فیروزہ لیکن ایک صورت ہو سکتی ہے بشرطیکہ آپ کو ناگوار نہ ہو تو......؟" وہ کچھ محتاط تھے۔

"آپ کہیے میں سن رہی ہوں......" وہ ان کی

جانب متوجہ ہوگئی۔

''کیوں نہ میں بچوں کو اسکول میں واپسی پر آپ کے یہاں چھوڑ دوں؟ آپ کو تھوڑا آک ورڈ فیل ہوگا لیکن بچے آپ کے گھر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد بھی پڑھ سکتے ہیں...... آپ ان کے کھانے پینے کی فکر نہ کریں، میں سارا انتظام کر دوں گا، بس آپ کو ذوہیب اور مسکان کی تھوڑی دیکھ بھال کرنی پڑے گی۔ شام کو میں انہیں پک کر کے اپنے کسی دوست کے گھر چھوڑ دوں گا اور کلینک سے واپسی پر گھر لیتا آؤں گا، اس طرح مجھے ان کی فکر نہ ہوگی نہ وہ ڈسٹرب ہوں گے اور نہ ہی مجھے اپنی ڈیوٹی سے کوتاہی برتنا پڑے گی۔''

فیروزہ کو ہنسی آ گئی ان کا آئیڈیا بے حد نا معقول تھا، وہ جو اپنے بچوں کا تحفظ چاہ رہے تھے۔ اور ان کے ڈسٹرب نہ ہونے کا سوچ کر مطمئن ہونا چاہ رہے تھے۔ وہی بات سب سے غلط تھی۔ بچے نا صرف ضرورت سے زیادہ ڈسٹرب ہو جاتے بلکہ دوسروں کے گھروں میں رہ کر احساس کمتری میں بھی مبتلا ہو جاتے۔ روزانہ کی بنیاد پر کون کسی دوسرے کے بچوں کی ذمہ داری لیتا ہے، کڑے حالات میں وہ دوست بھی نگاہ پھیر لیا کرتے ہیں۔ جن پر ڈاکٹر ارباز کو یہ گمان تھا کہ ان کی خاطر ایک ہمدردی کے ساتھ بچوں کو اپنے گھر کا فرد بنا کر رکھیں گے اور ان سے بہتر رویہ بھی اپنائے رکھے گے۔

لیکن ایسا کہاں ہوتا ہے مجبوری کے دنوں میں تو انسان کا سایہ تک اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ پھر دوست احباب سے آس رکھنا کہاں کی عقلمندی تھی۔ فیروزہ نے ایک نظر ڈاکٹر ارباز کو دیکھا اور سنجیدگی سے بولی۔ ''دیکھیے ڈاکٹر صاحب، ایسا کر کے آپ اپنے بچوں کو ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیں گے، گھر سے اتنی دیر باہر رہنے کی صورت میں انہیں جانے کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ابھی دونوں بچوں کی عمر بہت کم ہے وہ لوگوں کے اچھے برے رویے کو سمجھ نہیں پائیں گے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں آج کے مصروف دور میں اپ کے دوست آپ کے بچوں کی ذمہ داری اٹھائیں گے؟ کیا آپ نے کسی دوست سے اس سلسلے میں کوئی بات کی ہے......؟ کیا کوئی آپ کی مدد پر راضی ہے......؟''

''نہیں، میں نے کسی سے ابھی کچھ نہیں پوچھا، یہ محض ایک آئیڈیا تھا اور میں نے سب سے پہلے اسے آپ کے سامنے رکھا ہے۔''

''او کے! تو پھر میں اس آئیڈیا کو فوری طور پر مسترد کرتی ہوں، بچوں کو آپ کی ضرورت ہے ڈاکٹر صاحب اور میں سمجھتی ہوں، ماں کے مرنے کے بعد ذوہیب اور مسکان آپ کے بغیر کہیں بھی نہ رہ سکیں گے کیونکہ اب آپ کی ذات ان کی جملہ توجہ اور دلچسپی کا مرکز ہوگی۔''

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن میں کیا کروں...... اپنی مجبوری میں کسی دوسرے سے کیسے شیئر کروں؟ میں بہت مشکل میں گرفتار ہوں، کیا ایسا نہیں ہوسکتا آپ کسی آیا کا بندوبست کروا دیں میرے بچوں کے لیے...... کسی ایسی عورت کا جو ذوہیب اور مسکان کے ساتھ پانچ سے چھ گھنٹے روزانہ گزار سکے۔'' ڈاکٹر ارباز نے جیسے درخواست کی تھی فیروزہ سوچ میں پڑ گی پھر بولی۔

''میں کسی ایسی عورت سے واقف تو نہیں ہوں لیکن میں کوشش کروں گی آپ کا مسئلہ حل کروا دوں مجھے تھوڑا وقت چاہیے۔''

''اوہ تھینکس مس فیروزہ...... اگر آپ ایسا کر سکیں تو میں آپ کا بے حد مشکور رہوں گا۔'' وہ

یکدم جیسے پرُامید ہوکر مسکرائے تھے۔ فیروزہ بھی مسکرا دی تھی۔ ''اخبارات میں بہت سے اشتہار آتے ہیں اس قسم کے میں چند ایک عورتوں سے مل کر آپ کو مطلع کردوں گی، فکر نہ کریں۔''

''بہت شکریہ...... رعنا کے بعد بچوں کو سنبھالنا میرے لیے بہت مشکل ہوگیا ہے اور سچ ہے کہ میں اپنے بچوں میں احساس محرومی نہیں دیکھ سکتا۔''

وہ ذوہیب کو گود میں بٹھائے کہہ رہے تھے، فیروزہ نے دوبارہ ان کی صورت دیکھی اور پھر آہستگی سے کہا۔''آپ دوسری شادی کیوں نہیں کرلیتے ڈاکٹر صاحب۔''

''دوسری شادی......؟'' وہ بے طرح چونکے'' نہیں، نہیں میں دوسری شادی کیسے کرسکتا ہوں کوئی بھی دوسری عورت رعنا کی جگہ نہیں لے سکتی۔ وہ بہت وفادار اور ذمہ دار عورت تھی۔ دوسری عورت میرے بچوں سے محبت بھی نہ کرسکے گی ایک ماں کی طرح۔''

''کیوں نہیں کرسکتے۔ ماماتا ہر عورت میں ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب۔''

یقیناً ہوتی ہے لیکن دوسری ماں اپنی ماماتا کا اظہار اس طور کہاں کرتی ہے، جس طرح ایک سگی ماں اپنی اولاد کے لیے کرتی ہے ایسی عورتیں سگے سوتیلے کے فرق میں پڑ کر بچوں کو رول دیتی ہیں...... اور میں ذوہیب اور مسکان کو رُلتا نہیں دیکھ سکتا وہ رعنا کی نشانی ہیں میرے پاس۔''

''آپ ہر عورت کو ایک ہی پیمانے پر نہ تولیے ڈاکٹر صاحب، جو آپ سوچ رہے ہیں، ضروری نہیں کہ ایسا ہی ہو۔'' فیروزہ نے قدرے ناگواری سے انہیں سمجھایا تو وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیے۔''فی الحال بچوں کو سنبھالنا میرا سب سے بڑا مسئلہ ہے

مس فیروزہ، جب شادی کا فیصلہ کروں گا تو دوسری عورت کی بچوں سے محبت اور سلوک کو بھی مدنظر رکھوں گا۔ فی الوقت ذوہیب اور مسکان کی نگہداشت بنیادی مسئلہ ہے۔''

فیروزہ نے کوئی جواب نہ دیا بس چپ سادھے انہیں دیکھتی رہی۔ ڈاکٹر ارباز چند پل اس کا جائزہ لینے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ گئے تھے۔ بچوں کو چھ بجے پک کرنے کا کہہ کر وہ گھر سے نکل گئے تھے اور ان کے جانے کے بعد فیروزہ بچوں کو ٹیوشن پڑھانے بیٹھ گئی۔ لیکن اس کا ذہن ڈاکٹر ارباز کے مسئلے میں ہی الجھا ہوا تھا وہ اپنی بیوی سے کتنے وفادار تھے اسے اس امر کا بہ خوبی اندازہ تھا۔

وعدے کے مطابق ڈاکٹر ارباز شام 7 بجے اپنے بچوں کو لینے آگئے ان کے جانے کے بعد فیروزہ اپنے کوچنگ سینٹر کے لیے روانہ ہوگئی لیکن وہاں دل پڑھنے میں نہ لگا تھا۔ حواسوں پر ذوہیب اور مسکان سوار تھے، کتنے معصوم اور خوبصورت تھے وہ دونوں۔ ماں نے انہیں ہاتھوں میں رکھ کر پالا تھا لیکن اس کے منظر سے ہٹتے ہی وہ بچے حالات کی ٹھوکروں پر آگئے۔ ماں کی موت نے انہیں دربدری کے عذاب میں مبتلا کردیا تھا۔ ماں کا جانا کسی ناگہانی کی طرح انہیں بھگتنا پڑ رہا تھا۔ اور وہ بے چارے ابھی اس قابل کہاں تھے کہ باپ کی پریشانی سمجھ کر حالات کی تبدیلی سے سمجھوتہ کرتے۔

فیروزہ کی سوچیں جیسے اس فیملی کے اطراف گھومنے لگی تھیں۔ وہ ذہن سے ان بچوں کا خیال کتنا جھٹکتی وہ دونوں اتنا ہی حواسوں پر طاری ہو رہے تھے۔ دل میں ہمدردی کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ اور فیروزہ نے از خود بڑے جذباتی

انداز میں ان بچوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اور شاید اسی سوچ کا نتیجہ تھا کہ فیروزہ نے ایک فیصلے کے تحت کوچنگ سینٹر میں ایک دن بعد ہی ادا کی ہوئی فیس واپس لے لی اور پڑھائی کو خیر آباد کہہ کر ذوہیب اور مسکان کی آیا بننے پر آمادہ کرلیا۔ یہ فیصلہ اس نے پورے دل سے کیا تھا اور اُسے اس پر شرمندگی بھی نہ تھی۔ اگلے روز وہ ٹیوشن سے فراغت پاتے ہی ذوہیب اور مسکان کو لے کر ڈاکٹر ارباز کے آنے سے پہلے ہی ان کے گھر چلی آئی تھی۔ دروازہ ملازم نے کھولا اس نے بچوں کو کچھ کھلانے اور پھر سلانے کی تلقین کرنے کے بعد ملازم کو ڈاکٹر ارباز کو بلانے کا کہا تھا۔ ملازم نے فیروزہ کو گیسٹ روم کی راہ دکھائی اور خود بچوں کو لے کر گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ چند منٹ بعد ہی ڈاکٹر ارباز فیروزہ کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ اُس کی آمد پر قدرے متفکر تھے کہ وہ ذوہیب اور مسکان کو ٹیوشن پڑھانے سے شاید انکار کرنے آئی تھی۔ لیکن فیروزہ نے انہیں اپنے ارادے سے باخبر کیا تو ڈاکٹر ارباز بھونچکے رہ گئے وہ لڑکی اتنا جذباتی ہوکر ان کے معاملے کو محسوس کررہی تھی۔

''دیکھیے میں کچھ سمجھا نہیں مس فیروزہ......''

ڈاکٹر ارباز نے پوری توجہ سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ ''کیا آپ آگے پڑھنا نہیں چاہتیں۔''

''جی ...... فی الوقت نہیں......'' وہ بے حد اطمینان سے بولی تھی۔ ایک دو سال کی بات ہے بچے خود کو سنبھال لیں گے تو میں بھی مطمئن ہو جاوں گی اسی دوران میری کوشش ہوگی کہ میں پرائیویٹ طور پر امتحان دے کر گریجویشن کرلوں۔ اس مقصد کے لیے آج میں نے کوچنگ کے سر اکرام اللہ سے اپنی مجبوری بیان کی ہے وہ گھر آ کر مجھے میرے جیکٹس پڑھا دیا کریں گے۔ کوچنگ کے لیے نہیں جاؤں گی تو وقت کی بچت ہوگی اور میں وہ سہولت آپ کے بچوں کے نام کرسکتی ہوں اس طرح آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بچے میرے پاس رہیں گے اور انہیں کسی دوسری جگہ جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور نہ ہی ان کے لیے کسی آیا کا انتظام کرنا پڑے گا۔ آج سے مسکان اور ذوہیب میری ذمہ داری ہوں گے۔

''ہاؤ از دس پاسبل......؟ ڈاکٹر ارباز حیرت اور بے یقینی سے فیروزہ کو دیکھ رہے تھے۔ آج کے مطلبی دور میں کوئی اتنا پرخلوص بھی ہوسکتا ہے۔ کہ غیر کے بچوں کے تحفظ کے لیے اپنی زندگی کو ثانوی کرے اور وقت بچانے کے لیے تعلیم کی قربانی بھی دے دے......؟؟''

''شاید آپ جذباتی ہوکر سوچ رہی ہیں...... پلیز خود کو ڈسٹرب نہ کریں، آپ جانتی ہیں یہ فیصلہ آپ کے لیے کئی مشکلات کھڑی کرسکتا ہے۔ آپ خود زیربا ہوسکتی ہیں کیونکہ میں جانتا ہوں آپ اپنی والدہ کے ساتھ سلائی کڑھائی میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہیں، میرے بچوں کو وقت دے کر آپ دیگر بچوں کو ٹیوشن دینا بھی مشکل ہو جائے گا کیونکہ دو بچوں کی نگہداشت اور ان کی آپ کے گھر کئی گھنٹے کی موجودگی آپ کے معاملات پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔...... پلیز ایموشنل نہ ہوئیے...... شاید آپ وہ نہ کرسکیں گی جو سوچ رہی ہیں...... ڈاکٹر ارباز نے فوری طور پر اُسے حقیقتِ حال سے روشناس کرنا کی کوشش کی تھی۔ لیکن فیروزہ کے ماتھے پر شکن تک نہ ابھری اور وہ اُسی اطمینان سے بولی'...... آپ مجھے اور میری ہمت کو اتنا انڈر ایسٹی میٹ نہ کریں۔ جب میں خود آپ کے بچوں کے لیے ایک فیصلہ لے رہی ہوں تو آپ کو

کیا اعتراض ہے۔ آپ آم کھانے سے غرض رکھیے۔ میں رعنا بھابی سے اچھی طرح واقف ہوں وہ کیسی خاتون تھیں اور بچوں کو کیسے سنبھالتی تھیں۔ وہ تجربہ اور مشاہدہ اب میرے ضرور کام آئے گا مسکان اور ذوہیب میرے لیے جو اہمیت رکھتے ہیں شاید میں اس کی وضاحت بھی نہ کر سکوں لیکن یہ طے ہے وہ دونوں اب دربدر نہیں ہوں گے ان کی پرورش اور نگہداشت میری ذمہ دار ہوگی اور میں یہ سب کچھ کسی صلے کی تمنا کے بغیر کرنا چاہتی ہوں۔''

''لیکن، یہ ٹھیک نہیں ہے مس فیروزہ...... آپ کی اپنی ایک زندگی ہے کسی دوسرے کے بچے ہر وقت آپ کے سر پر سوار کیسے رکھ سکتی ہیں؟ بے شک آپ کی نیت اچھی ہے اور کسی صلے کی تمنا کے بغیر آپ میرے بچوں کو سنبھالیں گی لیکن...... لیکن یہ وقتی جذبات ہیں دو چار دن بعد آپ کا جذبہ سرد پڑ گیا تو کیا ہوگا؟ نہیں مس فیروزہ میں اپنے بچوں کو ماں کے چھن جانے کے بعد کسی دوسری کی محبت سے اس طرح بے دخل ہوتا نہ دیکھ سکوں گا میرے بچے اگر آپ کے عادی ہو گئے، تو میں آپ کے بدلتے رویے کے بعد انہیں کس طور سنبھالوں گا یہ بھی سوچیے گا۔''

وہ بے حد پریشان تھے۔ فیروزہ کی قربانی اور بے وجہ اس حد تک ایثار کرنا ڈاکٹر ارباز کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ اُسے حقائق بتانا چاہتے تھے۔ آنے والے وقت کے بدلتے تیوروں سے واقفیت دینا چاہتے تھے لیکن مس فیروزہ اسی اطمینان سے بیٹھی ان کی کہی کو سن رہی تھیں، ڈاکٹر ارباز کے خاموش ہوتے ہی وہ اطمینان سے بولی۔ ''بے وجہ کے اندیشے پالنا اکثر شرمندگی کا موجب بنتا ہے ڈاکٹر صاحب، میری نیت کی سچائی اور خلوص کی صداقت پر شک نہ کریں میں ایک آیا سے زیادہ بہتر طور پر ذوہیب اور مسکان کو سنبھالوں گی۔ ہاں اگر آپ کو میرے گھر کی غربت اور اطراف کا ماحول دیکھ کر اپنے بچوں میں احساس کمتری کا شکار ہونے کا خدشہ ہے تو میں اس کا حل بھی جانتی ہوں۔ آپ اجازت دیں گے تو میں آپ کی غیر موجودگی میں مطلب آپ کے رات کو کلینک سے گھر لوٹنے تک اسی گھر میں ذوہیب اور مسکان کے ساتھ رہ سکتی ہوں۔ یہاں بیٹھ کر بھی انہیں پڑھا سکتی ہوں۔ ان کا خیال رکھ سکتی ہوں آپ کے دونوں بچوں کے لیے میرے جذبات خالص اور کھرے ہیں۔ میں انہیں بیچ راستے میں ہرگز چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میں جانتی ہوں محبت پا کر کھو دینے کا دکھ کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا، رعنا بھابی کی وفات کے بعد وہ دکھ ذوہیب اور مسکان کی زندگی میں دوبارہ نہیں آئے گا۔ میں انہیں پوری توجہ اور محبت سے سنبھالوں گی یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔''

''لیکن...... لیکن کیوں مس فیروزہ......؟ مجھے پلے نہیں پڑ رہا اس میں تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔ اگر تم روپے پیسے کی لالچ میں ایسا کر رہی ہو تو ابھی سن لو میں اچھا کما بھی لیتا ہوں تو دس پندرہ ہزار سے زیادہ نہیں دے پاؤں گا۔ اور دس پندرہ ہزار تمہارے جذبات کی قیمت نہیں ہو سکتے۔ آخر تم دیدہ و دانستہ خسارہ کیوں اٹھانا چاہتی ہو؟'' وہ جیسے زچ ہو گئے تھے، فیروزہ مسکرائی اور دھیرے سے بولی۔

''کیونکہ آپ میری نیت اور خلوص کو نہیں سمجھ رہے۔ میں نے آپ سے کسی رقم کا تقاضا نہیں کیا اور نہ ہی مجھے آپ سے کسی مالی فائدے کی چاہ ہے...... میں ٹیوشن اور ٹیچنگ سے اتنا کما لیتی ہوں کے مارے باندھے گزر بسر ہو جاتی ہے اور پھر اماں بھی سلائی کا کام اچھا کر لیتی ہیں۔ سو پیسہ

میری کمزوری نہیں ہے بہر حال آپ اجازت دیں گے تو میں ذوہیب اور مسکان کے لیے اپنا وقت دے پاؤں گی ورنہ آپ کو اگر اعتراض ہے تو بس بات یہیں ختم ہو جاتی ہے؟ مجھے اجازت دیجیے۔'' وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کا اس طرح اچانک اٹھ جانا ڈاکٹر ارباز پر تھوڑا دباؤ ڈال گیا تھا۔ وہ بدحواسی سے بول پڑے۔ ''پلیز ابھی مت جانا میری بات ختم نہیں ہوئی ہے۔''

فیروزہ نے نظر بھر کر انہیں دیکھا اور سنجیدگی سے بولی۔ 'اور کیا کہیں گے آپ جب مجھ پر بھروسہ ہی نہیں تو پھر کوئی بات طے نہ ہو پائے گی۔''

''نہیں، میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں تم سے۔'' ڈاکٹر ارباز نے اس کی کہی کو نظر انداز کرتے ہوئے اگلی بات کہہ دی۔ فیروزہ سوالیہ نظروں سے انہیں تکنے لگی تب وہ بولے۔ ''چلو مان لیا کہ تم بے غرض ہو کر کسی صلے کی تمنا کے بغیر یہ سب کرنا چاہتی ہوں لیکن یہ بھی تو سوچو کہ آفٹر میرج کیا تم یہ سب کچھ کر پاؤ گی تم اچھی خاصی سمجھ دار لڑکی ہو میرے اندازے کے مطابق چھبیس ستائیس برس کی تو ہو گی کیا تمہاری اماں تمہارین شادی نہ کریں گی۔''

''کریں گی...... لیکن جب شادی ہو گی تو دیکھا جائے گا۔'' فی الحال دور تک ایسی بات کا امکان نہیں ہے ڈاکٹر صاحب، آپ بے فکر رہیے۔ میں آپ کو یا آپ کی اولاد کو کسی خسارے میں نہیں رکھوں گی۔ جو بھی کروں گی ذوہیب اور مسکان کی بھلائی کے لیے کروں گی۔

''لیکن کیوں فیروزہ......؟'' آخر یہ سب کرنے کا کوئی تو مقصد ہو گا نا...... میں تمہارے جذبات اور نیت پر یونہی تو بھروسہ نہیں کر سکتا۔''

کچھ خفا سا انداز فیروزہ کو قدرے روہانسا کر گیا۔ وہ جذباتی ہو کر اپنی پلکوں کی نمی کو چھپاتے ہوئے بولی۔ ''اگر آپ سچ جاننا چاہتے ہیں تو سن لیجیے، کسی نے مجھے کہا تھا اپنے دل میں نرم گوشہ پیدا کرو۔ دوسروں کی امداد کرو دکھ سکھ بانٹو کہ تمہارا بھی بھلا ہو۔ سو ڈاکٹر صاحب درحقیقت میں خود اپنا بھلا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں بھی بہت تکلیف میں ہوں لیکن خدا کی قسم میرے دل میں نیت اور سچائی اور خلوص شامل ہے۔ میں آپ کے گھر میں جانے کب سے دور بیٹھے اس فیملی کا حصہ بن گئی ہوں، میرے کمرے کی کھڑکی سے آپ کا گھر اور اس گھر کا کا ہر کمرہ صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ میں اخلاقی طور پر آپ کی مجرم ہوں ڈاکٹر صاحب...... کیونکہ میں نے ہر پل آپ کی نجی زندگی کو خود بھی جیا ہے۔ رعنا بھابی سے آپ کی محبت اور ایک اچھے شوہر کی طرح ان کا خیال رکھنا کچھ بھی میری نگاہ سے چھپا نہیں تھا۔ میں اس گھر کی ہر خوشی میں دور بیٹھ کر بھی شامل رہی ہوں، میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ذوہیب اور مسکان اس گھر کی سب سے بڑی اہم خوشی ہیں۔ وہ زندگی ہیں آپ کی اسی لیے رعنا بھابی کے بعد مسلسل پریشان ہیں، اور آپ کی پریشانی میرے دل کو چھوتی ہے ڈاکٹر صاحب، میں اُسے کم کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے دل کے نرم گوشے کے ساتھ جسے بنانے کی مجھے ہدایت کی گئی تھی۔ لیکن آج وہ نرم گوشہ میرے دل میں از خود بن گیا۔ آج میں نے دل اور جذبات کی مکمل حمایت کے ساتھ آپ کے بچوں کا دکھ محسوس کر کے ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے...... آپ مجھے روکیں گی تو تب بھی میں آپ کی مدد ضرور کروں گی۔ کیونکہ ایسا کرنے کے لیے میں مجبور ہوں۔

وہ بہتی آنکھوں کے ساتھ بولتی چلی گئی۔ ادھر ڈاکٹر ارباز کی بولتی بند تھی۔ فیروزہ نے اپنی روانی میں کتنے اہم انکشافات کر ڈالے تھے۔ وہ دور بیٹھ کران کے گھر میں تاک جھانک کرتی تھی۔ ان کی پرسنل زندگی کی گواہ تھی۔ ان کی اور رعنا کی محبتوں کی امین تھی۔ وہ دور رہ کر بھی ان کے گھر میں موجود رہتی تھی۔ ''اُف خدایا...... یہ سب کیا ہے......؟ کیا یہ لڑکی پاگل ہے یا حد سے زیادہ حساس ہے، کیا کروں میں اس کا......؟''

وہ اُسے گھور رہے تھے اور اُدھر فیروزہ دل تھام کر رونے لگی تھی۔ اُسے سچ بول کر شرمندگی ہو رہی تھی یا وہ دل کھول کر رکھ دینے پر خجل ہوئی کھڑی تھی۔ چند ساعتیں بڑی خموشی اور تیزی سے گزر گئیں۔ ڈاکٹر ارباز کے من میں جیسے آتش فشاں سلگ رہا تھا۔ وہ لڑکی کسی دیدہ دلیری سے اپنی اخلاقی چوری کا جواز پیش کر رہی تھی۔ اپنے منہ سے بتا رہی تھی کہ ان کے اور رعنا بھابی کے درمیان محبت کے ہر پل سے واقف تھی اور اب......؟؟''

انہی سرتاپا پسینہ آ گیا اور اب وہ اور پاس آ کر ان کی زندگی میں بچوں کے توسط سے مداخلت کرنا چاہتی تھی۔ کیا اُسے اس حرکت کی اجازت ملنی چاہیے تھی۔ کیا اُسے ذوہیب اور مسکان کی نگہداشت اور پرورش کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ کیا ڈاکٹر ارباز فیروزہ کو اپنے گھر بار بار آنے کی اجازت ان حالات میں دے سکتے تھے۔ جب وہ خود اپنی بیوی کی موت کا غم منا رہے تھے۔......؟''

وہ سوچتے رہے، سوچتے رہے اور پھر لمحوں بعد انہوں نے اپنے سامنے کھڑی فیروزہ کو ایک دوسری نظر سے دیکھا تھا۔ اچھی لڑکی تھی وہ...... عام سی سادہ شکل وصورت رکھنے والی لڑکی۔ جس کا کوئی مستقبل نہ تھا۔ ایک ماں بھی وہ بھی جانے کب تک زندہ تھی۔ ماں کے بعد اُسے بھی تنہائی کی اذیت اٹھانی پڑتی۔ وہی اذیت جو آج ڈاکٹر ارباز اپنے بچوں سمیت اٹھا رہے تھے۔ انہوں نے ایک گہری سانس لی اور جیسے کسی نتیجے پر پہنچ کر سکھ کا احساس پایا تھا۔

''میں پوچھنا چاہتا ہوں فیروزہ......'' ڈاکٹر ارباز نے اس بار اس کے نام کے ساتھ مس کا لاحقہ استعمال نہیں کیا تھا۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی۔''

''جی......؟؟'' فیروزہ پر ساتوں آسمان اکٹھے ٹوٹ کر گرے تھے۔ ''شادی...... آ...... آپ سے؟''

''ہاں کیا مجھ سے شادی کرو گی......؟ ذوہیب اور مسکان کی خاطر کہ تمہاری نیت اور خلوص کی قدر اسی طور کی جا سکتی ہے، فی الحال میں...... اپنی زندگی میں تمہیں رعنا کے متبادل کے طور پر لاؤں گا کیونکہ اس کی جگہ پر تمہیں کھڑا کرنا اور بیوی کی محبت دینا شاید ممکن نہ ہوگا۔ رعنا میری محبت تھی، میرے بچوں کی ماں تھی لیکن کل میرے جذبات بدل بھی سکتے ہیں۔ اگر تمہیں رعنا کی محبت میں حصہ دار بنا کا تو تم متبادل نہیں رہو گی۔ پلیز میرے جذبات سمجھتی ہو تو یہ شادی ہو سکتی ہے۔ ورنہ ڈاکٹر ارباز نے جملہ خود ہی ادھورا چھوڑ دیا تھا، اُدھر فیروزہ بے یقین کھڑی تھی۔ اُسے اعتبار نہ آ رہا تھا کہ وہ مسز رعنا کا متبادل بن کر زندگی کی خوشیوں سے اس طرح اپنا حصہ پانے کی حق دار بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے ڈاکٹر ارباز کو ایک نظر دیکھ کر بے سوچے سمجھے اثبات میں سر ہلا دیا۔ زندگی میں تبدیلی اچانک در آئی تھی۔ دل کے نرم گوشے نے بالآخر اُسے ایک بڑے سے گھر کا مکین بنانے کا انتظام کر دیا تھا۔

☆☆......☆☆

مشہور مصنفین کے مقبول ترین ناول

آشیانہ	اعجاز احمد نواب	400/-
جزیرہ	اعجاز احمد نواب	600/-
تیری یادوں کے گلاب	شازیہ اعجاز شازی	300/-
کانچ کے پھول	غزالہ جلیل راؤ	500/-
یہ دیا بجھنے نہ پائے	محمد سلیم اختر	300/-
وش کنیا	ایم اے راحت	400/-
درندہ	ایم اے راحت	300/-
تتلی	ایم اے راحت	200/-
بھرم	ایم اے راحت	200/-
چیون	خاقان ساجد	400/-
وحوش	خاقان ساجد	150/
دھواں	فاروق انجم	300/-
دھڑکن	فاروق انجم	300/-
درخشاں	انوار صدیقی	700/-

قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

نواب سنز پبلی کیشنز

1/192، کوچہ میاں حیات بخش، اقبال روڈ، کمیٹی چوک راولپنڈی 051-5555275

دوخوبصورت لڑکیوں کو اپنے سامنے یوں گڑگڑاتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔اس کی انا کو بہت تسکین پہنچ رہی تھی۔اچانک اریبہ نے دیکھا کہ سارہ اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔اریبہ ہکا بکا رہ گئی۔عاشر بھی اس کی اس حرکت پر حیران ہوا۔ابھی اس......

''پلیز امی' آپ لوگوں کو یہ بات کیوں نہیں سمجھ میں آرہی کہ اس معاملے میں میرا کوئی قصور نہیں ہے؟''اریبہ کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی تھیں مگراس کی امی کے غصے میں کوئی کمی نہیں آئی۔

''ساری دنیا نے ٹی وی پر جو منظر دیکھا،اس کے بارے میں تم کس کس کو صفائیاں دو گی؟ یہ ہونٹوں نکلی بات نہیں بلکہ آنکھوں دیکھی ہے۔اس مارننگ شو میں تم ایک آوارہ لڑکے کے ساتھ کھڑی دکھائی دی ہو،یہ سب دیکھنے کے بعد کون تمہاری بات پر یقین کرے گا' بولو؟''انہوں نے بیٹی کو جھنجھوڑ ڈالا۔سارے گھر والے اس کے گرد اجنبیوں کی طرح کھڑے تھے۔

اریبہ نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس پر ایسا برا وقت بھی آسکتا ہے جب سارے اپنے پرائے بن جائیں گے۔اس کے حواس گم ہو رہے تھے مگر اپنا سچ ثابت کرنے کے لیے فی الحال اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔اسے گمان بھی نہ تھا کہ بات اس حد تک چلی جائے گی۔وہ تو چھوٹی سی نیکی کرنے چلی تھی۔

''آپ لوگ یہ بات مان کیوں نہیں لیتے کہ میں تو وہاں صرف سارہ کو بچانے کے لیے گئی تھی؟ میرا اس لڑکے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''اریبہ چیخ کر بولی مگر اس وقت سارے گھر والے اتنا الجھ گئے تھے کہ کچھ بول ہی نہیں پا رہے تھے۔وہ زاروقطار رو رہی تھی۔اس کی امی تو جیسے پتھر کی ہوگئی تھیں۔ان پر اریبہ کی گریہ وزاری کا کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ان کی آنکھوں پر تو ٹی وی شو کے وہ حصے ایک فلم کی طرح چل رہے تھے جس میں ان کی بیٹی پارک میں ایک اجنبی لڑکے کے ساتھ پائی گئی تھی اور پروگرام کی اینکر بڑے زور شور سے ان دونوں کا آپس میں رشتہ پوچھ رہی تھی' ساتھ ساتھ والدین کی عزت کی دہائی بھی دے رہی تھی۔

یہ پروگرام صبح کے وقت ایک چینل سے نشر ہوا تھا' یقیناً ان کے بہت سارے رشتے داروں نے

اسے دیکھا ہوگا کیونکہ اب ہر گھر میں یہ مارننگ شوز بڑے ذوق و شوق سے دیکھے جاتے ہیں، خصوصاً خواتین صبح کے وقت ٹی وی آن کر کے ساتھ ساتھ روزمرہ کے کام نمٹاتی جاتی ہیں۔

نسرین کو تو اریبہ کے سسرال والوں کی فکر تھی کہ ان کا ردعمل کیسا ہوگا؟ ان کا یہ خدشہ بے جا نہ تھا، تھوڑی ہی دیر میں وہاں سے غصے بھرا فون آ گیا۔ اریبہ کی نند بڑے شوق سے صبح کے سارے پروگرام دیکھتی تھی، اس نے بھابھی کو ٹی وی پر دیکھا تو شور مچا کر خوشی خوشی سارے گھر والوں کو جمع کر لیا۔ اریبہ کی ساس نے جو اپنی نئی نویلی بہو کو پروگرام کی میزبان کے بے ہودہ سوالات کی زد میں دیکھا تو بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئیں۔ ان کا تو بی پی لو ہو گیا، فوراً ہی اریبہ کے گھر فون کروایا گیا مگر اس کے گھر والوں کو کچھ خبر ہوتی تو وہ صفائی دیتے، ان کی خاموشی کو ان کا جرم سمجھا گیا اور رشتہ توڑنے کی باتیں کی جانے لگیں۔ ایک قیامت تھی جو چند گھنٹوں میں اس گھر اور اس کے مکینوں پر ٹوٹ پڑی تھی۔

اریبہ اس سارے واقعے پر حیران و پریشان تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی نرم مزاجی اور ہمدردی کی عادت اسے کبھی یوں بھی مہنگی پڑ سکتی ہے۔

'مجھے سارہ سے بات کرنی چاہیے۔' تھوڑی دیر بعد جب اس کے حواس کچھ ٹھکانے آئے تو اس نے اپنے کمرے میں جا کر جلدی سے موبائل نکالا اور سارہ کا نمبر ملانے لگی۔ صرف ایک سارہ ہی تھی جو اس

کی بے گناہی ثابت کر سکتی تھی مگر اس کا فون سوئچ آف آرہا تھا۔ 'اف' اب کیا کروں؟ 'اریبہ پر گھبراہٹ سوار ہوگئی۔ اس نے سارہ کا لینڈ لائن نمبر ملایا۔

''ہیلو کون بات کر رہا ہے؟'' دوسری طرف سے سارہ کی امی نے فون اٹھایا۔

''السلام علیکم! آنٹی! میں اریبہ بات کر رہی ہوں۔ پلیز' میری سارہ سے بات کروا دیں۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جلدی جلدی اپنا مدعا بیان کیا۔

''وہ سو رہی ہے۔'' ان کا لہجہ اس کا نام سنتے ہی ایک دم کرخت ہو گیا۔ اریبہ کو بہت برا تو لگا۔ یہ وہ ہی آنٹی تھیں نا جب بھی بات کرتی تھیں تو اریبہ کے لیے ان کے لہجے سے شہد ٹپکتا تھا مگر آج ان کے لہجے کی اجنبیت اسے بہت دکھ دے رہی تھی مگر اس وقت غرض اس کی تھی۔

''پلیز آنٹی' مجھے بہت ضروری کام ہے، اس کو اٹھا دیں۔'' اریبہ لجاجت سے دوبارہ گویا ہوئی۔

''دیکھو بی بی، میں صاف بات کہنے کی عادی ہوں، تمہارے کرتوت تو صبح سویرے کے شو میں ہم سب نے دیکھ لیے ہیں اس لیے سارہ اب تم سے نہ ملے گی نہ ہی بات کرے گی۔ سارہ کے پاپا نے بھی اسے تم سے دوستی رکھنے کے لیے سختی سے منع کر دیا ہے۔'' عارفہ آنٹی کا اجنبی لہجہ اریبہ کے دل پر آرے چلا رہا تھا۔

''آنٹی' پلیز' اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا، وہ تو سارہ ہی ملنے...... '' اریبہ رو دی۔

''خبردار جو تم نے میری معصوم بیٹی کا نام لیا، سارے شہر نے ٹی وی پر تمہیں ایک غیر لڑکے کے ساتھ دیکھا، تم میری بیٹی پر الزام لگا رہی ہو؟ اگر میری بیٹی اس مسئلے میں انوالو ہوتی تو ٹی وی پر وہ بھی نظر آتی نا؟'' عارفہ اس کی بات کاٹ کر دہاڑیں۔

''آنٹی' میں سچ کہہ رہی ہوں۔ پلیز' میں تو سارہ کے ساتھ گئی تھی۔ اسے بلائیں، وہ ساری بات کلیئر کرے گی۔'' اریبہ کو اپنی دوست پر اعتبار تھا اسی لیے بولی۔

''میں اس سے پوچھ چکی ہوں، وہ تو تمہارے اس افیئر سے بھی لاعلم ہے۔ شرم آنی چاہیے تمہیں اپنے والدین کا نام خراب کرتے ہوئے اور اب میری بیٹی کے پیچھے پڑی ہو۔ آئندہ یہاں فون کیا تو تمہارے گھر آ کر ایسا شور مچاؤں گی کہ دنیا تماشہ دیکھے گی۔'' انہوں نے غصے میں فون پٹخ دیا۔ اریبہ سن سی بیٹھی رہ گئی پھر اپنے گھٹنوں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆

آئس بلیو بھاری کامدار کرتہ اور گلابی چوڑی دار پاجامہ' میچنگ چوڑیاں، میک اپ کٹ، سونے کی نازک سی رِنگ' بڑے سے شاپر میں ساری چیزیں رکھ دی گئیں۔

یہ وہ چیزیں تھیں جو اریبہ کے سسرال سے نکاح پر آئی تھیں۔ ہر چیز بہت اعلیٰ تھی۔ جس نے دیکھا' تعریف کی مگر اب جب لڑکے والوں نے ان کی طرف سے عدنان کے لیے بھیجا گیا سارا سامان واپس کر دیا تو اریبہ کی امی نے بھی یہ ہی مناسب سمجھا کہ وہ اریبہ کو ملنے والا سارا سامان واپس بھجوا دیں۔ اریبہ کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو گئی تھیں۔

یہ نہیں تھا کہ اس کو عدنان سے عشق ہو گیا تھا مگر نکاح کا مضبوط رشتہ قائم ہو جانے کے بعد سے اسے اس کے ساتھ ایک جذباتی سا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا پھر جن حالات میں اس کے سسرال سے نکاح ختم کرنے کی باتیں ہو رہی تھیں' وہ اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھے۔

اریبہ کے گھر والوں نے اس کے سسرال جا کر معاملات سدھارنے کی بڑی کوشش کی مگر اس کی ساس کوئی بات سننے پر تیار نہ تھیں۔ یوں بے گناہ ہوتے ہوئے بھی وہ گناہ گار ٹھہرا دی گئی۔ اریبہ عدنان کی تصویر پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ عائشہ نے چھوٹی بہن کو گلے لگا لیا۔ وہ جانتی تھی کہ اریبہ اس رشتے سے بہت خوش ہے۔ نکاح کے بعد عدنان جب تک پاکستان میں رہا' ان دونوں کی فون پر خاصی لمبی باتیں چلتی تھیں۔ سب کہہ رہے تھے کہ اریبہ نکاح کے بعد اور خوبصورت ہو گئی ہے۔ شاید اسے سب کی نظر ہی لگ گئی ہے۔ عائشہ نے بہن کو دیکھ کر دل ہی دل میں ملال کیا۔ یہ مارننگ شو والی بات اسے بھی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

عدنان نکاح کے بعد واپس اپنی جاب پر آسٹریلیا چلا گیا تھا۔ یہاں ہوتا تو شاید اریبہ کے لیے کچھ اسٹینڈ لے پاتا گو کہ ان دونوں کی نسبت والدین کی رضامندی سے طے پائی تھی مگر نکاح کے موقع پر جس طرح عدنان نے اریبہ کی پسند کو مدنظر رکھا اور اس کی پذیرائی کی، اس سے وہ بہت خوش تھی اسی لیے ایک اچھے انسان کو کھونے کا اسے دلی صدمہ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

اتنی رسوائی، اتنی بدنامی سوچ سوچ کر ان سب کا دماغ پھٹنے سا لگا تھا۔ گھر والوں میں سے کسی کا دل نہیں مانتا تھا کہ اریبہ ایسا کر سکتی ہے؟ وہ تو اتنی نفیس مزاج کی لڑکی ہے۔ ٹی وی پر نظر آنے والا لڑکا تو شکل سے ہی خبیث نظر آ رہا تھا، کہیں تو کچھ غلط ہوا ہے۔ اریبہ کے والدین کے ساتھ گھر والوں کا دل بھی اس بات کی گواہی دے رہا تھا مگر سب بدنامی کی اس تیز لہر میں یوں بہہ گئے کہ کنارہ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

اہلِ خانہ ایک دوسرے سے اس مسئلے پر بات بھی نہیں کرنا چاہتے کہ کہیں ان کے پیاروں کے دل مزید دکھی نہ ہو جائیں۔

''اف میرے اللہ! میری مدد فرما، مجھ بے گناہ پر جو الزامات تھوپ دیے گئے ہیں، ان سے میری گلو خلاصی فرما۔'' اریبہ سجدے میں گڑگڑا کر بس ایک ہی دعا مانگتی رہتی۔

اس نے کئی بار سارہ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس کا سیل فون مسلسل بند ملتا۔ لینڈ لائن پر بھی اس نے کئی بار فون کیا مگر سارہ کی امی کی کرخت آواز سن کر فون خاموشی سے رکھ دیا۔

نسرین نے اپنی بیٹی کی بات ختم ہونے کی خبر ابھی تک خاندان میں کسی کو نہیں بتائی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح سے ایک بار عدنان سے بات ہو جائے، شاید یہ ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے جڑ جائے مگر اس کے دیئے ہوئے نمبر پر وہ لوگ جب بھی کال ملاتے' فون میسج پر چلا جاتا تھا۔ ہنستا بستا گھرانہ ایک پل میں خاموش تصویر میں تبدیل ہو چکا تھا۔

☆☆☆

سارہ سے اس کی دوستی کالج میں ہوئی تھی۔ وہ خوابوں میں رہنے والی معصوم سی لڑکی تھی۔ اریبہ کا کالج میں پہلا دن تھا۔ اس نے فرسٹ ایئر فول کے بارے میں اپنی کزنز سے بہت سے قصے سن رکھے تھے اسی لیے وہ اندر سے کچھ سہمی ہوئی تھی' تاہم ہونق بننے کی جگہ پر اعتماد نظر آنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ بیگ کو کاندھے پر ڈالتے ہوئے اس نے کالج کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ ابھی وہ مین گیٹ سے اندر داخل ہوئی ہی تھی کہ بڑے سے بادام کے درخت کے نیچے ایک معصوم سی لڑکی کو آنسو بہاتے ہوئے دیکھا۔

اس نے چاہا کہ نظرانداز کر کے آگے بڑھ جائے مگر اس کی نرم دلی نے اس بات کو گوارہ نہ کیا اس

لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف بڑھ گئی۔ ماضی میں بھی اریبہ نے اپنی سادہ مزاجی کی وجہ سے بڑے نقصان اٹھائے تھے۔ کئی لوگ اسے بے وقوف بنا کر اپنا کام نکال لیتے اور وہ منہ دیکھتی رہ جاتی۔

اس کے اسکول کا ایک واقعہ یاد کر کے سارا گھر آج بھی اس پر ہنستا تھا۔ اریبہ کا اسکول اس کے گھر سے دو اسٹاپ پہلے پڑتا تھا۔ وہ اپنی دوست نسیمہ جو اس کے پڑوس میں رہتی تھی، اس کے ساتھ بڑے آرام سے بس پر اسکول آتی جاتی تھی۔ ایک دن بسوں کی ہڑتال تھی اس لیے نسیمہ کے گھر والوں نے اس کی چھٹی کروادی۔ اریبہ کا بہت اہم ٹیسٹ تھا اس لیے اس کا جانا ضروری تھا۔ پہلے تو اس نے نسیمہ کی منتیں کیں کہ وہ اس کے ساتھ اسکول چلے مگر اس نے منع کر دیا کہ باجی رہنے آئی ہوئی ہیں پھر اس نے اپنی امی کو اپنی مشکل بتائی کہ ٹیسٹ کی وجہ سے اسکول جانا ضروری ہے۔ صبح بڑے بھائی نے اسکول چھوڑ دیا۔ واپسی کے لیے اسے کرائے کے پیسے دیئے کہ وہ رکشا کر کے گھر چلی جائے۔ اسکول ختم ہونے کے بعد وہ رکشے کی تلاش میں اکیلے چلتی ہوئی مین روڈ کی طرف آئی۔ ہڑتال کی وجہ سے روزمرہ کی گہما گہمی نظر نہیں آرہی تھی۔ اسکول میں بھی لڑکیوں کی حاضری بہت کم تھی۔ وہ خالی رکشے کا انتظار کر رہی تھی کہ ایک بوڑھی عورت چھوٹے سے بچے کا ہاتھ تھامے اس کے نزدیک آ کھڑی ہوئی۔

''بیٹی......! میرا پوتر ا پوتا بیمار ہے، کچھ پیسے دے دو۔ ڈاگڈر صیب سے اس کی دوا لینی ہے۔ اوپر والا تمہیں بہت دے گا۔ پرچوں میں پاس کرائے گا۔'' وہ بوڑھی عورت گڑگڑا کر اس سے فریاد کرنے لگی۔ بچہ بھی مسلسل پیٹ پر ہاتھ رکھے ہائے ہائے کر رہا تھا۔ اریبہ کو ان غریبوں پر بڑا ترس آیا۔ اس نے اپنی یونیفارم کی پاکٹ میں ہاتھ ڈالا۔ صبح بھائی نے جو دو سو روپے دیئے تھے' وہ پورے نکال کر بوڑھی فقیرنی کے پھیلے ہاتھ پر رکھ دیئے اور بچے کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ فقیرنی دُعائیں دیتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

'اب تو پیدل ہی گھر جانا پڑے گا کیونکہ سارے پیسے تو اس بوڑھی عورت کو دے دیئے۔' اریبہ نے چلچلاتی ہوئی دھوپ کی وجہ سے اپنے جرنل سے سر پر سایہ کیا اور گھر کے راستے پر چل پڑی۔

آج ٹیسٹ کی وجہ سے مسلسل پڑھتی رہی۔ کئی بار سوچا کہ کینٹین جا کر ایک سموسہ ہی کھا لے مگر نسیمہ کے بغیر کینٹین جانے کا دل نہیں کیا۔ اب بھوک سے برا حال تھا۔ گرمی کی وجہ سے گھر کا راستہ بھی طویل لگ رہا تھا۔ اتنے میں اس کے سامنے سے ایک رکشہ دھواں اڑاتا ہوا گزرا۔ اریبہ نے جھنجھلا کر ڈرائیور کو گھورا تو رکشے کی پچھلی سیٹ پر وہی بوڑھی عورت اور اس کا پوتا مزے سے بیٹھے نظر آئے۔ ہاتھ میں بن کباب اور جوس کا ڈبہ تھا۔ ہنستے مسکراتے چلے جا رہے تھے۔ اریبہ کو دیکھتے ہی بوڑھی عورت نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ اریبہ کی تو جیسے جان جل کر رہ گئی۔ گھر لیٹ پہنچنے پر جب امی نے اس کی صحیح سے کلاس لی تو اس نے سب کو روتے ہوئے اپنے بے وقوف بننے کا یہ واقعہ سنایا پھر تو سب نے اس کا جو ریکارڈ لگایا تو وہ بھی روتے روتے ہنس پڑی۔

یہی وجہ تھی کہ کالج میں داخلہ لینے کے بعد سے پورے گھر نے مل کر اسے یہ باور کرانا شروع کر دیا کہ اسے اپنے کام سے کام رکھنا ہے۔

''اے ہمدرد دواخانہ، وہاں بڑی بڑی ہوشیار لڑکیاں ملیں گی جو تم جیسوں کو کھڑے کھڑے بیچ کھائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو اس لیے پلیز' پہلے پرکھنا پھر دوستی کرنا۔ کوشش کرنا کہ اپنے کام سے کام ہی رکھو۔'' بڑی بہن عائشہ نے سر پر چپت مار کر سمجھایا

تو وہ ہنس دی۔ جانتی تھی کہ وہ سب کی چہیتی ہے اسی لیے سب اس کے بھلے کے لیے سمجھاتے رہتے ہیں مگر وہ اس دل کا کیا کرتی جو انسانی ہمدردی سے لبریز تھا، کسی کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر اس کے اپنے آنسو بہہ جاتے تھے۔

سارہ کے آنسو بہتے دیکھ کر اس نے ایک بار پھر پرائے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی سوچی اور اس کے قریب جا پہنچی۔

''کیا ہوا، کیوں رو رہی ہو؟'' اریبہ نے اس کے پاس بیٹھ کر نرمی سے پوچھا۔

''صبح گھر سے کالج کے لیے نکلی تھی تو طبیعت ٹھیک تھی' اب اچانک گھبراہٹ ہو رہی ہے، سر بھی بری طرح سے چکرا رہا ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔ اریبہ نے سارہ کی پیشانی چھو کے دیکھی تو وہ جل رہی تھی۔

''میرے اللہ! تمہیں تو تیز بخار ہے، یہاں ڈسپنسری تو ہوگی، چلو تمہیں وہاں لے چلتی ہوں، کوئی نہ کوئی دوا مل جائے گی۔'' اریبہ نے ہمدردی سے اس کا ہاتھ تھاما اور دوسری لڑکیوں سے پوچھتی ہوئی اسے لے کر ڈسپنسری پہنچ گئی۔ دوا کھلا کر اسے وہیں کاؤچ پر لٹا دیا۔ گھر سے فون کر کے گاڑی منگوالی، واپسی میں اس نے پہلے سارہ کو اس کے گھر چھوڑا پھر اپنے گھر واپس گئی۔ سارہ اور اس کی امی بہت شکر گزار ہو رہی تھیں کیونکہ سارہ کی طبیعت ایسی نہ تھی کہ وہ بس سے اکیلے گھر جاتی۔

یہیں سے ان دونوں کی دوستی کی ابتدا ہوئی جو آگے جا کر ایک مضبوط بندھن میں ڈھل گئی۔ سارہ سوائے عاشر سے دوستی کے اپنی ہر بات اریبہ سے شیئر کرتی تھی۔

اریبہ کو سارہ کے حالات جان کر اس سے بہت ہمدردی اور انسیت پیدا ہوگئی تھی۔ سارہ کے والد ایک سخت گیر شخصیت کے حامل تھے۔ شروع سے ان کی بے جا سختی نے ان کے بچوں پر منفی اثرات مرتب کیے تھے۔ ان میں اعتماد کی کمی تھی اور وہ گھر کے گھٹے ہوئے ماحول سے فرار چاہتے تھے۔ سارہ کی امی کی مجال نہیں تھی کہ وہ اپنے شوہر کے آگے کسی مسئلے پر بول سکیں یا بچوں کی حمایت کر سکیں مگر پورے محلے میں وہ لڑاکا مشہور تھیں، شاید اس طرح وہ اپنے شوہر کی جانب سے کی گئی ہوئی زیادتیوں کا بدلہ لیتی تھیں۔

کالج میں ایک سال سارہ کے ساتھ گزارنے کے بعد اریبہ کو اندازہ ہوا کہ گھر کے ماحول نے سارہ کے دل میں بچپن سے ایک بغاوت کا پودا اگا دیا تھا مگر اب کالج میں ملنے والی تھوڑی آزادی نے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ وہ اپنے والد سے بہت ڈرتی ہے مگر گھر سے باہر سارہ اپنی ساری نا آسودہ خواہشات پوری کرنا چاہتی تھی۔ اس میں ایک چاہے جانے کی بھی خواہش تھی۔ وہ ایک حساس لڑکی تھی بچپن سے اپنے والدین کی محبت پانے کے لیے نت نئی حرکتیں کرتی مگر محبت کی جگہ باپ کی مار اور ماں کی گالیاں ملیں تو وہ نا آسودہ رہی۔ یہی وجہ ہے جب عاشر نے اس پر اپنی جھوٹی محبت کا جال پھینکا تو وہ اپنی رضا سے اس میں پھنستی چلی گئی۔

☆☆☆

''یہ کون تھا؟ تم کس کے ساتھ کالج آئی ہو؟'' اریبہ کا آج پہلا پیریڈ فری تھا تو وہ تھوڑا لیٹ کالج آئی۔ گیٹ پر اس نے سارہ کو ایک گاڑی والے کے ساتھ دیکھا جو شکل سے ہی لفنگا نظر آرہا تھا۔

''وہ ...... عاشر ...... ہے، مجھ سے ...... بہت محبت کرتا ہے۔'' سارہ نے اریبہ سے آنکھیں چراتے ہوئے اٹک اٹک کر کہا جیسے اسے خود بھی اس

بات کا یقین نہ ہو۔

''دیکھو سارہ، مجھے یہ لڑکا کہیں سے بھی تمہارے قابل نہیں لگ رہا، پتا نہیں کیوں مجھے اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی چالاکی نظر آرہی ہے۔ میں تو تمہیں اس سے دوستی ختم کرنے کا مشورہ دوں گی۔''

اریبہ نے سارہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے سمجھایا تو وہ تھوڑا شیر ہوئی ورنہ اس کا شرمندگی سے برا حال تھا کیونکہ اس نے اپنی عزیز دوست سے بھی عاشر والا معاملہ چھپایا تھا۔

''میں کون سا اس کے ساتھ سیریس ہوں؟ میں نے اس کو پہلے ہی بتا دیا ہے کہ میں یہ رشتہ صرف دوستی تک ہی محدود رکھوں گی۔ ویسے بھی میری نکاح میری خالہ کے لڑکے سے ہونے والی ہے۔ دوستی کے لیے عاشر برا نہیں' امیر ماں باپ کی اولاد ہے، بڑا کھلے دل کا ہے۔ تمہیں پتا ہے یہ جو میں مہنگی مہنگی اشیاء استعمال کرتی ہوں، اسی کے دیئے ہوئے گفٹ ہیں۔ پھر اسے ہر وقت میری فکر رہتی ہے، وہ بڑا لونگ ہے۔'' اریبہ کو پہلی بار سارہ سے نفرت محسوس ہوئی مگر وہ اس کی دوست تھی' جانتے بوجھتے اسے گڑھے میں گرتے نہیں دیکھ سکتی تھی پھر سمجھانے بیٹھ گئی۔

''سارہ......!اس دن سے ڈرو جب وہ ان تمام تحفوں کی قیمت سود سمیت تم سے وصول کرے گا۔'' اریبہ نے سر پر ہاتھ مار کر اسے سخت لہجے میں ٹوکا تو وہ جھنجلا اٹھی۔

''میں کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہوں' اپنا برا بھلا سمجھ سکتی ہوں۔ عاشر کو میں پہلے دن ہی اپنے بارے میں سب کچھ بتا چکی ہوں۔ وہ بس مجھ سے محبت کرتا ہے۔ بدلے میں مجھ سے کچھ نہیں چاہتا' الٹا میرے ناز نخرے اٹھاتا ہے۔ زبردستی مجھے مہنگی مہنگی شاپنگ کراتا ہے، اچھے ریستوران لے کر جاتا ہے جہاں جانے کا میں صرف خواب ہی دیکھ سکتی ہوں، پھر میں اس سے تعلق کیوں توڑوں جبکہ وہ خود ہی میرے ساتھ بے غرض دوستی پر آمادہ ہوا ہے؟'' سارہ چیخ کر بولی۔

''دیکھو سارہ' مرد' عورت کے درمیان کبھی بھی بے غرض رشتے پروان نہیں چڑھتے پھر عاشر تو شکل سے ہی خاصہ ہوشیار لگتا ہے، وہ جتنا سیدھا بن رہا ہے' اتنا ہے نہیں۔ اس دور میں کون بغیر مطلب کے اتنی خالص محبت کر سکتا ہے؟ مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔ میں تو اس دن سے ڈرتی ہوں جب وہ تمہیں کوئی بڑا نقصان پہنچائے۔'' اریبہ نے پیار سے سارہ کا ہاتھ تھام کر اسے سمجھانا چاہا مگر وہ برا مان کر اریبہ سے ہاتھ چھڑا کر اپنی کلاس کی طرف بڑھ گئی۔ اریبہ نے ٹھنڈی سانس بھری اور خود بھی کلاس لینے چل دی۔ سارہ ابھی اس دور سے گزر رہی تھی جہاں کان صرف اپنی مطلب کی باتیں ہی سننا چاہتے، نصیحتیں تو بہت ہی بری لگتی ہیں' نصیحتیں کرنے والا سب سے برا۔

اس بحث کے بعد ان دونوں کے درمیان ایک سرد مہری سی آگئی۔ اریبہ نے کئی بار سارہ کو اس لڑکے کے ساتھ گاڑی پر آتے جاتے دیکھا مگر خاموشی اختیار کر لی۔ ان دونوں کے بیچ جو اَن دیکھا کھنچاؤ آگیا تھا' وہ اسے مزید بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ اریبہ خود بھی اب سارہ کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار پاتی تھی۔ ایگزامز نزدیک تھے اور وہ اپنی پڑھائی کی وجہ سے کافی سنجیدہ ہوگئی تھی پھر بیچ میں عدنان کے ساتھ رشتے کا سلسلہ چل پڑا تو اس کی مصروفیت اور بڑھ گئی۔ سارہ اب بھی اکثر کالج لیٹ آتی تھی۔ اکثر اریبہ اپنی پیاری دوست کو سمجھانے کی کوشش کرتی مگر وہ اس کی باتوں پر کان نہ دھرتی۔ اریبہ دل مسوس کے رہ جاتی۔

☆☆☆

نکاح کے بعد کافی دنوں تک وہ کالج نہ جا سکی۔ سسرال والوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا پھر عدنان کی آسٹریلیا واپسی سے قبل ایک بڑی دعوت کا انتظام کیا گیا۔ ان سب چیزوں میں الجھ کر وہ بہت مصروف رہی۔ سارہ نے اس کے نکاح کی تقریب میں بھی شرکت نہ کی تھی جس کا اسے بہت برا لگا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ سارہ سے بات چیت نہیں کرے گی۔ اریبہ آج بہت دنوں بعد کالج آئی تھی۔ مین گیٹ سے داخل ہوئی تو بادام کے درخت کے نیچے اسے ایک بار پھر سارہ روتے ہوئے نظر آئی۔ وہ اسے دیکھ کر انجان بن کر نکل جانا چاہتی تھی کہ سارہ دوڑتی ہوئی آئی اور اریبہ کے گلے لگ کر بری طرح سے رودی۔ اریبہ کا دل اپنی دوست کی حالت زار پر بھر آیا، وہ بہت پریشان اور خوف زدہ دکھائی دے رہی تھی۔

''سارہ ......! کیا ہوا' سب خیریت تو ہے؟''

اریبہ نے اسے پانی پلاتے ہوئے پوچھا۔

''میری دوست' مجھے معاف کردو۔ تم ٹھیک ہی کہتی تھیں، عاشر میری دوستی کے قابل نہیں تھا، وہ تو بڑا بلیک میلر نکلا۔ میری دو مہینے بعد اپنے کزن سے شادی کی تاریخ طے پا گئی ہے۔ میں نے خوشی خوشی جیسے ہی اسے یہ بات بتائی' وہ کہنے لگا کہ یہ شادی نہیں ہوسکتی اور وہ مجھ سے محبت کرتا ہے' میرے بغیر نہیں رہ سکتا اور مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میری تو جان ہی نکل گئی' میں نے جب انکار کیا تو اس نے دھمکی دی کہ وہ میری ساری تصویریں جو اس نے اپنے موبائل سے کھینچی ہیں اور ویڈیو بنا کر بابا کو بھیج دے گا۔ اف...... وہ تو مجھے قتل کردیں گے۔ مجھے تو پتا بھی نہیں کہ اس نے کب اپنے ساتھ میری تصاویر اور ویڈیو بنالیں'' وہ ٹوٹ کے بکھر گئی تھی۔ اریبہ نے اسے تاسف سے دیکھا۔ اسے اسی بات کا ڈر تھا۔ عاشر دیکھنے میں ہی اتنا معصوم نہیں لگتا تھا پھر اس دور میں کوئی بے غرض دوستی نہیں کرتا۔ یہ ہی بات اریبہ اسے سمجھانا چاہ رہی تھی مگر شاید ہر انسان اپنے تجربے سے سیکھنا چاہتا ہے اور سارہ نے بھی اسی سے سیکھا۔

☆☆☆

وہ دن شاید اریبہ کی زندگی کا بدترین دن تھا جب وہ سارہ کے مجبور کرنے پر عاشر کو سمجھانے چلی گئی تھی۔ ان دونوں نے کسی تنہا مقام پر ملنے سے بہتر سمجھا کہ وہ عاشر سے ایک پبلک پلیس پر ملیں اسی لیے انہوں نے صبح کالج ٹائم میں عاشر کو ایک پارک میں ملنے کے لیے بلوایا۔ اریبہ نے سارہ کی زندگی خراب ہونے سے بچانے کے لیے وہ کام کیا جس کے لیے اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔ وہ رکشہ کرکے پارک تک جا پہنچیں۔ صبح کا وقت تھا' ان کے علاوہ اور بھی کالج کے لڑکے لڑکیاں وہاں موجود تھے۔ اریبہ کا دل بہت خراب ہو رہا تھا۔ ان لوگوں نے موبائل پر عاشر سے رابطہ کیا۔ وہ تھوڑی دیر میں ان کی بتائی ہوئی جگہ آ پہنچا۔ ایک بنچ پر وہ دونوں بیٹھ گئے۔ اریبہ ان کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس طرح وہ ان دونوں سے آرام سے مخاطب ہو رہی تھی۔ اس نے عاشر سے سارہ کی تصاویر اور ویڈیو ڈیلیٹ کرنے کی درخواست کی مگر وہ ان دو خوبصورت لڑکیوں کو اپنے سامنے یوں گڑگڑاتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ اس کی انا کو بہت تسکین پہنچ رہی تھی۔ اچانک اریبہ نے دیکھا کہ سارہ اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ اریبہ ہکا بکا رہ گئی۔ عاشر بھی اس کی اس حرکت پر حیران ہوا۔ ابھی اس کے حواس بحال بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک مشہور مارننگ شو کی اینکر ان دونوں کے سر پر آ کھڑی ہوئی' کیمرہ آن تھا، لائیو

پروگرام جاری تھا اور وہ اپنی ٹیم کے ساتھ اریبہ سے عجیب و غریب سوالات کرنے لگی۔ عاشر نے مسکراتے ہوئے کیمرے کی طرف دیکھا اور بنچ پر پوز بنا کر بیٹھ گیا۔ اریبہ ان لوگوں کے سوالات سے بچتے ہوئے اپنی صفائی پیش کرنا چاہ رہی تھی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا بولے؟

اریبہ کی ان لوگوں کی طرف پیٹھ تھی اس لیے وہ ان کو آتے ہوئے نہیں دیکھ سکی جبکہ سارہ نے دور سے ہی ان لوگوں کو کیمرہ سمیت آتے ہوئے دیکھ لیا تھا اسی لیے وہ بچ نکلی۔ ایک بار پھر اریبہ نے اپنی نرم دلی کے باعث بڑی مصیبت کو دعوت دے دی تھی۔ وہ ہی ہوا جب وہ بڑی مشکلوں سے ان لوگوں سے پیچھا چھڑا کر اپنے گھر پہنچی تو اس پروگرام کے باعث اس کی شہرت چارسو پھیل چکی تھی۔ کچھ نہ کرتے ہوئے بھی وہ مجرم بنا دی گئی۔

☆☆☆

عدنان کی امی نے جب فون پر نسرین کو اپنے بیٹے سے اریبہ کی بات ختم کرنے کی اطلاع دی تو انہیں یقین ہی نہیں آیا، اریبہ کا حال الگ برا تھا، ابھی تو اس نے خواب بُننے شروع کیے تھے۔

ادھر جب عدنان کے گھر والوں نے اس کا رشتہ ختم ہونے کی خبر اسے فون کے ذریعے دی تو وہ الگ حیران رہ گیا۔ وہ بہت بہت خوشی خوشی آسٹریلیا لوٹا تھا۔ اریبہ کے کاغذات اور نکاح نامہ ساتھ لے کر آیا تھا تاکہ اس کے ویزے کے لیے اپلائی کر سکے۔ اس نے میلبورن میں واقع اپنے آفس میں جوائننگ دینے کے بعد تمام دوستوں کے پرزور اصرار پر سب کو نکاح کی ٹریٹ بھی دی تھی۔ سب نے اریبہ اور اس کی نکاح کی تصاویر دیکھ کر جو وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا' اسے خوش قسمت قرار دیا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر خوش ہوتا کہ اس کے نصیب میں ایسی پیاری لڑکی

کا ساتھ لکھ دیا گیا ہے کہ آج اچانک اپنی ماں سے یہ خبر سن کر وہ پریشان ہو گیا۔ عدنان کے ہوش اس وقت اڑ گئے جب انہوں نے فوری طور پر اسے اریبہ کو طلاق دینے کا حکم دیا۔ اس کی جرح پر اس کے بھائی فیضان نے اس مارننگ شو کا وہ کلپ میل کر دیا جس میں اریبہ اور عاشر کو ایک ساتھ دکھایا گیا تھا۔ عدنان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کا دل اس بات کو ماننے پر تیار ہی نہیں ہوا پھر وہ لڑکا کسی طرح بھی اریبہ کے معیار کا نہیں لگ رہا تھا۔ یہ سب سوچ سوچ کر وہ بیمار پڑ گیا۔ گھر والوں کی طرف سے پڑنے والے دباؤ سے بچنے کے لیے اس نے اپنا فون آف کر دیا۔ فی الحال وہ پاکستان میں کسی سے بھی رابطہ رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

اریبہ اس واقعے کے بعد سے بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس بات کو دو مہینے گزر گئے تھے، اب تو اس نے سارہ کے گھر فون کرنا بھی چھوڑ دیا تھا، بس وہ اب صرف اپنے اللہ سے ہی مدد مانگ رہی تھی۔ گھر والوں کو بھی آہستہ آہستہ اریبہ کی بے گناہی پر یقین آ گیا تھا مگر وہ دنیا والوں کو کیسے یقین دلاتے؟ خصوصاً اریبہ کے سسرال والوں کے سامنے کیسے اپنی بیٹی کی صفائی دیتے؟ آخر انہوں نے اپنی بیٹی کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔

اریبہ نے حجاب لینا شروع کر دیا تھا۔ اب جبکہ وہ سب دھیرے دھیرے اس واقعے کو بھولنا چاہ رہے تھے تو ایک دن سارہ خود اس کے گھر چلی آئی۔ سارہ نے رو رو کر سارے گھر والوں کے سامنے اریبہ سے معافی مانگی۔ اس کی شادی ہونے والی تھی اسی لیے وہ کھلم کھلا اریبہ کے مسئلے پر اپنے گھر والوں کے سامنے نہیں بول سکتی تھی۔ نسرین نے سارہ کو بہت برا بھلا بولا۔ وہ انہیں حق بجانب سمجھ رہی تھی

اسی لیے سر جھکا کے سنتی رہی۔ وہ تو اس کے گھر جا کر شور مچانا چاہ رہی تھیں مگر ایک بار پھر اریبہ نے اس کا ساتھ دیا اور ماں کو خاموش کرا دیا۔

اس نے سارہ کو ابھی وہاں سے جانے کے لیے کہا کیونکہ وہ اپنی ماں کے جذبات سمجھ رہی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ جیسا طوفان اس کی زندگی میں آچکا ہے، ویسا ہی کچھ سارہ کے ساتھ بھی ہو۔

سارہ آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تمہیں پتا ہے کہ تمہاری وجہ سے عاشر نے میرا پیچھا چھوڑ دیا؟'' دروازے تک پہنچ کر اچانک سارہ نے مڑ کر اریبہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''مجھے پتا ہے، جب تم اس مصیبت میں چھوڑ کر مجھے چلی گئی تھیں، تب بھی میں نے گھر آنے سے قبل عاشر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر تمہارا پیچھا چھوڑنے کی استدعا کی تھی۔'' اریبہ کے چہرے پر پھیلی نرمی اسے اور خوبصورت بنا رہی تھی۔ اس کی سرمئی آنکھوں کی روشنی اور بڑھ گئی تھی۔ سارہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

''اس نے کیا کہا تھا؟'' سارہ نے پوچھا۔

''مجھے معاف کردیں، میری اور سارہ کی وجہ سے آپ اتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوگئی ہیں' وہ آپ کو ایسے حالات میں چھوڑ کر فرار ہوگئی پھر بھی آپ کو اسی کی فکر ہے؟ میں سارہ کی وجہ سے نہیں بلکہ آپ کی انسانیت اور شرافت کے صدقے' اسے معاف کرتا ہوں۔ عاشر نے ایک دم میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی۔'' اریبہ نے اسے بتایا۔

''میں یہ امید رکھوں کہ تم سارہ سے منسلک ہر چیز مٹا دو گے؟'' میں نے اس سے وعدہ لیا اور اس نے میرا مان رکھا۔ اریبہ نے بڑی مشکل سے ان تکلیف دہ لمحوں کو دہرایا۔ سارہ اس کا ہاتھ تھام کر ایک بار پھر رو دی۔

☆☆☆

اریبہ کی قسمت بہت اچھی تھی کہ اسے عدنان کی بیوی کی حیثیت سے آسٹریلیا کا ویزا جلد ہی مل گیا جس کے لیے لوگ بڑی تگ و دو کرتے ہیں۔

اگر ایسا پہلے ہوتا تو عدنان بہت خوش ہوتا مگر اس وقت تو وہ بڑا اداس ہو رہا تھا۔ دل بہلانے کے لیے وہ آج بہت دنوں بعد اپنے سسٹم پر بیٹھا تھا ورنہ اب تو اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ گھر والوں کے دباؤ کے باوجود ابھی تک اس نے اریبہ کو طلاق کے کاغذات نہیں بھجوائے تھے۔ جانے کیوں وہ ایسا کر نہیں پا رہا تھا؟ شاید یہ اریبہ کی دُعائیں تھیں جو اسے اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے روک رہی تھیں۔

آج خاصے دنوں بعد اس نے اپنا اکاؤنٹ کھولا اور میلز دیکھنا شروع کیں تو اریبہ نام کی ایک نئی آئی ڈی سے اس کے نام ایک طویل ای میل آئی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً پڑھنا شروع کیا تو بہت سی گتھیاں سلجھ گئیں۔ اس میل میں وہ تمام واقعات کیسے پیش آئے' تفصیل سے بیان کیے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی تصدیق کے لیے عاشر کا نمبر بھی درج تھا۔ عدنان کو یاد آیا کہ جب نکاح کے بعد ان کی بات چیت ہوتی تھی تو اریبہ اکثر اپنی دوست سارہ اور عاشر کا ذکر کرتی تھی۔ اسے اپنی دوست کی نادانی پر بہت غصہ آتا تھا۔ عدنان نے اسے ان دونوں کے معاملات میں پڑنے سے سختی سے منع کیا تھا۔

عدنان کا تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا' اسے پہلے ہی اپنی منکوحہ پر شک نہ تھا، اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ زنجیر کی کوئی کڑی گم ہے پھر بھی مرد کی فطرت...... اس نے فوراً ہی عاشر کا نمبر ملا کر ان باتوں کی سچائی جانچنا چاہی۔ عاشر نے نہ صرف اریبہ کی معصومیت کی گواہی دی بلکہ اریبہ کی بہت تعریف بھی کی۔

''عدنان بھائی' آپ یقین کریں' وہ میری

بہنوں کی طرح ہیں' انہوں نے ہی مجھے بھی سیدھا راستہ دکھایا ہے۔ میں تو خود آپ سے ان کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا مگر میرے پاس آپ کا کوئی کانٹیکٹ نمبر نہیں تھا۔'' عدنان نے فوری طور پر اپنے گھر والوں سے رابطہ کیا۔ اب اسے اپنی اریبہ کی حرمت کے لیے لڑنا تھا کیونکہ وہ اس کی منکوحہ بھی تھی۔

☆☆☆

اریبہ کو تو ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ رخصت ہو کر میلبورن آگئی ہے۔ سب کچھ اتنا جلدی اور اچانک ہوا۔ وہ سب حیران رہ گئے جب کئی مہینے رابطہ منقطع رکھنے کے بعد عدنان کی امی مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکروں کے ساتھ ان کے گھر چلی آئیں اور رخصتی کی تاریخ طے کر کے اٹھیں۔ نسرین نے ساری غلط فہمیاں دور ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ اریبہ کا سر تو سجدے سے ہی نہیں اٹھ رہا تھا۔ اس نے خاموشی اختیار کر کے صرف مالکِ دو جہاں سے مدد مانگی تھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کا بگڑا کام کیسے بنتا چلا گیا کہ وہ تو اس فیصلے سے اپنی مہینوں کی کلفتوں کو بھی بھول گئی؟ عدنان ان حالات سے اور اریبہ کو کھونے سے اتنا ڈر گیا تھا کہ وہ خود پاکستان نہیں آیا بلکہ اریبہ رخصت ہو کر میلبورن چلی گئی۔

عدنان کی امی دل سے راضی نہ ہونے کے باوجود کماؤ پوت کو کھونا نہیں چاہتی تھی اسی لیے ویسا ہی کرتی گئیں جیسا بیٹے نے چاہا۔

''اگر تم وہ ای میل مجھے پہلے ہی کر دیتیں تو اتنے مہینے جو ہم نے ذہنی اذیت کے کاٹے' اس سے بچ جاتے۔'' عدنان' اریبہ کے لمبے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔

''کون سی ای میل؟ میں نے تو آپ سے اس واقعے کے بعد کبھی کوئی رابطہ نہیں کیا؟'' اریبہ جو عدنان کے بازوؤں پر سر رکھے آنکھیں موندے لیٹی تھی' چونک کر اٹھ بیٹھی۔

''ارے' وہ ہی جس میں تم نے سارے واقعات بیان کرنے کے ساتھ اس عاشر نامی لڑکے کا فون نمبر بھی دیا تھا۔ میں نے اسے فون بھی کیا' وہ تو تمہاری بڑی تعریفیں کر رہا تھا۔'' عدنان نے محبت سے اسے واپس اپنی جانب کھینچا اور اس کی لٹ کو چھیڑتے ہوئے دھیرے دھیرے بتایا۔

''نہیں عدنان...... ! پتا نہیں' آپ یقین کریں نہ کریں مگر میں نے عاشر سے ملاقات صرف اپنی دوست کی ہمدردی میں کی تھی مگر اس مارننگ شو کی وجہ سے جب مجھ پر جھوٹے الزامات لگے تو میں نے خاموشی اختیار کر لی کیونکہ میرے پاس اپنی صفائی میں دینے کے لیے کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اسی لیے آپ سے بھی کوئی رابطہ قائم نہیں کیا مگر میرا اس سے مسلسل رابطہ تھا جو میری حقیقت جانتا تھا جس کے سامنے ہم کوئی دھوکہ فریب نہیں کر سکتے۔ میرا اللہ! میں نے صرف اپنے اللہ سے ہی اس معاملے میں اپنے بریت کی دعا مانگی تھی اور آج اس نے مجھے آپ سب کی نظروں میں سرخرو کیا۔'' وہ بولتے بولتے رونے لگی۔ عدنان بے چین ہو کر اریبہ کی جانب بڑھا اور اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

☆☆☆

''اریب...... ! اریب...... ! جلدی سے یہاں آؤ۔'' اریبہ اپنی بنارسی ساڑھی تہہ کر کے وارڈروب میں رکھ رہی تھی کہ دوسرے کمرے سے اسے عدنان آوازیں دینے لگا۔ اریبہ دلکشی سے مسکرائی۔ عدنان کی خواہش ہوتی تھی کہ جب وہ گھر میں ہو تو اریبہ اس کے سامنے یا آس پاس رہے۔ وہ لوگ ابھی ایک دعوت سے واپس آئے تھے۔ اریبہ کپڑے

تبدیل کر کے چیزیں سمیٹ رہی تھی۔عدنان کی تواتر سے جاری پکار پر وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر اس کی بات سننے کے لیے ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔

عدنان بہت خوش نظر آرہا تھا، وہ فون پر بڑے جوش و خروش سے کسی سے باتوں میں مشغول تھا۔''شاید پاکستان سے اس کی امی کا فون آیا ہوا تھا؟'' اریبہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب جا کھڑی ہوئی تو اس نے فون اس کو پکڑا دیا۔

''السلامُ علیکم!'' اریبہ نے شائستگی سے سلام کیا۔

''کیسی ہو اریبہ؟ میں سارہ بات کر رہی ہوں۔ پلیز' فون بند مت کرنا، مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' سلام کا جواب دینے کے بعد وہ اس ڈر سے جلدی جلدی بولی کہ کہیں اریبہ فون بند نہ کر دے۔

''ہاں بولو میں سن رہی ہوں، تمہیں یہ نمبر کہاں سے ملا؟'' سارہ کی آواز سن کر اریبہ ششدر رہ گئی مگر پھر اپنے مزاج کے باعث نرمی سے گویا ہوئی۔

''میں نے عائشہ باجی سے بڑی منتیں کر کے تمہارا یہ نمبر حاصل کیا ہے کیونکہ میرے ضمیر پر ایک بڑا بوجھ تھا۔ جو میں آج ہٹانا چاہتی ہوں پھر عاشر بھی یہی کہہ رہا تھا کہ ہمیں تم سے معافی مانگنی چاہیے۔ شاید اس طرح میرے دل کو سکون مل جائے۔'' سارہ کی باتوں پر وہ حیران ہوگئی مگر اسے ٹوکے بنا خاموشی سے سنتی رہی۔

عدنان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اریبہ' سارہ کی آواز سن کر ہیجان زدہ سی ہوگئی تھی۔ وہ اپنی پیاری بیوی کی دلی کیفیت بنا کہے جان جاتا تھا۔

''تم یہاں عاشر کا نام سن کر پریشان مت ہو' میری شادی اسی کے ساتھ ہوئی ہے، وہ آج کل مزید تعلیم حاصل کرنے یو کے گیا ہوا ہے۔ میں بھی کچھ دنوں کے بعد اس کے پاس جانے والی ہوں اسی لیے میں نے سوچا' جانے سے قبل تم سے معافی مانگ لوں۔'' سارہ نے اسے سمجھایا۔

''تمہاری نکاح تو شاید تمہارے خالہ زاد بھائی سے ہوئی تھی؟'' اریبہ سے رہا نہیں گیا تو اس نے سارہ سے سوال کیا۔

''یہ ایک طویل کہانی ہے، اگر تمہارے پاس وقت ہو تو میں سنا دوں؟'' سارہ نے لجاجت سے پوچھا۔ اس کا لہجہ ٹوٹا ٹوٹا سا تھا۔ اریبہ کو اس پر ایک دم ترس آیا۔ کچھ بھی تھا، وہ اس کی عزیز دوست تھی۔

''ارے' وقت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے' تم مجھے ساری بات تفصیل سے بتاؤ۔'' اس نے ریلیکس انداز میں کہا اور مسکرا کر عدنان کو دیکھا جو اس کے قریب کھڑا تھا۔

''میں نے پارک سے واپسی پر اپنی امی کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں ان کے ساتھ تمہارے گھر آ کر تمہاری پوزیشن کلیئر کرنا چاہتی تھی مگر انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ وہ جانتی تھیں کہ اگر یہ بات کھلی تو ابو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے، ساتھ میں امی کو بھی گھر سے نکال دیں گے۔ اسی لیے مجھے خاموشی اختیار کرنے کا حکم دیا۔ جب میں نے ان کی بات ماننے سے انکار کیا تو انہوں نے مجھے سزا کے طور پر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ خیر' میری امی نے تمہارے ساتھ برا کیا تو وہ ان کی اولاد کے آگے آیا۔ میرا خالہ زاد بھائی راشد کسی اور کو پسند کرتا تھا، مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مسلسل انکار کرتا رہا مگر میری خالہ کو بہن کو دی ہوئی زبان کا پاس تھا پھر وہ ابو کی گرم مزاجی سے بھی واقف تھیں، جانتی تھیں کہ اگر یہ رشتہ ختم کیا تو ابو طعنے دے دے کر امی کا جینا حرام کر دیں گے اسی لیے ارشد کی بات نہیں مان رہی تھی۔ شومئی قسمت، اس نے ایک دن مجھے عاشر کے

ساتھ دیکھ لیا، گھر جا کر خوب شور مچایا۔ خالہ نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی اور بہت دنوں تک اسے سمجھاتی رہیں مگر وہ نہیں مانا۔ اب تو اس کے پاس ایک مضبوط جواز تھا۔ آخر مجبور ہو کر شادی سے کچھ پہلے میری نکاح ختم کر دی۔

ابو غصے میں خالہ کے گھر لڑنے پہنچ گئے۔ خالہ کو اور امی کو بہت برا بھلا کہا۔ وہ بے چاری تو بہنوئی کی بری بھلی چپ چاپ سنتی رہیں مگر ارشد سے اپنی ماں کی بے عزتی برداشت نہیں ہوئی۔ خالہ کے منع کرنے کے باوجود اس نے میرا کچا چٹھا ان کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ ابو جھکے کاندھوں کے ساتھ خاموشی سے گھر واپس آئے اور امی سے صرف اتنا کہا کہ عاشر کو بلواؤ' مجھے سارہ کی شادی کی بات کرنی ہے اور یوں میری شادی عاشر سے ہوگئی۔

اس پارک والے واقعے کے بعد اس کے اندر بہت تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ برائیوں سے تائب ہو گیا تھا۔ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی، اس کے باوجود اس نے اپنا تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔ میری زندگی اس کے ساتھ اچھی گزر رہی ہے۔ سارہ تھوڑی دیر کو تھمی تو اریبہ نے اسے شادی کی مبارک باد دی۔

''ایک بات پوچھوں' عدنان کو وہ ای میل تم نے لکھی تھی نا؟'' اریبہ کو ایک دم احساس ہوا کہ سارہ ہی نے ای میل کے ذریعے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہا ہوگا۔

''آخر تم جان ہی گئیں نا؟'' سارہ مسکرا کر بولی

-

''تم نے میرے نام کی فیک آئی ڈی کیوں بنائی تھی؟'' اریبہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''دراصل میں اس وقت بہت ڈری ہوئی تھی۔ اس وقت تک عاشر والی بات میرے گھر میں نہیں کھلی تھی پھر میں عدنان بھائی کا مزاج بھی نہیں جانتی تھی۔ ڈرتی تھی کہ اپنے نام سے لکھوں تو وہ سب غصے میں میرے گھر تک نہ پہنچ جائیں۔ تمہاری مدد بھی کرنا چاہتی تھی مگر کیسے کروں؟ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' تمہاری ایک پرانی نوٹ بک میرے پاس رہ گئی تھی' اس میں تم نے عدنان بھائی کا ای میل ایڈریس لکھا ہوا تھا' بس میرے ذہن میں یہ آئیڈیا آیا۔ میں نے تمہارے نام سے ایک جعلی ایڈریس بنایا اور سارے واقعات انہیں لکھ بھیجے، ساتھ ہی عاشر کا فون نمبر بھی لکھ دیا۔ میرا یہ بھی خیال تھا کہ تمہارا نام پڑھ کر وہ یقیناً ان باتوں پر یقین کر لیں گے۔ میں نے عاشر کو بھی فون کر کے اس جعلی ای میل کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ بھی دل و جان سے تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا، یوں ہم نے تمہاری پوزیشن کلیئر کی۔'' سارہ نے بتایا تو اریبہ کے دل سے اپنی دوست کے لیے چھائے بدگمانی کے سارے بادل چھٹ گئے۔ اس نے تھوڑی دیر مزید بات کر کے فون رکھ دیا۔

عدنان کو ڈھونڈا' وہ کچن سے دو گرما گرم کافی کے کپ تھامے چلا آ رہا تھا۔ انہیں شاید سارہ پہلے ہی پورا واقعہ بتا چکی تھی۔

''عدنان' وہ......'' اس نے پکارا۔ عدنان نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''اب آئندہ اس بارے میں ہم کبھی بات نہیں کریں گے۔ جو گزر گیا' سو گزر گیا۔'' اریبہ نے اثبات میں سرشاری سے سر ہلایا اور عدنان کے کاندھے سے سر ٹکا کر کھڑکی سے باہر سڑک پر گزرنے والی گاڑیوں اور چمکتی دمکتی روشنیوں کو دیکھنے لگی۔ اس کی زندگی میں بھی ایسی ہی روشنیاں بھر گئی تھیں۔

☆☆......☆☆

آپ بھی لکھاری بن سکتے ہیں!!

آیئے! دوشیزہ کے قلم قبیلے میں شامل ہوجایئے

یہ کارواں آپ کو خوش آمدید کہتا ہے...... خود کو منوایئے، اپنے قلم سے......!

اگر آپ کا مشاہدہ اچھا ہے۔

اگر آپ کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سفر کرتے ہوئے آس پاس کے مناظر آپ کو یاد رہتے ہیں۔

شاعری آپ کو اچھی لگتی ہے۔

تو پھر قلم اٹھایئے اور کسی عنوان کو کہانی یا افسانے

میں ڈھالنے کی صلاحیت کو آزمایئے۔

ماہنامہ دوشیزہ آپ کی تحریروں کو، آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔

ہوسکتا ہے عنقریب منعقد ہونے والی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

تقریب میں آپ بھی ایوارڈ حاصل کریں۔

تحریر بھیجنے کے لیے ہمارا پتا:

88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

اس شیش محل میں ہر شخص کانچ کا سا نازک مزاج رکھتا تھا۔ ''بہو نے اٹھ کر صبح سلام نہیں کیا۔'' بڑی اماں ناراض ہو جاتیں۔ ''دلہن نے مجھے دینے سے پہلے سالن میں لمبا شوربہ کر دیا۔ چھوٹی امی منہ پھلا لیتیں۔ ''کیا ہی تھا کہ کپڑے پریس کر دیں مگر بھابی کو ہمارا کیا خیال۔'' نندیں بھی......

عماد سے شادی سراسر اس کی ذاتی پسند کا فیصلہ تھا۔ اس کی شخصیت اتنی سحر انگیز تھی کہ گویا صنف نازک کو مبہوت کرنے کے لیے ہی تراشی گئی ہو۔ وہ خود بھی اس حقیقت سے واقف تھا۔ اس لیے خود کو بنا سجا کر رکھنے کے سب ہی لوازمات سے لیس رہتا تھا۔

کلین شیو چہرے پر ہلکی شہد رنگ آنکھیں اور گلابی رنگت والے ہونٹ کی تشبیہات کسی حسینہ کے لیے نہیں بلکہ عباد جیسے مرد کے لیے استعمال کیے جاسکتے تھے۔ تو کیا عجب تھا اگر وہ ہی پہلی نظر میں دل ہار گئی اور پھر اس کے سامنے اعتراف بھی کرلیا۔

دوسری طرف یہ حال تھا کہ ''تم جیسے بہت آئے بہت گئے۔''

اس نے اس تعریف اور اعتراف کو اپنا حق سمجھ کر وصول کیا۔ امن پر احسان سمجھ کر وصول کیا۔

گھر میں کوئی بھی اس رشتے کے لیے راضی نہیں تھا۔

''جاب اچھی نہیں ہے۔'' ابا کو اعتراض تھا۔

''عمر بھی تو دیکھیں ابا' یہ آپی تھیں۔

''اے سسرال ہے کہ چیونٹیوں بھرا کباب۔'' دادی کا تجربہ بولا۔

''ہاں لیکن...... دیکھنے میں بالکل شہزادہ ہے۔

بالآخر ممتا نے ہی کی اس کے دل بات اور قدرت اپنی اس انوکھی تخلیق پر خود ہی تالی مار کر قہقہہ لگا بیٹھی۔

''ہاہ......!!'' لیکن وہ نہ ہنسی نہ بولی نہ بات کی، بس......

ایک گھمبیر چپ نے ایک اور دو راتیں اس کا احاطہ کیے رکھا۔ اس کے بعد اس نے کمر کسی اور میدان میں اتری۔

''جاب میں ترقی کے چانسز ہیں۔'' ابا کا اعتراض رفع کیا۔

''دس بارہ سال کا عمر کا فرق تو بہت عام سی بات ہے۔ آپی کو چپ کرایا۔

''سسرال تو ایک ساس سے ہی تخلیق پایا ہے اور ساس کیا بھلا...... شہد کی مکھیوں کی رانی ...... تو چیونٹیوں کی کیا اوقات ......'' دادی سوچ میں پڑ گیں۔ اور......

''امی ......!'' وہ واقعی بہت بجیلا ہے۔'' اس نے شرما کر امی کی گود میں سر چھپا لیا۔ بالآخر راستے میں کھڑی ساری رکاوٹیں ایک کے بعد ایک ڈھے گئیں۔ اور وہ دلہن بنی پیا سنگ رخصت ہو کر سسرال نامی اس جگہ پر ہاری جیسے سسرال کم اکھاڑہ کہیں تو زیادہ بہتر۔

جس طرح ایک میان میں دو تلواریں اور ایک چھتے میں دو رانی مکھیاں نہیں رہ سکتیں...... بالکل اسی طرح ایک سسرال میں سو ساسیں...... مگر اس سسرال میں رہتی تھیں...... جس سسرال کو گھر کرنے کے لیے اس نے ایک عمر جان ماری...... لیکن۔

☆......☆......☆

''یہ بیڈ کی چادر کا کیا حشر کیا ہوا ہے......؟''

وہ کمرے میں داخل ہوئے ہی چھنگھاڑا اور اس کے پیچھے پیچھے آتی رانیہ ہڑبڑا کر رہ گئی۔

''ابھی تو ٹھیک کی تھی میں نے...... اللہ یہ بچے بھی نا......!''

وہ تیز تیز بولتے ہوئے اس کا غصہ کم کرنے کو قریب آ کر میٹرس کے کناروں سے چادر کو اندر دبانے لگی۔

''تو تم بچوں کو کنٹرول نہیں کر سکتیں۔ آخر کرتی کیا ہو دن بھر...... جو اتنا بھی ہوش نہیں کہ بچوں کو ہی دیکھ لو۔''

جواب دینا بے فائدہ تھا سو اس نے اپنے ایک چپ سو سکھ والے معقولے پر عمل کرنے میں ہی عافیت جانی۔

لیکن عافیت نام کی چڑیا تو اسی دن اس کی زندگی کا قفس کھول کر اُڑ گئی تھی۔ جس دن اس نے اس شیش محل میں قدم رکھا تھا۔

اور یہ شیش محل کی اصطلاح اس نے اس گھر کے لیے خود ہی ایجاد کی تھی۔

اس شیش محل میں ہر شخص کانچ کا سا نازک مزاج رکھتا تھا۔

''بہو نے اٹھ کر صبح سلام نہیں کیا۔'' بڑی اماں ناراض ہو جاتیں۔

''دلہن نے مجھے دینے سے پہلے سالن میں لمبا شوربہ کر دیا۔ چھوٹی امی منہ پھلا لیتیں۔

''کیا ہی تھا کہ کپڑے پریس کر دیں مگر بھابی کو ہمارا کیا خیال۔''

نندیں بھی شیش محل کی رانیاں ہی تھیں ایسے میں اس جیسی کنیز کی کیا حیثیت اور کیا کام باقی بچتا تھا۔

''معاف کر دیں بڑی اماں کسی اور دھیان میں ہوں گی آئندہ سب سے پہلے آپ کو سلام کروں گی۔'' ناراضگی دور۔

''ارے چھوٹی امی غلطی ہو گئی چلیں اب آپ کے لیے الگ سے سالن نکال لیا کروں گی۔'' چھوٹی امی کے منہ کا سائز نارمل کیا۔

لیکن کانچ کے مزاج والے لوگوں کے لہجے اور انداز بڑے پتھر تھے بابا......! اسے تو انداز ہی نہیں تھا صرف لہجے ہی نہیں رویے بھی۔

☆......☆......☆

''لو...... آپ پھر میکے جانے کو تیار ہے سواری۔'' وہ یوں ہو گئی گویا جیسے تین سو دو کا مجرم...... برابر میں ہی عماد کھڑا تھا بے نیازی سے موبائل کے بٹن دباتا رہا۔

''ٹک ٹک ٹک......''

''اچھا اب تیار ہو ہی گئی ہو تو ہو جاؤ......'' بڑی اماں بڑبڑاتی ہوئی دوسری طرف مڑ گئیں سامنے ہی رکھے SEGA پر ان کا فیورٹ گیم لگا ہوا تھا۔

سپر ماریو...... جس میں جانے کتنی تگ ودو کے بعد ایک درجہ اوپر چڑھنے کی چابی ملتی تھی۔ اور دل ہی دل میں وہ شکر ادا کرتی رانیہ سوچنے لگی ان کے دل میں ایک درجہ اور اوپر چڑھنے کے لیے بھلا کون سی چابی اور کہاں سے ملے گی۔

''جواب ندارد...... سوال متمنی......

وہ تیزی سے جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ مبادا عماد کا موڈ بدلے اور اس کی ساری تیاری دھری کی دھری رہ جائے۔

☆......☆......☆

''چادر ٹھیک کر آئی ہو بستر کی۔''

راستے میں ابا کا گھر آنے سے ذرا پہلے عماد کو اچانک ہی یاد آ گیا۔

''جی کر تو دی تھی۔''

''کیا مطلب کر تو دی تھی یعنی تمہیں یاد ہی نہیں...... حد ہے رانیہ ایک فقط...... ایک چیز مجھے ناپسند ہے تم وہی ڈھنگ سے کر کے نہیں رکھ سکتیں۔

رانیہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی بول نہ سکی۔

ایک چیز آپ کی، دو چیزیں آپ کی بڑی والدہ کی چار چیزیں چھوٹی والدہ کی...... ایسی ہی کچھ باتیں چھوٹی بہن اور کچھ بڑی بہن کی...... اور...... اور...... آخر وہ کس کس بات کا خیال رکھے لیکن عماد اپنی بات کا سچا تھا۔

''مجھے صفائی پسند ہے صاف ستھری چیزیں اچھی لگتی ہیں۔''

ان میں صاف ستھری چادر سرفہرست تھی لیکن یہاں سے تو فہرست شروع تھی نا......! پھر یہاں سے لے کر وہاں رک فہرست ختم کہاں ہوئی تھی اسے تو صفائی دیتے الفاظ اور لہجوں تک سے عشق تھا ہمیشہ عدالت ہی سجی رہتی۔

''کمرے کو درست کر کے رکھا کرو۔ میں

آ ؤں تو ہر چیز جگہ پر ملے۔''

''چھوٹے بچوں کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''چھوڑو تم...... تم سے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔''

اور یہ ہی بات سب سے غلط تھی۔

آخر محبت جیسا اوکھا کام بھی تو اسی نے کیا تھا۔ پھر اسے عشق کے درجے تک پہنچایا یہ کوئی آسان تھا اور وہ بھی عماد جیسے شخص سے جس کے ساتھ محبت اگر شروع ہو تو صورت سے چل کر گفتار سیرت و کردار سے ٹہلتی ہوئی واپس صورت پر آئے اور محبت سے فقط آشنائی تک رہ جائے۔

اس کا جگر کوئی معمولی تھا۔ یہ بھی ایک کارنامہ ہی تھا جو اس نے انجام دیا تھا مگر بہرحال اس کی خوبیوں کی گنتی میں انگلیوں کی کسی پور پہ جگہ نہ پاتا۔

''شام میں آ جاؤں گا لینے جلدی، تیار رہنا۔''

''جی اچھا۔'' تابعداری اس پر ختم ہوئی۔

''سر تو ایسے ہلایا ہے جیسے بڑی کہیں کی علامہ ہیں۔ خود پسندی عماد پر ختم تھی وہ صرف خود ہی کو عالم فاضل سمجھتا تھا اور کیوں نہ سمجھتا، اس کے ذہن میں یہ یقین واضح بھی تو خود رانیہ نے ہی کیا تھا۔

☆......☆......☆

شادی کی پہلی رات ہی اس نے رانیہ کو باور کرا دیا تھا بہت کچھ۔

''میں نے رشتہ صرف امی کے کہنے پر جوڑا ہے ورنہ مجھے شادی کی اتنی جلدی نہیں تھی۔''

گھر کا اکیلا مرد ہوں سب خواتین کی مجھ سے ایک سی توقعات ہیں اس لیے تم ذرا خیال سے رہنا۔'' یہ الفاظ دیگر تم کہیں اترائی شکل نہ بن جانا۔

''صفائی پسند ہوں، صفائی کا خیال رکھنا خاص کر بستر کی چادر پر شکنیں مجھے بالکل بھی برداشت نہیں۔'' وہ خواہ مخواہ سمٹ سی گئی۔

بستر کی شکنوں پر اس کے معصوم اور محبت بھرے دل نے کیا کیا نہیں سوچ ڈالا تھا۔

''تم بھی کچھ کہو یا بس سنتی ہی رہو گی۔ خیر یہ بھی اچھا ہی رہے گا۔''

اپنی بات کا خود ہی جواب دیا اور وہاں سے اٹھ گیا یہ جاننے کی زحمت کیے بغیر کہ میں...... میں...... کے بعد یقیناً تم...... تم...... تم کی باری بھی کہیں آس لگائے بیٹھی ہے لیکن...... وہ مایوس نہیں ہوئی دل ہی دل میں بولتی ہوئی نثار ہوگئی۔

''میں نے یہ رشتہ صرف اپنے دل کے کہنے پر جوڑا ہے ورنہ شادی کی جلدی مجھے بھی نہیں تھی۔''

''آپ صرف گھر کے اکیلے مرد نہیں، میرے دل پر راج کرنے والے بھی اکیلے مرد ہیں۔''

''اور میں...... عشق پرست ہوں، محبت پسند ہوں، مجھے چاہنا بھی پسند ہے...... چاہے جانے کے علاوہ۔''

☆......☆......☆

وقت گزرتا رہا دن مہینے اور پھر سالوں گزر گئے۔

وہ محبت کرتی رہی خدمت کرتی رہی، تابعداری کرتی رہی لیکن نتیجہ صفر ہی رہا۔

یہاں تک کہ اس کے پھول سے وجود نے اس کی ممتا کو مہکا دیا پھر بھی......

پھر بھی اس کی خوشبو اس کے محبوب کے دل کو مہکا نہ سکی۔ اور بھلا...... پتھروں سے کون خوشبو اگانے کا جوکھم مول لے۔ جو لے سو دیوانہ۔

اور وہ بھی سودائن سی ہوگئی۔

بکھرے بال سوکھے لب، گدلی ویران

آنکھیں۔ کبھی سالن بھونتے ہوئے، کبھی کپڑے نچوڑتے ہوئے، کبھی بالٹیاں بھر بھر کر کچن میں پانی بہاتے ہوئے، لحافوں میں ڈورے، حلوے کی بھنائیاں، اچار کے مصالحے، مربوں کی کسائی، سبزی کی چھنائی، بجٹ...... یوٹیلٹی بلز، بیماری...... آنا جانا...... لینا دینا؟ مہمان داریاں تو میزبان نوازیاں۔

اس کی ذات ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہزار خانوں میں بٹ گئی۔

اب وہ کہیں باورچن تھی، کہیں دھوبن...... کہیں درزن تھی تو کہیں جھاڑن لیکن کوئی اس کی اپنی ذات کو اگر ڈھونڈنے نکلتا تو شاید وہ خود کہیں بھی نہ ملتی کہیں بھی نہیں۔

ستم یہ تھا۔ کہ خلقت دنیا اب بھی ناخوش تھی...... ؟؟ اب بھی۔

وہ اپنی زرد آنکھیں سے کے گدلے آئینے میں گاڑ کر سوال کرتی تو دور تک اس سوال کی گونج سنائی دیتی۔ بازگشت پلٹ پلٹ کر آتی اور اس کے شعور کی ناہموار سطح سے ٹکراتی پٹختی، لڑھکتی۔

''اب بھی...... اب بھی...... اب بھی...... ؟؟''

اور پھر جواب ڈھونڈنے کے لیے اسے اتنا وقت درکار ہوتا جو، اب اس کی اپنی ذات کے لیے ملنا بے حد مشکل تھا۔

بے حد مشکل اس کی محبت سے بھی مشکل...... اس کے محبوب کے مزاج سے بھی مشکل...... جو آج بھی اتنا ہی پر پیچ تھا ہاں لیکن محبت اتنی مشکل نہیں رہی تھی بلکہ پتا نہیں شاید محبت اب رہی بھی تھی یا نہیں۔

ایک دن یہ خیال اسے بے طرح پریشان کر گیا۔

''کیا...... کیا اب مجھے عماد سے محبت نہیں رہی۔ لیکن کیوں نہیں رہی۔''

عماد اب بھی ویسا ہی خوبصورت اور جوان تھا۔

نظر بھر کے دیکھ لیتا تو اس کے رخسار دہک اٹھتے پلکیں جھک جاتیں الفاظ اٹک جاتے اور بات رک جاتی۔ اگر عماد ویسا ہی خوبصورت اور جوان تھا تو کیا وہ بھی اب تک ویسی ہی شرمیلی تھی پاکباز اور حیا آمیز۔

اور کیا ہی اچھا ہوتا کہ جیسے وہ جوان تھا ویسے وہ بھی حیا آمیز اور پاکباز ہی رہتی مگر ایسا ہو نہیں سکا۔

عماد نے نظر بھر کر اسے دیکھ ہی لیا اور پھر کتنی ہی دیر دیکھتا رہا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں۔'' وہ سمجھی شاید آج میری محبت کے چمکنے کا دن ہے۔''

''یہی کہ بظاہر تو تمہیں کوئی غم نہیں لیکن حالات ایسی بنا رکھی ہے جیسے برسوں کی مریضہ...... چند دن کی مہمان......''

اس کے لبوں پر الفاظ نہیں، انگارے سے چپکے اور اس کی سماعتیں جھلسانے لگے۔

اس کے بعد وہ کچھ نہ بولا نہ رانیہ کے اندر سننے کی خواہش پیدا ہوئی شاید اس کے اندر ہر خواہش آخری ہچکی لے کر تمام ہو گئی۔ یہاں تک کہ چند آنسو اسی بستر اور تکیے میں منہ چھپا کر بہانے کی خواہش بھی...... جس کی شکنیں دور کرتے کرتے اس کی پوری زندگی سلوٹوں سے بھر گئی تھی۔

اور تب اس رات پہلی بار اس نے آدھی رات کو سیل فون اٹھایا اور ایک پیغام لکھ کر سامنے ہی لاگ میں چمکتے انجان نمبر پر بھیج دیا یہ نمبر جو

متواتر تین ہفتوں سے اسے خاموش رابطے سے جوڑے ہوئے تھا۔ اور اس خاموش کال کو بھی کسی منچلے کھلنڈرے کا کھیل سمجھ کر نظر انداز کرتی رہی تھی۔

''محبت اتنا خوار کیوں کرتی ہے۔''

دوسری طرف موجود شخص نے پیغام پڑھا آدھی رات کو گھڑی میں وقت دیکھا اور مسکراہٹ برسنے لگی۔

☆......☆......☆

''محبت مرد کو خوار نہیں کرتی کیونکہ مرد محبت کے پیچھے نہیں بھاگتا وہ ایک مشاق گھڑ سوار کی مانند خواہش کے براق پر سواری کرتا ہے اڑان بھرتا ہے اور محبت کو ہمیشہ اپنے پیچھے بھگاتا ہے۔''

دوسرے دن اس کے سیل میں جوابی پیغام جگمگا رہا تھا۔

اس نے پڑھا لیکن غور نہیں کر سکی عماد کمرے میں تھا اس پر برس رہا تھا۔ ''دعوے تو بہت کیے تھے تم نے میری محبت میں زمین آسمان ایک کرنے کے کر ہی کیا سکتی ہو تم نہ کمرہ ٹھیک سے رکھتی ہو نہ خود کو...... ایک یہ...... بیڈ کی چادر تک برابر نہیں کی جاتی تم سے۔

اس نے گھنٹوں پہلے بنی ہوئی فیڈر کسمساتے ہوئے ٹیپو کے منہ میں گھسیڑی الجھے بال جوڑے میں لپیٹے۔

آج تانیہ کے سسرال والوں نے آنا تھا اور انتظامات ظاہر ہے اسی کے سپرد تھے۔

کوئی مصروفیات سی مصروفیت تھی وہ اس ملال سے بھی گئی جو گھڑی دو گھڑی عماد کے خود پر توجہ دینے سے دل میں جاگتا تھا۔

سب ہی کچھ خیر سے پایہ تکمیل کو پہنچا سوائے سبز چائے کے، جس میں سبز پتوں کی تیزی ذرا سی کڑواہٹ کا احساس جگاتی مہمانوں کے حلق سے اترنے نہ دیتی شاید انہیں بھی اس شیش محل کے باغیچوں کی طرح رانیہ کی حیثیت کا اندازہ ہو چلا تھا۔

''بس بہن، بہت کھا لیا...... پیٹ بھر گیا سب بہت مزیدار تھا ماشاء اللہ۔''

''جی بہت ذائقہ ہے ہماری تانیہ کے ہاتھ میں۔

چھوٹی امی نے لمحہ بھر میں اس کی محنت اور خجل خواری کے گوشوارے، تانیہ کے فیشل بلیچ میک اپ اور جانے اور کا الا بلا کے ساتھ غلط ملط کر دیے۔ اور وہ منہ کھول کر رہ گئی۔

''ہاں بس یہ گرین ٹی ذرا سی تلخ ہو گئی۔ بہر حال ہے تو بہت فائدہ مند۔''

''حالانکہ ماشاء اللہ رانیہ بہو روز ہی بناتی ہے، پر آج جانے کیوں۔''

وہ یوں بولی تھیں گویا رانیہ بہو روز کے روز صرف سبز چائے بنانے کا کام ہی سرانجام دیتی ہے۔''

اس کے کانوں میں عماد کی آواز گونجی۔

''دعوے تو بہت کیے تھے...... کر ہی کیا سکتی ہو۔''

'ہاں ایک سبز چائے تو ڈھنگ کی بنا نہیں سکتی۔''

اس رات آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے اس نے خود اپنا مضحکہ اڑایا۔

''محبت تب تک انمول رہتی ہے جب تک دل میں دبی رہتی ہے۔ دل کے مقبرے میں مدفن محبت ہی معتبر ہوتی ہے وہاں سے نکل کر اگر مرد کے سماعت و بصارت تک چلی جائے، دل تک پہنچ جائے تو پھر...... اسے کہیں جائے پناہ نہیں ملتی......

یہ بے مول ہو جاتی ہے۔''
''کچھ چیزیں بے مول ہوتی ہیں لیکن ہر ایک کے نزدیک نہیں۔''
''مطلب...... ایسی بھلا کیا چیز۔''
''مطلب...... جیسے...... بارش...... اس کی قدر کسی ایئر کنڈیشنڈ آفس میں بیٹھے گروپ آف انڈسٹریز کے مالک سے نہیں، اس دہقان سے پوچھو جس کی کھڑی فصل ایک ایک بوند کے انتظار میں کڑی دھوپ میں جلتی ہے۔''
''جیسے میری محبت جلتی ہے عماد کے بے مہر رویے کی کڑی دھوپ میں ایک بوند کے لیے میٹھے بول کی ایک بوند، مہربان لہجے کی ایک بوند، نرم نگاہ کی ایک......''
''یہی غلطی ہے تمہاری۔''
''کیا۔'' اس نے اضطراب سے کروٹ لی۔
''محبت میں بھلا قناعت کا کیا ذکر۔ تم عورتیں ایک بوند کو پورا ساون سمجھ کر اسی پر تکیہ کر کے بیٹھ جاتی ہو اور مرد اسے تم لوگوں کی اوقات سمجھ لیتے ہیں۔''
الفاظ اس کے دل پر اوس بن کر گرے اور وہ گہری سوچ سے گہری نیند میں اتر گئی۔

☆......☆......☆

دھیرے دھیرے اس کے من آنگن میں اترتی دھوپ پیلی پڑنے لگی۔
بھاپ اور دھواں جہاں بھی بھرے گھٹن تو پیدا کرتا ہی ہے۔ اس کی رسائی کے لیے کوئی نہ کوئی رستہ ضرور ہونا چاہیے چاہے وہ کوئی چمنی ہو یا چھید۔
پھونک پھونک اس کے اندر کی گھٹن بھی اس اجنبی رانگ نمبر والے روزن سے باہر کی جانب نکلنے لگی۔ آگہی کے در کھلے تو اپنی قدر و منزلت کا احساس بھی پیدا ہو گیا۔
وہی رانیہ جو پہلے ہر کسی کی پہلی آواز پر دوڑی چلی جاتی تھی اب دوسری تیسری آواز پر حاضر بھی ہوتی تو اس طرح کہ یا تو موبائل ہاتھ میں اور نظریں اسکرین پر ہوتیں اور دماغ کا پتا نہیں یا پھر...... جلدی جلدی آدھا پونا کام نمٹا، آدھی پوری بات سن...... ہوں ہاں جواب دے...... یہ جا وہ جا......''
''کیا ہو گیا ہے رانی بیگم کو!''
گھر میں ابھی بھی لوگ اسے اپنی مرضی اور مزاج کے ڈھب سے بلاتے تھے لیکن بلاتے اسی کو تھے اس سے کسی کو انکار نہیں۔
''میں...... میں کبھی آپ سے فون پر بات نہیں کروں گی۔''
''ارے کیوں......''
''کیوں کیا مطلب غلط بات ہے اور میں...... پہلے ہی دھوکہ دے رہی ہوں...... اپنے محرم اپنے مجازی خدا کو۔''
کوئی دل میں چٹکی سی کاٹ لیتا۔
''تو تھوڑا سا دھوکہ اور سہی۔''
''نہیں...... تھوڑے تھوڑے سے بہت ہو جاتا ہے۔'' وہ سخت ہو جاتی۔
کبھی سوچتی آج نہیں...... اب نہیں...... اور نہیں لیکن وہی دن تھے راتیں وہی تھیں لوگ وہی تھے اور ان کے پتھر مزاج دل توڑ رویے وہی تھے تو پھر اس کے ارادے بدل جاتے اور وہ ٹیپو کو سلا کر فون اٹھا لیتی۔
عماد کا انتظار یوں نہیں کرنا پڑتا کہ وہ پہلے گہری نیند میں جا چکا ہوتا تھا۔
''عورت آخر کیا کرے ایک مرد کی محبت پانے کے لیے۔'' آج دل پر تازہ تازہ چوٹ

پڑی تھی۔
آج عماد نے بیڈ پر اچھلتے ٹیپو کو اٹھا کر بیڈ سے نیچے پٹخ دیا تھا اور اس کا دل بھی جیسے کسی نے پوری طاقت سے ٹوٹے کانچ پر دے مارا تھا۔ آج جو لہو بہتا تھا اس کا رنگ ہی اور تھا۔
''کیسی عورت ہو۔ زندگی گزر جائے گی سکھاتے سکھاتے مگر تمہیں کچھ نہیں آئے گا۔''
شرارت ٹیپو کی تھی اور وہ تربیت اس کی کرنے چلا تھا اگر تربیت کی جگہ محبت کرنے چلا ہوتا تو......
اور پھر ساری بار آخر محبت پر ہی آئی نا!
''عورت کو چاہیے کہ سب سے پہلے خود سے محبت کرے۔ اپنی ذات سے اپنی عزت نفس سے ،......عورت کی سب سے بڑی غلطی ہی اس کا پانی ہونا ہے۔''
'پانی اور عورت......؟''
''ہاں پانی جو...... ہر رنگ اور شکل میں ڈھل جاتا ہے۔ اس میں جو عنصر ملایا جائے وہ اسی کا ذائقہ اپنا لیتا ہے۔ اسی کا رنگ گھول لیتا ہے خود میں، جس برتن میں ڈالا جائے اسی کی شکل بنا لیتا ہے۔''
''تو کیا غلط ہے یہ۔''
''ہاں ...... عورت کو آگ جیسا ہونا چاہیے آگ جو کسی سے محبت نہیں کرتی اپنے سوا آگ جو اپنے راستے میں آنے والی ہر شے کو نیست و نابود کر دیتی ہے ہر شے فنا ہو جاتی ہے اس کے سامنے۔
''اچھا......تو پھر بھلا عورت محبت کیسے کرے گی۔ محبت تو خود فنا ہونے کا نام ہے۔ محبت کسی کو ختم نہیں کرتی خود ختم ہو کر اپنے محبوب کو جلا دیتی ہے اسے امر کر دیتی ہے۔''
''جیسے تم خود ختم ہو رہی ہو۔ اور عماد جیسے بے حس شخص کو امر کر رہی ہو۔ یاد رکھنا وہ اگر امر ہو بھی گیا تو اسے بھی اپنی ہی کارگزری سمجھے گا۔ تمہاری محبت کی کرامات نہیں اور تم......ایک دن یونہی اس کی نگاہوں کی بھیک اس کے دل میں ایک فقط ایک کونہ تلاش کرتے کرتے مٹی ہو جاؤ گی۔''
ضروری نہیں کہ ہمیشہ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ جلائیں۔ تپش لکھے ہوئے میں بھی ہوتی ہے۔ اس نے اس روز جانا۔''
''ہاں۔'' اس نے گہری سانس بھری۔
''عورت کا خمیر اٹھا ہی مٹی سے ہے۔ اسے محبت کا پانی دے کر گوندھو اور پھر جدھر کو چاہو موڑ دو۔'' پلکیں موندنے سے پہلے آخری سوچ شعور کی سطح پر ابھری اور ڈوب گئی۔

☆......☆......☆

وہ ایک بے حد مصروف ترین دن تھا۔
جب شہر سے باہر رہنے والے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع ملی۔ وہ اپنے میکے جانے کے ارادے سے گھر سے نکل چکی تھی۔ اور امی کے سامنے کھڑے ہو کر ان کا پرنور چہرہ اپنی تھکن زدہ آنکھوں میں جذب کر رہی تھی۔
''کیا حال کر لیا ہے کن چکروں میں رہتی ہو۔ خود پر بھی توجہ دو بھلا، ایسی ہوتی ہے سہاگنیں۔''
''وہ سہاگنیں ہوتی ہوں گی امی میں تو ...... میں تو بس عورت ہی رہ گئی ہوں۔ ممتا کے سوا اب اور کوئی جذبہ شاید میری نسوانیت کے ثبوت کے لیے باقی نہیں بچا۔''
وہ صرف سوچ ہی سکی۔ بول پڑتی تو شاید ماحول میں نہیں رہتا جو اس وقت نرم گرم ماں کی گود کی طرح زمانے کی ہر سختی سے پرے۔ بس آشتی اور امن۔

تبھی فون بج اٹھا اور اس کی روانگی کا بگل بج اٹھا۔

''کیا مصیبت ہے تمہارے سسرال والوں نے تمہیں بیگار کا مزدور سمجھ رکھا ہے کیا۔''

''لو حد ہوگئی ہے اتنے دن بعد آئی بھی تو بس شکل دکھانے۔'' دادی بولیں۔

''اور شکل بھی تو دیکھیں کیسے بارہ بج رہے ہیں۔ امی کا دل پسیج جاتا تھا۔

''ہاں تو کیوں نہ بجیں کیا میں جانتی نہیں میری بچی کے دل کی بات۔''

''آپ واقعی نہیں جانتیں دادی۔'' اس کے دل کی بات دل میں ہی رہی۔

یوں اچانک آنے اور فوراً واپس پلٹنے سے افسردہ تو سب تھے لیکن اس سے زیادہ نہیں۔

''کل آجاؤں گی امی۔ ٹیپو کو چھوڑ جاتی ہوں تو پھر کوئی انکار نہیں کر سکے گا۔''

اس نے خود ہی راہ نکالی لیکن آفس کی چھٹی کر کے خود کو پک کرنے کے لیے آئے ہوئے عماد کے سامنے آنسو رک نہیں سکے۔ کیونکہ ٹیپو کو چھوڑنے کی اجازت نہیں مل سکی تھی۔

''اوہو...... اتنا کیوں رونا آرہا ہے۔ بہت زیادتی ہوگئی۔''

''بات تو زیادتی کی ہی ہے کوئی سمجھے تب نا۔''

''یعنی ...... تمہارے خیال میں تمہیں کوئی سمجھنے والا نہیں۔''

''سمجھنے والا۔'' اس نے طنز سے عماد کی آنکھوں میں جھانکا۔

''مجھے کوئی سننے والا نہیں۔''

شکوہ زندگی میں پہلی بار اس کے لبوں سے نکلا اور عماد کو چونکا گیا۔

شوہر بیوی سے محبت بھلے کرے نہ کرے اس کی پرواہ کرے یا نہ کرے۔ لیکن اس کے لہجے کے نشیب و فراز کو فوراً بھانپ لیتا ہے اور آج تو پھر انہونی ہوگئی تھی۔

اور کوئی انہونی یوں بھی وقوع پذیر ہوئی ہے انسان کے دل کی دنیا کو تہہ و بالا کر دیتی ہے۔

☆......☆......☆

اس نے چائے دم دیتے ہوئے کچن کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔

لاؤنج میں بیٹھا ہر شخص خوش گپیوں میں مگن تھا۔ سوائے اس کے مجازی خدا کے۔ اور وہ ایک نظر اس پر ڈال کر ہمیشہ کی طرح بات کا اصل متن بھول جاتی تھی۔

یہ وہی شخص تھا جس کی زندگی میں داخل ہونے کے لیے لگائے گئے ایڑی چوٹی کے زور کی چرچا اس گھر سے، اس گھر پہنچی تھی تب سے اب تک میں کہاں کہاں، کیا کیا تبدیلیاں نہیں آئی تھیں۔ خود اس کی اپنی شخصیت اس قدر تغیرات کا شکار تھی کہ کبھی کبھی آئینہ بھی اسے پہچاننے سے چونک جاتا تھا۔ مگر وہ شخص ...... وہ اس کی محبت، اس کا محبوب اس کا محرم، وہ وہیں تھا۔ سو فیصد وہیں کا وہیں ......

جو اگر بیٹھا ہوتا تو کائنات ساکن لگتی۔ جو اگر کھڑا ہو جاتا تو لگتا کہ دنیا میں اس سے زیادہ وجیہ سراپا بھلا کس کا ہوگا۔ جو سوچ میں گم ہوتا تو رانیہ اس کے چہرے کے نقوش میں گم ہو جاتی اور اگر بول پڑتا تو ...... تو اس کے لبوں کے خم ساری خوبصورتی کا نقطہ بن جاتا وہ خود تو یوں بھی حسن کے ہتھیاروں سے لیس نہیں تھی رہی سہی کسر گھر میں رہنے والے دوسرے لوگوں نے پوری کی اور وہ بالکل ہی ہنستی ہوگئی۔

''آج بھائی بڑے چپ چپ سے ہیں۔''
''اچھا۔'' وہ جو بڑی دیر سے اس پر نظریں جمائے ہوئے تھے تانیہ کی بات پر چونک کر دوبارہ اسے دیکھنے لگی۔
''آپ کو نہیں لگا۔'' اس کا حیرت زدہ لہجہ طنزیہ تھا۔
''ہاں...... آپ تو اپنی ہی دنیا میں مگن رہتی ہیں۔''
اسے جانے کیوں اعتراض تھا ہر بار کی طرح اس بار اسے افسوس کے بجائے غصہ سا آ گیا۔
''تو میرے علاوہ باقی سب کیا دوسروں کی دنیا بن رہے ہیں۔ سب اپنی ہی دنیا میں گم ہیں۔ ایک میں ہی کیوں؟''
زبان پر سے سارے اختیارات اٹھا لینا ایک دم سے ممکن نہیں ہوتا۔ بہت عرصہ دل و دماغ کے درمیان بات چیت ہوتی ہے۔ نکتے قواعد، یادداشتیں پیش کی جاتی ہیں۔ معاہدے ہوتے ہیں ارادے ٹوٹتے ہیں۔ پھر کہیں جا کر یہ محاذ کھلتا ہے شروع شروع صرف طنز کے ہلکے پھلکے وار کیے جاتے ہیں طعنوں تشنوں کی فائرنگ کی نوبت بہت بعد میں آتی ہے اور الزامات کی گولہ باری اس کے بھی بعد۔
وہ تو اتنے سالوں میں محض دل اور دماغ کو ایک رکھنے اور دل کو دماغ کی تابعداری سکھانے میں ماہر ہوئی ہے۔ بھلا اتنی جلدی کہاں کسی طنز کا جواب فوری اور حتمی انداز میں 'داغ' سکتی تھی۔ اسی لیے نظریں جھکا کر سنجیدگی سے چائے کی ٹرے اسی کو تھما دی کہ سب لوگوں میں تقسیم کر دے۔
دراصل...... اپنی دنیا...... کے الفاظ کے ساتھ ہی اسے کسی اور کی یاد آ گئی تھی۔
وہ جلدی سے کمرے میں آئی اور سب سے پہلے بیڈ پر اچھلتے ہوئے ٹیپو کو دو تھپڑ رسید کر کے نیچے اتارا بستر کی چادر سے سلوٹیں نکال کر اسے سیٹ کیا۔ پھر اطمینان سے بیٹھ کر سیل فون نکالا تو۔''
آئے ہوئے سب ہی پیغامات کسی نے پڑھ ڈالے تھے اس سے پہلے ہی، اس کی لاعلمی میں اور بھلا کون کر سکتا تھا یہ عماد کے سوا۔
اس کے ہاتھ لرزے اور فون چھوٹ کر نیچے بچھے غالیچے پر جا گرا۔
''محبت کرنا اور پھر منہ بند کر کے ہی چلے جانا کوئی عقلمندی نہیں۔ احساس دلانے کے لیے اظہار کا سہارا لینا کوئی بری بات نہیں۔''
آخری میسج کے الفاظ مذاق اڑا رہے تھے۔ اس کا بھی، اس کی محبت کا بھی اور اس کے رشتے کا بھی۔
''کیا نہیں دیا میں نے اسے اس گھر میں...... اور وہ......''
چائے کے کپ میں سے بھاپ اڑنا بند ہو چکی تھی اور وہ فضا میں کوئی نادیدہ حدت تلاش کرتا بکھرا ہوا تھا۔
''اور وہ کیا......''
وہ جواب میں بہت دیر کچھ نہیں بولا۔ یوں جیسے بڑی مشکل میں ہو۔
''وہ ایسی نکلے گی میں نے سوچا بھی نہیں تھا یار...... وہ کسی مرد کے ساتھ اس طرح پورا دن پوری رات...... اوہ میرے خدا!'' اس نے مٹھیوں میں بال جکڑ کر نوچ لیے۔
''ارے ارے ریلیکس...... بھئی دیکھو پہلی بات تو یہ...... کہ یہ سلسلہ کوئی آج کا نہیں تو اس کا مطلب غفلت تمہاری طرف سے برتی گئی۔ اور دوسری بات یہ کہ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ وہ کسی

غیر مرد سے باتیں کرتی ہے وہ کوئی لڑکی بھی تو ہو سکتی ہے۔اس کی کوئی فرینڈ۔''

''اس کی کوئی فرینڈ نہیں......''

''کوئی کزن......''

''کوئی کزن نہیں اس کی......''

''تو کیا پتا اس کی بہن......''

''نہیں یار......نہیں نا!......اس کے پاس اتنا وقت ہی کہاں تھا کہ وہ کسی سے کوئی بات کر پاتی......'' کچھ الفاظ بے اختیار نکلتے ہیں لیکن ہوتے بڑے بااختیار ہیں۔

وہ بھی اپنی بات کہہ کر خاموش ہوا پھر سامنے بیٹھی اپنی کولیگ کو دیکھا۔

''تم نے اسے اتنا بھی وقت نہیں دیا کہ وہ تم سے اپنے دل کی بات کر لیتی۔ پھر کسی اور سے کرنے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں اس کے پاس کوئی نہیں ہے جس سے وہ ،کبھی کہیں سکون سے بیٹھ کر دو گھڑی بات کر سکے۔

اپنے دل کی بات......جیسے تم مجھ سے کر رہے ہو......کسی سے اپنا دکھ کہہ سکے......کسی سے اپنی فیلنگز شیئر کر سکے۔ اگر تم نے اسے اتنا بھی Space نہیں دیا تو پھر عماد۔ مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ غلطی اس کی کم اور تمہاری زیادہ ہے۔''

عماد پر ایک لمبی چپ طاری تھی اور یہ لمبی چپ بڑی فیصلہ کن ہوتی ہے۔کبھی تو اس چپ کے بعد ہیرے موتی زبان سے جھڑتے ہیں......اور کبھی انسان کی اوقات......

'ہونہہ......ہونا آخر ایک عورت،تو عورت کی ہی سائیڈ لو گی۔''

سامنے موجود چہرے پر اطمینان کی وہی کیفیت رہی کوئی فرق نہیں پڑا۔

''افسوس ہوا تمہارے منہ سے ایسی بات سن کر......ان فیکٹ......یقین نہیں آیا کہ تم بول رہے ہو۔تو ٹھیک ہے میں بھی ایک عورت ہوں اس نے سر ہلایا۔''

''لیکن میں رانیہ سے بہت مختلف ہوں عماد اور میں تمہاری بیوی بھی نہیں اس لیے میں اپنی بات کو تمہارے سامنے ثابت ضرور کروں گی۔''

اس نے اپنے قیمتی ہینڈ بیگ سے موبائل نکالا۔

''رانیہ جس مرد سے باتیں کرتی ہے وہ کوئی اور نہیں ، میں ہوں ...... میں ...... تمہاری کولیگ......شرمین جاوید۔''

اس نے سیل فون کا ان باکس کھول کر عماد کے سامنے رکھا۔ جو اس وقت انسان کم اور بت زیادہ لگ رہا تھا اور وہ بھی پتھر کا بت۔''

''لو دیکھو......پڑھو......سمجھو اور جانو......کہ وہ کیسی ہے اور تم کیسے ہو۔

''وہ کیا سے کیا ہو گئی اور تم بس اپنے آپ کو ایک مجازی خدا سمجھتے رہے۔

اسے سجدے کی مانند اپنے چرنوں میں جھکے دیکھنے کی بہت عادت ہو گئی تھی نا،تمہیں مبارک ہو تمہیں جھکنا نہیں پڑے گا۔کیونکہ تم ٹوٹ گئے ہو اور منہ کے بل گرو گے۔''

ان باکس کھلا پڑا تھا۔رانیہ کا نمبر اور اس کے مسیج جھانک رہے تھے اور درحقیقت یہ مسیج نہیں ،کسی کی مسرتوں کا نوحہ اور کسی کے اجاڑ دل میں بین کرتا ماتم تھا۔

کتنا جھک جاتی ہے کتنا گر جاتی ہے ایک عورت کسی مرد کے دل میں اونچا ہونے کے لیے۔''

''میرے لیے تو ایک بوند ہی کافی ہے۔''

اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ آس پاس کے پرسکون ماحول میں شور بھرنے لگا۔
چیخیں آوازیں، منتیں اور ...... اور ...... گالیاں..........
''حرامزادی ...... یہ ...... یہ کرتوت ہیں تیرے۔ اس لیے زبان چلنے لگی تھی۔''
''نہیں ...... خدا کے لیے میری بات سنیں۔''
اس نے ٹھیک کہا تھا اس کی کوئی سننے والا نہیں تھا اور اس وقت تو بالکل نہیں ظالم اگر مظلوم کی سننے لگے تو مظلوم کہلائے ہی کیوں۔
''ایسا مت کریں عماد پلیز ٹھنڈے ہو جائیں سب سن رہے ہیں کیوں میرا تماشا بنا رہے ہیں کیوں۔''
''تماشا ...... میں نے بنایا ہے تماشا ...... میں نے ...... میں نے۔''
اس نے ایک سوال کئی دفعہ دہرایا اور ایک بار بھی جواب مانگنے کے بجائے اسے اذیت دی اسے تو ٹھیک سے یاد بھی نہیں آ رہا تھا کہ اس نے رانیہ پر ایک بار ہاتھ اٹھایا یا دو بار ...... اور پھر ...... شاید وہ تھک گیا یا شاید یہ رانیہ ہی ایک طرف لڑھک گئی۔

☆......☆......☆

ہاسپٹل اس کے سرد سفید اور نیم روشن کمرے میں موت کی آہٹ سنائی دیتی تھی اور زندگی دبک کر کسی کونے میں جا بیٹھی تھی۔
زرد آنکھوں پر دبیز پپوٹے ڈھکے ہوئے تھے ابھری ہوئی نسوں کے مدقوق ہاتھ کسی جوان عورت کے سنورنے والے نہیں بلکہ کسی عمر رسیدہ بڑھیا کے ہاتھ لگتے تھے جس کی عمر بھر کی کہانی اس کی رگوں میں ابھر آئی تھی۔
حالت خطرے سے باہر آنے تک اس کی اپنی حالت خطرناک ہو چلی تھی۔
''اگر اسے ہوش نہ آیا ...... اور میں کفارہ ادا کیے بغیر اکیلا رہ گیا۔ وہ مجھے معاف کیے بغیر ہی چلی گئی تو ...... میں تو شاید اتنی خاموشی سے جا بھی نہ سکوں ......''
کوئی خوف تھا جو اس کا رواں رواں کھڑا کر کے، روا رکھی گئی ہر زیادتی کی سزا یاد کروا رہا تھا۔
''کیا جرم تھا میرا ...... کوئی اس کے بند لبوں سے غراتا تھا۔
''محبت ......؟ ......؟ ......؟'' سوال کرتا تھا۔
''ہاں یہ میرا جرم تھا۔ اعتراف کرتا تھا۔
''میں نے وہ قیمتی متاع تم پر متائی جس کے تم قابل نہیں تھے۔ انکشاف کرتا تھا۔''
اور وہ بے تابی بے قراری سے اس پر جھک جاتا تھا۔
''رانیہ! پلیز آنکھیں کھولو رانیہ! پلیز ایک بار مجھے معاف کر دو میں ...... ازالہ کروں گا ...... میں تلافی کر دوں گا ...... اپنی ہر غلطی کی اپنی ہر خطا کی ......''
کبھی کبھی معافیاں تلافیاں، تاخیر کے سبب اپنا پتا کھو دیتی ہیں لیکن شکر ہے کہ ایسا ہوا نہیں اور رانیہ نے آنکھیں کھول دیں۔
کوئی بے حد قریب بیٹھا رو رہا تھا۔
وہ اس دھندلے منظر پر بھی یقین نہ کرتی مگر اپنے کانوں سے سن نہ لیتی تو ......

☆......☆......☆

جو بستر کی چادر پر شکن تک برداشت نہیں کرتا وہ بھلا عزت کی چادر پر کیسے ......''
حواس کھونے سے پہلے وہ آخری سوچ تھی جو شعور کے آئینے میں دکھائی دی تھی اس کے بعد متحرک لاشعور سے مناظر، وہموں خوشیوں اور

بھیانک خوابوں کا چہرہ اوڑھ کر اسے ڈراتے رہے تھے۔
کبھی کوئی منظر جاگتا کہ آگ کی لپیٹیں لمبی زبانیں کھولے اس کی طرف لپکتی ہیں کبھی احساس ہوتا کہ کن من بوندیں برستی ہیں اور اچانک سیلاب کی مانند بڑی ساری اس کا تنکے سا وجود اپنے ساتھ بہائے لے جارہی ہیں۔
پھراس نے مٹی کے پتلے دیکھے جن کے سپاٹ چہروں پر صرف زبانیں لگی تھیں اور لٹک کر سینے تک باہر آرہی تھیں۔ ایک روز آندھی آئی اور اسے اڑا کر دور بہت دور کہیں ویران سنسان گھنے جنگل میں پہنچ گئیں اب کوئی راستہ تھا نہ کوئی منزل بس وہ یہاں سے وہاں زخمی پیر، چھلے ہوئی ہتھیلیاں، کھرچی کلائیاں لے کر بھاگتی پھرتی تھی۔
اور کوئی آواز دور...... بہت دور سے اسے پکارتی تھی۔۔
''رانیہ......! رانیہ......!''
وہ اس آواز کے ماخذ کو پہچان رہی تھی اس تک پہنچنا چاہتی تھی لیکن جنگلی پودے ایکا ایکی اژدھوں کا روپ دھار لیتے۔ سرپٹ دوڑنے میں سے اس کے پیروں سے لپٹ کر اسے منہ کے بل گرا دیتے اور بظاہر خاموش لیٹے اس کے وجود کے اندر سر پٹختی بے چینی اس کی رگڑتی ایڑھیوں سے عیاں ہوجاتی۔
بالآخر اس کے وجود کے بے چینیوں، اور اضطراب کو کنارہ ملا تو اُس نے آنکھیں کھولیں اور نزدیک بیٹھے عماد کو دیکھ کر دوبارہ بند کرلیں۔
زندگی میں پہلی بار اس کا دل چاہا کہ یہاں عماد کے بجائے اس کی ماں ہوتی۔
''امی......امی......!'' سوکھے سفید پپڑیوں بھرے لبوں پر ماں کی پکار جاگی لیکن ہر بار کی طرح یہ خواہش بھی تشنہ ہی رہی۔
''رانیہ! ادھر دیکھو میری طرف...... میں ہوں عماد......صرف تمہارا عماد......''
''عماد......''
اس نے رُخ پھیرا...... وہ خوبصورت چہرہ جس نے اس کے خوابوں کی دنیا میں سب سے پہلے رسائی پائی تھی، مسخ ہو چکا تھا شک وشبہہ کے تیزاب نے اس کے تیکھے نقوش کو بگاڑ دیا تھا۔ اس کی اجلی سفید رنگت کو سیاہ کر ڈالا تھا۔
اب وہاں اس کا محبوب نہیں کوئی، غاصب عفریت کھڑا تھا۔
''نہیں......نہیں......میرا تو......میرا تو کوئی نہیں، کوئی نہیں میرا......''
اس نے بے چینی سے سر کو دائیں بائیں پٹخا اور یہ چوٹ زندگی میں پہلی بار عماد کو اپنے دل پر پڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔
''رانیہ......! معاف کردو رانیہ میں ہی غفلت کا شکار تھا میری غلطی ہے آئندہ نہیں ہوگی جیسے تم میری ہو، ویسے میں بھی تمہارا ہوں، صرف تمہارا۔''
لیکن بستر پر پڑا بیمار لاغر وجود بے خبر ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

اس کا کمزور ہاتھ، عماد کے مضبوط ہاتھوں کے درمیان دبا اپنی قسمت پر نازاں ہونے کے بجائے نادم تھا۔
'' جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ جان! ہمارا گھر تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔''
وہ پتھرائی نگاہوں اور جامد چہرے سے چھت کی کڑیاں گنتی رہی۔

"میرا کمرہ بالکل سونا ہے تمہارے بغیر، تمہاری محبت کے بغیر...... میرے دل کی طرح۔"

اس کے نیم مردہ وجود میں حرکت جاگی۔ ڈبڈباتی آنکھوں میں پہچان کے رنگ جاگے۔

"میری محبت......؟ اس کے حیران لہجے کا چڑھاؤ بڑا انجانا تھا۔

"ہاں رانیہ...... تمہاری محبت، جس نے میرے دل میں چھپی ہوئی میری محبت کو زندہ کیا، اسے باہر نکالا۔"

رانیہ نے خشک گلا تھوک نگل کر تر کرنے کی ناکام کوشش کی اس کی گردن کے پٹھوں میں کھچاؤ پیدا ہوا بہت طاقت صرف کر کے بولی۔"

"میری محبت نے آپ کے دل میں چھپی محبت کو نہیں...... آپ کے اندر چھپے حیوان کو نکال کر باہر پٹخ ڈالا...... عماد...... اور اس حیوان نے باہر نکلتے ہی میری......"

اس کا سانس پھول گیا۔ وہ بے طرح ہانپ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈے، آواز بھرائی۔

"میری محبت کو زندہ نگل لیا۔" آنکھوں کی منڈیر پر ٹھہرا پانی بہہ نکلا۔

"سالم...... اسے ہاتھ پیر چلانے...... احتجاج کرنے، اپنے بچاؤ کے لیے چلانے تک کا موقع نہیں دیا عماد...... میں مرگئی اور میری محبت بھی۔"

اس نے عماد کی گرفت میں تنگ پڑتا ہاتھ کھینچا تو وہ عماد کی پسینہ پسینہ ہوتی ہتھیلیوں کے بیچ بھیگ چکا تھا۔

"میں اب کسی سے محبت نہیں کرتی...... کسی سے بھی نہیں۔"

اس کی آواز مضبوط ہو چکی تھی لہجہ سمٹ چکا تھا اور سارا (......) بھی۔

وہ جھکے سر اور ڈھلکے ہوئے شانوں کے ساتھ باہر نکلا تو شرمین جاوید کاریڈور میں ہی مل گئی اس کے سراپے سے مریض کے کمرے میں بیتنے والی کتھا بھانپ کر خود بخود اس کے برابر چلتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔

"کہا اس نے مجھے تب واقعی تم سے محبت تھی۔
کہا میں نے مجھے تو آج بھی تم سے محبت ہے،
وہ تب کی بات کرتی ہے، میں اب کی بات کرتا ہوں۔
مگر جو فاصلہ اب اور تب کے درمیان ہے،
ہم دونوں سے مل کر بھی سمٹا نہیں جاسکتا،
وہ اب تک آ نہیں سکتی
میں تب کو پا نہیں سکتا۔"

☆......☆......☆

ایک بے شکن چادر کی خواہش نے، کسی کی زندگی سلوٹوں سے بھر دی۔ کسی کی محبت کو آلودہ کر دیا۔ اس کی شفافیت داغدار کر دی اور اس کے دل کے کاغذ پر، جہاں محبوب کا نام، سب کچھ سہہ کر بھی سبز اسا چمکتا تھا۔ اب وہ کاغذ شکن زدہ ہو چکا تھا۔

اور کاغذ...... اس اعتبار کی طرح ہوتا ہے جس پر ایک بار سلوٹیں پڑ جائیں تو اسے دوبارہ کبھی سیدھا نہیں کیا جاسکتا۔

اور ہاسپٹل کے کمرے میں بیڈ پر بے حس و حرکت پڑی رانیہ کا ذہن متحرک تھا۔

میرا وجود پژمردہ ہے، میرے اعصاب پراگندہ......
میرا دل شکست خوردہ ہے، میری محبت شکن زدہ......

☆......☆......☆

زندہ دفن کی گئی

دوشیزہ کی بے مثال رائٹر کے جادوئی قلم سے
پڑھنے والوں کے لیے خوبصورت تحریر

اسے کیا ہوا؟ یہ تو اچھی خاصی دلکش لڑکی تھی۔
ویمن ڈے کی تقریب میں وہ مجھ سے آ کر ملی تو میں حیران رہ گئی۔ پہچان تو لیا کہ ہماری سابقہ اسٹوڈنٹ تھی یہی کوئی سات آٹھ سال پہلے کالج کی تقاریب کی روح رواں ہوا کرتی تھی۔ آج کل تو سال اتنی جلدی گزرتے ہیں کہ پرانے ہی نہیں لگتے۔''

یہ لڑکی ثانیہ ملک، سلم اسمارٹ کجراری آنکھیں اور پونی میں بندھے گھنے بال اس کی پہچان تھے اور اب جو ثانیہ ملک میرے سامنے ٹھہری ہے وہ مرجھائے چہرے والی پھیکی جسامت کی موٹی عورت ہے اس کی گود میں ڈیڑھ سال کی بچی ہے۔

اپنی شاگرد کا یوں ادھیڑ عمر لگنا ہم ٹیچر کو نادم کرتا ہے ایسے میں کہیں نہ کہیں سے، ٹیچرز خود کو Maintain رکھتی ہیں، ضرور سننا پڑتا ہے میں نے اپنا دفاع پہلے ہی کر لیا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں لڑکی...... کتنے بچے پیدا کر لیے؟''

''یہی ایک اس کا مختصر سا جواب۔

''پھر یہ کیا حال کر لیا؟ گھر بیٹھی رہتی ہو؟ میں نے تو سنا تھا نرسنگ اسکول ایڈمیشن لیا تھا تم نے۔'' میری بات سن کر ثانیہ ملک نے اپنے سامنے ٹھہری متناسب متوازن جسم والی اسٹائلش لباس والی میئم (یعنی مجھ) پر نگاہ ڈالی پھر بے نیازی سے کہا۔

''کیا فرق پڑتا ہے میئم ......اس کا خیال رکھتی ہوں......رکھوں گی۔

اس نے اپنی بچی کو تھپکا۔ بچی پیاری بھی تھی اور اس کا لباس بھی برانڈڈ لگ رہا تھا یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے عورت خود کو ختم کر کے اگلی نسل تیار کر دیتی ہے اور اپنے خواب بچی کو منتقل کر دیتی ہے۔

آس پاس ٹھہری ٹیچرز کی ترحم انگیز نگاہیں دیکھ کر وہ بے فکری سے ہنسی...... بولی۔

''آج کے ویمن ڈے کا انتساب مردہ عورت کی زندہ تصویر کے نام کر دیجیے۔''

"کیوں ثانیہ؟ کیوں بچے؟"

میرے سوال میں دکھ تھا اس کا جواب ایک کہانی تھا۔ ہمارے معاشرے کی عام کہانی اگر اس کو کسی پر بیتا دیکھا جائے اور بہت خاص کہانی اگر خود پر بیتے۔

"چار کمروں، ایک برآمدہ اور کچے وڑے والے ہمارے گھر میں ہر طرف بڑھتی ہوئی چھ بیٹیاں دکھائی دیتی تھیں ہر کمرے میں دو چار بیٹھی مل جاتیں چوہے سا ایک بھائی تو ان میں نظر ہی نہ آتا تھا۔ ان بیٹیوں پر باری باری وارد ہونے والی جوانی سے خائف ماں بیماری میں لاشعوری پناہ لیے رکھتی۔ اس لیے بھی کہ اب اسے کام کاج خود کرنے کی حاجت نہ تھی۔ اس کو ماتھے پر پٹی باندھ کر سوئے رہنے میں سہولت حاصل ہوگئی تھی۔

بیٹیوں کا سنجیدہ رنجیدہ باپ ہمہ وقت بیرونی فرائض انجام دہی میں منہمک رہتا۔ اس کا گھر سے واجبی تعلق تھا اور بیٹیوں سے یہ تعلق بھی واجبی تر تھا ایسے میں بیٹی نمبر ایک کی سادگی سے ہونے والی شادی بھی زیادہ عرصہ خوشی نہ دے سکی۔

وہ ذہنی مریض خاوند کا بدترین ظلم سہہ کر بدترین سماجی فیصلہ لے کر مزید بدترین کے لیے ماں باپ کے گھر لوٹ آئی۔ بیچاری آپی کے پاس کوئی اور راستہ ہوتا تو ہرگز یہ دہلیز نہ الانگتی مگر وہ کہاں جاتی، دم مسوس کر یہی آپڑی۔

یہاں اس پر پانچ چھوٹی بہنوں کا مستقبل خطرے پر لگانے کی سخت فرد جرم عائد ہوئی۔ اس نے چند مہینے سر جھکائے، منہ چھپائے، کھانے پینے کے کم سے کم حصے پر گزارہ کر کے بتائے پھر ایک پرائیویٹ اسکول میں سات ہزار ماہانہ کی ہفت اقلیم حاصل کرلی گئی۔

وہ اب باقاعدگی سے ابا کو اپنی روٹی یعنی میس Mess کے پیسے دینے لگی۔ ابا بھی غریب

تھے کیا کرتے۔ اس کے نصیب پر آہ بھر کر میرے بارے (ثانیہ کے بارے) میں سوچنے لگے کہ دوسرے نمبر والی میں تھی۔

میں نے جلد ہی کافی قد کاٹھ نکال لیا تھا۔ رنگت صاف تھی بے فکری کے گلاب گالوں پر کھلتے تھے آئینہ دیکھ کر اونچے خواب دیکھا کرتی۔ مجھے اپنی دوسری بہنوں کی طرح دولت سے آراستہ پیراستہ گھروں کی بجائے مہذب لہجوں والے اعلیٰ تعلیم یافتہ نرم خو انسان اچھے لگتے تھے اور ایسا ہی خواب میرا شریک سفر کے متعلق تھا۔

مگر بدقسمتی سے کالج آتے جاتے ایک زمیندار کا فارغ پتر میرے پیچھے لگ گیا وہ گاڑی میں میرا کالج تک پیچھا کرتا...... ہم کالج بس سے اترتے تو اس کی گاڑی گیٹ کے مدمقابل سائیڈ پر موجود ہوتی۔ کچھ ہی دنوں میں میری قریبی سہیلیوں نے بھی اس بات کا نوٹس لے لیا۔

گاڑی کے پچھلے شیشے پر اس نے اپنا نام بھی جلی حروف میں لکھوایا ہوا تھا۔ ''اللہ بخش چوہدری'' ہم لوگ اسے ABC کہنے لگیں۔ محبت کے مارے والدین اپنی اولاد کے کیسے کیسے غیر ترقی یافتہ نام رکھ دیتے ہیں خیر وہ خود بھی کچھ کم غیر ترقی یافتہ نہ تھا گاڑی سے باہر نکل کر اپنے تئیں ہیرو بن کر گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو جاتا۔ تیل سے بال اور ماتھا چمکائے، بغیر استری واش اینڈ ویئر جوڑا اور پاؤں میں سونٹی چپل اس میں کچھ بھی پسند کیے جانے کے قابل نہیں تھا اجڈ گنوار پینڈو...... مگر وہ پینڈو اتنا تیز نکلا کہ اپنے بڑی پگ والے باپ کے ہمراہ ہماری کچی گلی کی نالیاں پھلانگتا تشریف لے آیا۔

نوکر نے سر پر آم کی دو پیٹیاں اٹھا رکھی تھیں۔ ان کی چمکتی گاڑی گلی کے نکڑ پر ٹھہری ہمارے بوریا والے دروازے کی شان بڑھا رہی تھی۔ چوہدری اللہ یار اپنے پتر اپنے وارث اللہ بخش چوہدری کا رشتہ لے کر آیا تھا۔ اس کو پتر کی محبت مجبور کر کے لائی تھی۔

چوہدرائن ساتھ تھی اور میری ماں کو وہ جگہ نہ ملتی تھی جہاں چوہدرائن کو بٹھائے۔ موٹی تازی سانولی عورت جس کے دونوں ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں اور انگوٹھیاں تھیں۔ جس کی نظروں میں غرور و تکبر تھا تاہم ہماری ڈھول مٹی غریبی مسکینی سے صرف نظر کر کے جب اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا تو میرا دل ڈھ گیا۔

مجھے یقین ہو گیا کہ میرا کھونٹا ڈھونڈ لیا گیا ہے میں کمرے میں جا کر رونے لگی۔ وہ عورت خود بتا رہی تھی کہ ہمارے ہاں نسلوں سے کسی نے اسکول کا منہ نہیں دیکھا مرد تک ناخواندہ تھے عورتوں کی پڑھائی کا کیا سوال تھا۔ وہ یہ باتیں تھیں جو مجھے برداشت نہیں ہو پا رہی تھیں مگر میرے سوا سب مطمئن تھے۔

ایک ایک آم کو ترسنے والی چھوٹی بہنیں آموں کی دو پیٹیوں پر للچا رہی تھیں بڑی آپی مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ اکلوتا بھائی کھیل رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ اللہ بخش کے پاؤں کالے سیاہ نہیں اس کے ناخن گندے ہیں مگر آپی پوچھتی تھی کہ میں ٹسوے کیوں بہا رہی ہوں میں آنسو پونچھ کر پھٹ پڑی۔

'' کیا لڑکی بکری گائے بھینس ہے جسے چارے کے ڈھیر پر چھوڑا جاتا ہے؟ کیا ہماری کوئی خواہش کوئی جذبات نہیں ہوتے۔ آپی تمہیں تمہاری مرضی پوچھے بغیر جمیل کی تین ہزار ماہانہ تنخواہ سن کر ہانک دیا گیا۔ تین ہزار میں اس کے گھرانہ کے تیرہ بندے حصہ دار رہتے اور وہ نفسیاتی مریض تھا نتیجہ کیا نکلا......؟

رانیہ ہانیہ! تم بھی اتنی چھوٹی نہیں ہو کہ میری

بات نہ سمجھ سکو۔ تم نے چوہدری کے بیٹے کو جا کر دیکھا ہے؟ ہاں اسے دیکھ کر آئی ہو، اسے بولتا سن کے آئی ہوں۔ ہر بات میں دو دفعہ "مطبل ہے، مقصد ہے کہتا ہے ہنستا ہے تو بدنما دانت نکل آتے ہیں یہ چھوٹی بہن اس کے پاس ٹھہری ہے تو کہتی ہے مجھے چمیلی کی بدبو آئی تھی تیل کے چپڑے سر پر ہاتھ پھر کر انگلی کان اور ناک میں گھماتا ہے۔

یہ سب کچھ مجھے بتا کر ہنس ہنسا کر تم مطمئن ہو کہ میں اس سے شادی کرلوں؟ میرا دل کرتا ہے کہ میں نیند کی گولیاں کھا کر سو جاؤں، سو کر اٹھوں تو یہ سب خواب ہو، شادی جیسا بندھن جس میں ایک دو جھے کے قریب رہنا ہوتا ہے۔ دل مل کے کھانا پینا ہوتا ہے وہ ایسے بندے کے ساتھ؟؟ میں نے اسے ملازم نہیں رکھنا آپی خاوند بنانا ہے...... مجھے دیسی گھی، انڈے، دودھ آم کھجور پر بک جانا چاہیے؟"

ہم جب آئینہ دیکھتی ہیں تو ہم سب لڑکیاں سوچتی ہیں وہ کون خوبان ہوگا جس کا ہم نصیب بنیں گی۔ میں بی ایس سی میں پڑھ رہی ہوں مجھے Manners کا پتا ہے میں ایک سوچ رکھتی ہوں غریب سہی مگر تعلیمی ماحول ہوتا...... غربت تو یہاں بھی ہے مگر کیا ہم اسی طرح گندے، میلے اور میلے پن پر اتر کر جینے والے ہیں؟ مجھے میرے ارمانوں سمیت زندہ گاڑ دو...... میں اللہ سے کہتی ہوں ارے ہمارے خالق ہم جیسی بیٹیوں سے بھی روز محشر پوچھ...... پوچھ اے زندہ دفن کی گئی تجھے کس گناہ کی پاداش میں گاڑا گیا......!!"

میں بلک بلک کر رو رہی تھی۔ آپی نے مجھے گلے سے لگا لیا ہم دونوں بلکہ دوسری دونوں تادیر روتی رہیں، آنسو بہا چکنے کے بعد رانیہ بولی۔

"میں امی سے بات کروں گی۔"

"امی تمہاری کیا سنیں گی میں بات کروں گی، آپی نے کہا۔

"نہیں آپی...... تمہیں تو تمہاری مثال دے کر وہ چپ کروا دیں گی۔ میں بات کر سکتی ہوں میں کروں گی۔"

چوتھے نمبر والی ہانیہ بولی۔ مگر ہونا وہی تھا جوابا کریں گے۔ حاکم بننے کے لیے جاگیردار امیر کبیر ہونا ضروری نہیں، کنگلے غریب باپ بھی حاکم ہوتے ہیں۔ امیر غیرت کے نام پر حکم چلاتا ہے غریب بس کسی کے نام پر سودا کرتا ہے۔"

سترہ سالہ لڑکی کتنا تلخ سچ بول گئی تھی۔

میرے اندر امید کا ننھا سا دیا ٹمٹمانے لگا۔

رات کو رانیہ ہانیہ اور آپی امی کے پاس جا بیٹھیں۔ ابا عشاء کی نماز پڑھنے گئے تھے۔ امی کو ویسے بھی ہم سب کی صورتوں سے اور خصوصاً میری رورو کر سوجھی آنکھوں کو دیکھ کر اندازہ تھا کہ ہمیں یہ رشتہ پسند نہیں آیا ہے مگر وہ خاموشی سے کام چلا رہی تھیں بیٹیوں کے دلائل سن کر بولیں۔

"چار مربعوں کا مالک ہے۔ عزت سے منت سے لے کر جا رہا ہے، چوہدری کی گاڑی الگ ہے اللہ بخش کو الگ دلوا رہا ہے۔ جوان ہے مالدار ہے صحت مند ہے۔ صرف جاہل ہے تو کیا ہوا، ہم سے غلطی ہوگئی کہ تمہیں تعلیم دلوا دی۔ آج منہ لگانے آگئی ہو۔ تم خود تو عمر بھر کو بیٹھی ہو ان کو بٹھاتی جاؤں؟

ہمارے جیسوں کے گھروں میں رشتے آتے کب ہیں بجائے شکر ادا کرنے کے رونا دھونا مچا دیا ہے جاہل ہے اخبار نہیں پڑھ سکے گا تو کون سی قیامت آجائے گی۔ دو چار لفظ انگریزی بولے ثانیہ سکھا دے گی...... جو میری بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ تمہارے بوڑھے باپ کو کیا سمجھاؤں۔

آپی تو بالکل ہی لاجواب ہوگئی۔

''آج باپ بوڑھا بھی ہوگیا...... ان کے بے بسی کی رنگ آمیزی کے لیے۔'' رانیہ طنزاً بولی۔

''تم اتنی اتنی ہو کہ ماں سے بحث کرنے آ بیٹھی ہو کل کو جانے کیا کل پرزے نکالو گی۔''

''ثانیہ باجی کو پسند نہیں ہے وہ۔'' ہانیہ نے کہا۔

''شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے انجان لڑکے نیک لڑکیوں کو پسند نہیں آگئے ہوتے تو نکاح کا رشتہ جڑتا ہے تو دلوں میں اللہ محبت ڈال دیتا ہے۔''

میں یہ سب سن رہی تھی میری بہنیں لاجواب اور چپ سی ہوگئی تھیں۔ میرے سامنے ٹی وی پر کوئی ڈرامے کا منظر چل رہا تھا۔ اجلی سڑکیں...... پیاری لڑکی اور اس کے چاہنے والا کتنا پیارا، سنورا ہوا...... بس ایک دم دل میں گرم سلاخ اتر گئی۔ میں بھاگتی ہوئی صحن میں گئی جہاں امی کی دربار میں تین خاموش مجرم ٹھہری تھیں میں نے روتے ہوئے کہا۔

''امی...... مجھے اللہ بخش پسند نہیں ہے...... امی مجھے جہنم میں نہ دھکیلو...... امی میں تمہارے سامنے بول سکتی ہوں...... ابا مجھے جہنم میں پھینک دے گا میں نہ بول سکوں گی۔'' میں کیا روئی بہنوں نے رونے کی بازی لے لی۔ امی چارپائی سے اتر کر ہمارے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئیں۔

''اللہ کے واسطے ہم پر رحم کرو۔ ہم بہت غریب بے کس ماں باپ ہیں ہمیں چھ بیٹیوں کے فرائض ادا کرنے ہیں میں تمہاری دشمن نہیں ہوں ثانیہ...... جب میں بیاہ کر آئی تھی مجھے بھی تمہارے ابا کی صورت سے گھبراہٹ ہوتی تھی یہ سوچیں لڑکیوں کو زیب نہیں دیتیں۔ شرفاء کی بیٹیاں ایسے نہیں کرتیں زندگی میں ہر چیز من چاہی نہیں ملتی۔ صبر کیا جاتا ہے۔

دولت ہے تو صورت مجرم ہے۔ تم نے دیکھا نہیں دنیا کے ہر مسئلے کا حل پیسہ ہے میں اس طرح چھان بین غور فکر کرتی رہی اس طرح بچوں کی باتیں سنتی رہی تو ساری کنواری بیٹھی رہیں گی۔ میں اس دنیا سے گزر جاؤں گی۔ میں دردشقیقہ کی مریضہ ہوں میں جوڑوں کی مریضہ ہوں۔ تمہارا باپ شوگر کا مریض ہے وہ چند سالوں تک ریٹائیر ہوجائے گا پھر یہ گھر کیسے چلے گا کسی نے سوچا ہے؟

ہم اپنے بار ہلکے کرنا چاہتے ہیں ہم پر رحم کرو۔ اف خدایا میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے۔''

امی کا رنگ لال ہو رہا تھا اور وہ سر پکڑ کر چارپائی پر بیٹھیں تو آپی لپک کر ان کا سر دبانے لگی اور رانیہ پانی لینے چلی گئی۔ میں سر جھکائے کمرے میں آگئی۔

بس ہو چکا مقابلہ...... چند دن بعد میرا نکاح کر دیا گیا۔ ہاں یہ علمائے حق کا مسئلہ ہے کہ وہ سوچیں یہ نکاح جائز تھا یا باطل......؟

نکاح کے بعد مجھے کچھ مہلت مل گئی۔ اس لیے کہ میرے خاوند کی بڑی دو بہنوں کی شادی پہلے سے ہوئی تھی۔ میں نے بی ایس سی چھوڑ کر نرسنگ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ میرا جی چاہتا تھا میں زخموں کو مرہم رکھنے والی بن جاؤں۔ سفید یونیفارم کی دنیا میں آکر میری روح کو سکون ملا۔ آزادی کا احساس ہوا۔ مجھے پروفیشنل ہونا اچھا لگتا تھا۔

میں ہمیشہ سے پر اعتماد اور ذہین طالبہ رہی تھی۔ مجھے عورت کا بااعتماد زندگی بسر کرنا خود کو مکمل انسان سمجھنا جیون ساتھی کو دوست سمجھ کر جینا اچھا لگتا تھا۔ کہتے ہیں کہ نرس لڑکیاں ڈاکٹروں سے شادی کرنے کی آرزومند رہتی ہیں۔ میں تو نکاح

شدہ تھی اور ویسے بھی اپنے ماحول کی وجہ سے احساس کمتری محسوس کرتی تھی مگر اسے کہتے ہیں بد نصیبی کہ مجھے ایک ہاؤس جابر ڈاکٹر پسند کرنے لگا۔ اسے کہتے ہیں قسمت کا مذاق، اسے کہتے ہیں ...... آزمائش ......''

ڈاکٹر نبیل ڈیسنٹ شخصیت کا مالک تھا۔ وہ خوشحال اعلیٰ تعلیم یافتہ پس منظر رکھتا تھا۔ اس کی ماں پروفیسر تھیں۔ گویا آنکھیں بند کروں تو قدرت نے مجھے میری جنت میں پہنچادے۔

آنکھیں ہی تو بند نہ تھیں۔ مجھے اپنی اوقات معلوم تھی۔

نالیوں والی کچی گلی، بوریا والا دروازہ، غیر ہموار صحن، نلکا چلا کر کپڑے کوٹتی بہنیں، چنوں کی ایک تھالی پر نو لوگوں کا ناشتہ، بڑی کی اترن ترتیب وار چھوٹیوں کا لباس، غریب سخت گیر باپ مجھ پر تو اے بی سی کا احسان تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب کا احسان کہاں اٹھا سکتی تھی۔

میں بے نکاحی بھی ہوتی تو خواب کے پر جلتے ...... مگر نہیں ...... میں شاید غلط کہہ رہی ہوں خواب کے پروں کو کوئی آگ نہیں جلا سکتی۔

ڈاکٹر نبیل کا متبسم لہجہ، پرشوق نگاہیں اور خصوصی توجہ آپ ایک اظہار تھا۔ مگر میں دانستہ نظر انداز کرتی رہتی، یوں ظاہر کرتی کہ یہ ان کا اخلاق ہے مجھے ہر لمحہ ازبر تھا کہ وہ میرا نصیب نہیں ہوسکتا ہے۔

مگر کوئی میرے اندر کی آواز سے پوچھے ایک طرف مہذب باشعور آئیڈیل ڈاکٹر نبیل تھا، روشن خوبصورت دل نشین زندگی تھی دوسری طرف جاہل ڈنگر جیسا میرا خاوند تھا جسے میسج لکھنا نہ آتا تھا وہ وقت بے وقت فون کرتا رہتا۔ اسے سمجھ نہ آتی کہ کلاس میں ہونا یا مصروف ہونا کیا ہوتا ہے۔ وہ کہتا تمہارے خاوند کا فون ہے تم کہہ دو۔

اسے لگتا میں بہانے بنا رہی ہوں ...... اسے لگتا میں ناراض ہوں تو منہ اٹھائے مجھے منانے آجاتا۔ اس سے ملنے کا تصور بھی ناگوار تھا۔ جس بندے کو یہ تمیز نہیں تھی کہ ملنے آرہا ہے تو سلیقے کے کپڑے پہن لے منہ دھو دانت صاف کرلے، کبھی مونچھیں بے اندازہ بڑھی ہوئی کبھی قمیض کے کھلے بٹن سے جھانکتا میلا کچیلا بنیان، قمیض ستھری تو چہرہ بے دھلا، اور ہاتھ پکڑ کر کہتا۔ ''چھڈ پڑھائی نکاح ہوا ہے ہمارا۔'' کبھی گال چھوتا کبھی ہتھیلی میں نوٹ تھما کر کہتا میری طرف سے سرخی لے لینا۔''

ڈاکٹر نبیل نے ایک شام راہداری میں مجھے پکارا...... وہ شام سہانی ہوگئی۔

''ثانیہ سنو۔''

ایسا ریشم لہجہ دل جھوم سا گیا...... مگر دوسرے ہی پل پروفیشنل ہوکر بولی۔

''جی ...... ڈاکٹر صاحب۔''

''مجھے کچھ کہنا ہے ...... وہ میرے سامنے آکر رک گئے۔ اسے زبان سے کہنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بولتی تھی۔ میں تو ان چمکتی جھیلوں میں ڈوب گئی۔ ڈوب جانے والی تھی کہ میرے ہاتھوں میں تھمے موبائل کی تھرتھراہٹ سے مجھے چونکا دیا۔

موبائل پر اس راکشس کی چاپ تھی جس کے ہونے سے شہزادہ بونا ہو کر غائب ہوگیا۔ میں نے موبائل پر نظر ڈال کر بولی تو سانسوں میں بادموسم خارج ہوئی۔

''میرے شوہر کی کال آرہی ہے......؟''

''واٹ؟ شوہر...... Are you in senses۔''

''جی ...... منکوحہ ہوں......'' دو لفظ تھے کالے ناگ تھے جو چاہت کو ڈس گئے شام اندھیر ہوگئی۔

بس کھو دیا میں نے اسے...... دوسرے مہینے ہی خبر سن لی۔ ڈاکٹر نبیل نے ڈاکٹر ماریہ سے شادی کر لی...... اس دن میرے اندر ماتم کی بازگشت گونجتی رہی تھی۔ سارا ہسپتال سائیں سائیں کرتا لگتا، اندر ٹوٹ گیا تھا میرا، میری کہانی احساسات کی کہانی ہے نہ سمجھو تو کچھ بھی نہیں۔

دنیا والے کہتے ہیں مجھے سمجھوتہ کر لینا چاہیے سمجھوتے کے لیے کچھ نہ کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ میں نے سمجھوتہ ہی کیا سب کچھ چھوڑ دیا۔ اپنا محبوب، اپنے خواب، خود اپنا آپ چھوڑ دیا۔ ابا ٹریننگ دلوانے پر تو اس لیے راضی ہوئے تھے کہ اگر بڑی والی کی کہانی میں دہراؤں تو روٹی کا بندوبست ہو۔ انہیں شاید معلوم نہ تھا کہ بڑی والی واپس اس لیے آئی تھی کہ اس نے خود کو زندہ رکھا تھا خود کو بچا لیا تھا۔ میں نے خود کو زندہ ہی نہ رکھا۔

شادی کی ڈھولکی رکھ دی گئی۔ محلہ بھر میں میری خوش نصیبی کی شہ سرخیاں تھیں۔ مبارکیں، حیرتیں، رشک بھری نگاہیں کب کسی نے دیکھی اشک بھری نگاہیں؟؟ میرے ابا توفیق سے بڑھ کر استقبال بارات کر رہے تھے۔ میں ابا کی نیاز مند ہونا چاہتی تھی مگر خود کو تلاش کر رہی تھی۔ ہار سنگھار کپڑے لتے طرح طرح آوازیں ثانیہ ملک کہیں کھو گئی تھی۔

مہندی کی رات تھی پیلے پھولوں کے گجرے باندھے ہرے سوٹ میں مہندی کی دلہن آئینہ کے سامنے کھڑی تھی۔ کمرہ بند تھا۔ موبائل میں نے تین دن سے آف کر کے الماری میں رکھ دیا تھا۔ مجھے کسی کی آواز کی انتظار نہ تھی۔

میں نے ہاتھ جوڑ کر مہندی کی دلہن سے کہا۔ "پیاری ثانیہ تم مرجاؤ۔ پلیز تم مر جاؤ۔ دلہن کو چھوڑ دو...... یہ جیتی رہے۔ تم چپکے سے چپ چاپ ہمیشہ کے لیے مرجاؤ۔ نہ کوئی ثانی نہ کوئی رانی نہ کوئی کالج تھا نہ کوئی ڈاکٹر نبیل تھا۔ شور شرابہ نہ ڈالو...... خدا کے واسطے مرجاؤ...... مردے رویا نہیں کرتے تم اپنے بدن سے نکل چکی ہو۔ اس میں کتنا سکون ہے۔ یہ بدن تمہارا نہیں ہے۔ تم تو تم ہو...... الگ سے اپنی آپ...... اب اس بدن کو مردہ خور نوچے کھسوٹے...... اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم تو بچ گئی ہو اس لیے ماردی گئی ہو...... زندہ گاڑ دی گئی ہو۔ تمہارے باپ نے تم پر کدالیں بھر بھر کر مٹی ڈال دی...... خبردار باپ کو تنگ نہ کرو۔ آواز نہ دو...... آواز اونچی نہ کرو...... اطاعت کرو...... ہاں یوں ہی...... بس مرگئی ثانیہ آئینہ میں کھڑی دلہن کے گالوں پر آنسوؤں کی لہریں تھیں۔

جنازہ تو بہت دھوم سے نکلا تھا۔ بینڈ باجے پٹاخے تھے۔ اب مجھے ہرگز غرض نہ تھی۔ دولہا آرہا ہے کیسا لگ رہا ہے۔ برا تو نہیں لگ رہا۔ عورتیں کہتی دلہن کا چہرہ سپاٹ ہے۔ سپاٹ بے حس بے تاثر تابعدار دلہن رخصت ہوگئی۔

ایسی تابعداری جیسے کپڑے کی گڈی...... تابعداری جو اس کی خوشی بنی۔ پھر چیخ بنی پھر بے زاری بنی...... میرے پاس تو کھونے کے لیے اب کچھ نہ تھا۔ مجھے فرق نہیں پڑتا تھا میرا حسن نہ رہے۔ جسم پھیل جائے بھدا موٹا ہو جائے۔ داغ دھبے چھائیاں پڑ جائیں۔ بخدا مجھے فرق نہیں پڑتا۔ مرنے والی کو ماں باپ بہنیں دعائیں دیتی ہیں۔

بس ایک تمنا ہے۔

مجھ سے بھی رحمت سوال کرے...... اے زندہ گاڑھ دی گئی۔ تجھے کس پاداش میں مار ڈالا گیا۔ میرا رب تسلیم کرے کہ ہاں مجھے زندہ دفن کیا گیا۔ میں اس کی تسلیم پہ راضی۔

☆☆......☆☆

شیشے کا محل

لڑکی کی عزت اس شیشے کے محل کی طرح ہوتی ہے جس پر معاشرے کی سوچ سے اٹھنے والی گرد بھی آ کر پڑ جائے تو وہ شیشے کا محل اپنی آب و تاب، اپنی شفافیت کھو دیتا ہے۔ بھلے اس میں کوئی بال برابر بھی فرق نہ ہو۔ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے لیکن بیٹا یہ......

عصر کی نماز کے بعد امی چائے پیتے ہوئے آنگن میں لگے آم کے درخت کے نیچے بچھے تخت پر آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ ''آج پھر امی جی بجلی کے بل کو لے کر پریشان تھیں کہ اب یہ بل کیسے ادا ہوگا اور ابھی تو ریحان کی اسکول کی فیس بھی باقی ہے۔''

''امی جی آپ پریشان نہ ہوں۔'' ایمن ماں کو تسلی دے رہی تھی۔

''تمہارے ابو کے انتقال کے بعد پچھلے دو مہینے میں جو کچھ پیسہ رکھا ہوا تھا گھر کے راشن اور ضروریات میں ختم ہو چکا ہے اور آگے زندگی گزارنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ میں سوچتی ہوں محلے کے کچھ کپڑے سلائی کا کام کر لوں تو کیسا رہے گا۔ امی نے دکھی ہوتے ہوئے کہا

''کپڑے سی کر کتنی آمدنی ہو جائے گی امی گھر نہیں چل سکتا اور کون سا فوراً لوگ سلوانے لگیں گے آپ سے؟ امی جی میں سوچ رہی ہوں ۔'' ایمن نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی

ہم کیا۔ امی بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

''اب گزر اوقات کے لیے کسی نہ کسی کو تو نوکری کرنی ہی پڑے گی ریحان تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ اس کی تعلیم ڈسٹرب نہیں ہونی چاہیے۔ میں کل سے ہی نوکری کی تلاش شروع کر دیتی ہوں۔'' ایمن نے ماں سے اپنی بات کی تائید چاہی۔

تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا لیکن خاندان والے کیا کہیں گے ہمارے خاندان میں کبھی کسی لڑکی نے نوکری نہیں کی اور ویسے بھی تم نے کون سی بڑی تعلیم حاصل کی ہے کہ کوئی نوکری تمہیں مل جائے گی۔'' امی جی کسی حد تک کشمکش کا شکار تھیں۔

☆......☆......☆

''امی جی ان دو مہینوں میں کتنے خاندان والے ہمارا حال پوچھنے آ گئے کہ ہم کس طرح اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ کوئی آئے اور اعتراض کرے تو بہت محبت سے اسے کہہ دیجیے گا کہ ٹھیک ہے آپ کو اعتراض ہے تو ایمن نوکری نہیں کرے گی۔ مگر ہمارے گھر کا خرچہ اب آپ کی ذمہ داری

ہے کیونکہ آپ کو تو معلوم ہے کہ اب ان کے ابو کے بعد کوئی کمانے والا نہیں ہے تو مجبوری ہے پھر دیکھئے گا کہ کون پلٹ کر آتا ہے۔ ایمن نے یوں چٹکی بجاتے ہوئے کہا جیسے ساری پریشانی کا حل تلاش کرلیا ہو۔

''لیکن بیٹا مجھے یوں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا اچھا نہیں لگے گا۔'' آج تک کبھی کسی سے نہیں مانگا اور اللہ نہ کرے جو کبھی ایسی نوبت آئے۔'' امی جی تو اور زیادہ پریشان ہوگئی تھیں۔

''ارے میری بھولی امی جی۔'' ایمن نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ مجھے نوکری کرنے دیں۔ رہی بات کسی کے دینے کی تو آپ کی بات سن کر کوئی پلٹ کر واپس نہیں آنے والا یہ تو صرف اسی لیے ہے کہ لوگوں کے منہ بند ہو جائیں۔

میں تمھیں حالات سے مجبور ہو کر اجازت تو دے رہی ہوں لیکن بیٹا میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔

''جی امی!''

لڑکی کی عزت اس شیشے کے محل کی طرح ہوتی ہے جس پر معاشرے کی سوچ سے اٹھنے والی گرد بھی آ کر پڑ جائے تو وہ شیشے کا محل اپنی آب و تاب، اپنی شفافیت کھو دیتا ہے۔ بھلے اس میں کوئی بال برابر بھی فرق نہ ہو۔ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے لیکن بیٹا یہ وہ معاشرہ ہے جہاں بد اچھا بدنام برا والی مثال رائج ہے۔ اس لیے ایسے تمام معاملات میں محتاط رہنا کہ ہمارے پاس ہماری عزت ہی نایاب دولت ہے۔ بیٹا یہ مردوں کا معاشرہ ہے اور یہ وہ دنیا ہے کہ جہاں بات کا بتنگڑ بنتے دیر نہیں لگتی۔ اب تم ہماری عزت کو سنبھال کر رکھنا۔

ویسے ہی لوگ تمھاری نوکری کے مخالف ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی کو باتیں بنانے کا موقع مل جائے۔''

☆......☆......☆

امی جی نے دل بڑا کر کے اسے اجازت تو دے دی تھی ان کہ پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا پر دل میں اٹھنے والے ہزاروں وہم اور ڈر دور کرنے کے لیے بیٹی کو سمجھا رہی تھیں۔

امی آپ بالکل فکر نہ کریں میں اپنی عزت پر آنچ بھی نہ آنے دوں گی یہ میرا وعدہ ہے۔ ایمن نے ماں کو یقین دلاتے ہوئے کہا تو جیسے ماں کے دل کو قرار آ گیا مسکرا کر اس کے اچھے نصیبوں اور کامیابی و بلند وقار کی دعائیں دینے لگیں۔

ایمن نے گریجویشن کی تھی اور ساتھ ساتھ ابو جی کے کہنے پر کچھ کمپیوٹر کے کورسز بھی کر لیے تھے کیونکہ امی جی گھر داری سنبھالتیں تھیں اور چھوٹا بھائی ریحان ابھی صرف میٹرک میں تھا ہاں ایمن باجی کا ہاتھ بٹانے کے لیے اس نے کچھ بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا تھا ابو جی کی پینشن میں گزارا کرنا بہت مشکل تھا اسی لیے امی نے بھی تھوڑی بہت سلائی شروع کر دی تھی جو گھر بیٹھے مل جاتی تھی ابو اک سرکاری دفتر میں ملازم تھے اور ان کے بعد پینشن بھی اور کم ہو گئی تھی سب سے بڑا مسئلہ اس کے لیے اپنے بھائی کی تعلیم کا تھا جو وہ ہر گز چھڑوانا نہیں چاہتی تھی۔

خاندان کے کئی لوگوں سے اس نے نوکری دلوانے کے لیے کہا تو پہلے تو چچا میاں نے بہت باتیں بنائیں کہ اب ہمارے خاندان کی عزت یوں غیر مردوں کے بیچ کام کرے گی یوں رسوا کرو گی نہیں لیکن ایمن کے کہے گئے جملے جب امی جی کے زریعے ان کے کانوں تک پہنچے تو ان کی زبان بھی بند ہو گئی جب کہ باقی خاندان نے اگر مدد نہیں کی تو کوئی اعتراض بھی نہیں کیا بس ہر اک نے اسے اسکول میں جاب کرنے کا مشورہ دیا لوگوں کے خیال میں نوکری پیشہ خواتین کو پسند نہیں کیا جاتا اسے بھی نوکری کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا لیکن گھر کے حالات سے مجبور ہو کر وہ کسی دفتر میں نوکری کرنا چاہتی تھی کیونکہ اسکول کے مقابلے میں دفتروں میں تنخواہ زیادہ ہوتی ہے۔ لوگوں نے نوکری تو نہ دلوائی اسے ڈرا زیادہ دیا کہ تم کر نہیں سکتیں مگر اس نے بھی ہمت نہیں ہاری اور کوششوں میں لگی رہی۔

کئی دن تک اخبارات کے اشتہارات دیکھنے اور مختلف دفاتر کے چکر لگانے کے بعد اسے ایک آفس میں کمپیوٹر آپریٹر کی نوکری مل گئی تھی۔ آفس جاب کا اس کا یہ پہلا تجربہ تھا ورنہ ساری زندگی ابو جی نے گھر کا ماحول ایسے رکھا تھا کہ کبھی کسی اجنبی مرد سے فری ہو کر بات نہیں کرتی تھی اس لیے اسے شروع میں بہت جھجک کا سامنا کرنا پڑا تھا اور یہی اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ تھا جیسے کہ ہمارے معاشرے میں عام طور پر لڑکیوں کے ساتھ پیش آتا ہے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اللہ نے عورت کو ایک ایسا حساس ذہن دیا ہے کہ مرد کی نگاہ کو جانچنا کوئی مشکل کام نہیں وہ با آسانی اس بات کا اندازہ لگا سکتی ہے کہ کس نگاہ میں پاکیزگی ہے اور کون سی نگاہ غلط ہے شروع میں کئی۔

کولیگز جن میں راحیل اور کاشف سر فہرست تھے اس سے بلاوجہ فری ہونے کی بہت کوشش کی۔

آپ کی فیملی میں کون کون ہے؟۔ اک دن راحیل آفس کی فائل دینے آیا تو اس سے پوچھ رہا تھا۔ جسے بہت سنجیدگی سے جس کا جواب دیا جی! اک والدہ اور بھائی چھوٹا ہے۔

میں آپ کو ڈراپ کر دوں آیئے۔ کاشف نے بہت مسکراتے ہوئے آفر کی تھی جسے اس نے

بہت سنجیدگی سے ٹال دیا نہیں شکریہ میں بس میں جانے کی عادی ہوں چلی جاوں گی۔ اس کے اصرار پر بھی وہ اس کے ساتھ نہیں گئی تھی۔

ہمارے ساتھ لنچ کیجیے !ارے آج چائے تو ہمارے ساتھ پی لیں۔ اکثر وہ دونوں اسے لنچ اور چائے کی آفر کر دیتے جسے وہ کام کا بہانہ کر کے ٹال دیتی۔

آج آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ یہ رنگ آپ پر بہت کھلتا ہے، اس کپڑے کا تو ڈیزائن بھی بہت اچھا ہے۔ کہاں سے شاپنگ کرتی ہیں۔ راحیل کے اتنے لمبے اور بلا وجہ کی تعریف کے جواب میں اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ''بہت شکریہ یہ میری امی کی پسند کا سوٹ ہے اور پھر اپنے کام میں محو ہو گئی۔''

وہ اسی طرح اپنے سب کولیگز سے لیے دیے رویہ رکھتی صرف کام کی ہی بات کرتی ویسے تو وہ خود بھی اپنی نیچر کی وجہ سے زیادہ مردوں سے فری ہونے کی قائل نہ تھی مگر ماں کے کہے گئے الفاظ جو نوکری کرنے سے پہلے اس کے کانوں میں ڈال دیے گئے تھے ان کی وجہ سے وہ مزید محتاط ہو گئی تھی وہ اپنا کام بہت محنت سے وقت پر مکمل کر دیا کرتی تھی کچھ لوگ اس کی اس عادت سے خوش تھے تو کچھ اسے مغرور سمجھ کر طنزیہ جملے بھی کس دیتے تھے مگر شاید یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو عورت کو ایمانداری سے کام کر کے باعزت روزگار کمانا چاہتی ہے تو وہ اپنے جال میں نہ پھنسنے پر اپنا غبار ایسے ہی نکالتے ہیں کہ اسے کسی نہ کسی طرح بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان تمام باتوں کے باوجود وہ خاموشی سے کام کرتی رہی اس کے لیے اپنے گھر کو معاشی بد حالی سے نکالنے کے ساتھ ساتھ اپنی حرمت کو ہر طرح کے کیچڑ سے پاک رکھنا بھی بہت اہم تھا۔

مس ایمن ان سے ملیں یہ ہماری نئی اسٹاف میمبر ہیں مس ایشاء۔ یہ یہاں ریسپشنسٹ کے طور پر اپوائینٹ ہوئی ہیں۔۔ راحیل بہت ہی لہکتے ہوئے انداز میں ایمن کا ایشاء سے تعارف کروا رہا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں ایمن سے ایشاء کی بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

ایشاء اپنے بارے میں کچھ بتاوٗ۔ ایمن نے اک دن ایشاء سے پوچھا تو اس نے کہا۔ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہوں میری منگنی ہو چکی ہے اور اپنی شادی اور جہیز کے انتظام کے لیے یہ نوکری کرنی پڑ رہی ہے گھریلو حالات بھی کوئی بہت اچھے نہیں ہیں میرے والد صاحب ریٹائیر ہو چکے ہیں اور پانچ بہن بھائیوں کے ساتھ کم آمدنی میں گزارہ کرنا کافی مشکل تھا۔

اس جاب کے لیے پبلک ڈیلنگ ضروری تھی وہ بہت کانفیڈینس کے ساتھ ہر اک سے بات کر لیتی تھی اس کی اک عادت تھی وہ بہت خوش اخلاق تھی کردار کی مضبوط تو تھی مگر اس کی اس خوش اخلاقی کی وجہ سے کئی لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جایا کرتے تھے اسے کوئی چائے کی آفر کرتا تو کوئی لنچ کی جسے وہ کبھی مروتاً قبول کر لیتی تو کبھی پیسے بچ جانے کے لالچ میں کسی کولیگ کے ساتھ کھانا میں شریک ہو جاتی۔ ایشاء کے اس رویہ کو ایمن بڑی حیرت سے دیکھا کرتی کبھی کبھی اس پر ایمن کو بہت غصہ آتا کہ یہ کیسی لڑکی ہے جو چند پیسے بچانے کی لالچ میں اپنے ماں باپ کی عزت کو داوٗ پر لگائے بیٹھی ہے اور ہر اک سے کھلکھلاتی پھرتی ہے۔ لوگ ایشاء کے اس رویہ سے بہت محظوظ ہوتے اور اس کے منہ پر اس کی خوش اخلاقی کی بہت تعریفیں کرتے اور اس کے پیٹھ پیچھے اس کے کردار کے بارے میں بہت کچھ کہہ جاتے ایمن کسی کے

معاملے میں دخل اندازی کرنا پسند نہیں کرتی تھی اسی لیے خاموش رہی مگر جب چند باتیں ایمن کے کانوں تک بھی پہنچیں جنہیں سن کر اسے کافی دکھ ہوا۔ ایمن کے خیال میں ایسی ہی لڑکیاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے دفتروں میں کام کرنے والی ہر لڑکی بدنام ہو جاتی ہے لوگ ہر لڑکی کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

دیکھو ایشاء تم زرا کم ہی ان لوگوں کو فری ہو نے کا موقع دیا کرو جب تک تم نہیں چاہوں گی کو ئی تم سے بلاوجہ فری نہیں ہوسکتا۔ ایمن نے ایشاء کو سمجھانے کی کوشش کی۔

یار! میرا مزاج ہی ایسا ہے۔ میں کسی کو بھی نا راض نہیں کر سکتی۔ ایشاء بہت لاپرواہی سے کہہ رہی تھی۔

تم میری بات سمجھ نہیں رہی ہو۔ تمھیں محتاط رہنا چاہیے۔ ایمن نے پھر کہا کیوں ایسا کیا کر دیا میں نے جو محتاط رہنا چاہیے۔ ایشاء چڑ گئی تھی۔

تم نے کچھ نہیں کیا ہے بس اس معاشرے میں لڑکیوں کا لڑکوں سے یوں فری ہو کر باتیں کرنا منا سب نہیں سمجھا جاتا اس لیے کہہ رہی ہوں۔ ایمن نے اسے بڑے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

اک تم ہی تو سمجھدار ہو ہم تو شکار پور سے آئے ہیں ہمیں تو دنیا کا کچھ پتا ہی نہیں۔ ایشاء تو جیسے ہتھے سے ہی اکھڑ گئی تھی۔

تم غلط سمجھ رہی ہو مجھے میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں تھا۔ ایمن شرمندگی محسوس کرنے لگی کہ اس نے ایسے کیوں کہا۔ اصل میں کچھ لوگ تمھارے با رے میں کچھ الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں تمھارے۔

کردار پر کیچڑ اچھال رہے ہیں میں اس لیے تم سے محتاط رہنے کا کہہ رہی تھی۔ ایمن نے ایک بار پھر اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔

ایشاء تو الٹا اس سے ہی الجھ پڑی تم اس شخص کا نام بتاؤ جس نے میرے بارے میں ایسی فضول با تیں کی ہیں میں اس کا منہ نوچ لونگی۔

میں نام نہیں بتا سکتی میں نہیں چاہتی کہ یہاں کوئی تماشہ ہو بس تمھیں اپنی دوست سمجھ کر صلح دے رہی ہوں آگے تمھاری مرضی۔ لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ تم اپنی اس بے باک طبعیت کی وجہ سے اک دن ایسا نہ ہو کہ کوئی نقصان اٹھا بیٹھو اسی لیے سمجھا رہی ہوں میں تمھاری دوست ہوں اور تمھارا برا نہیں چاہتی اپنے کام سے کام رکھا کرو میں ہوں یہاں تم مجھ سے باتیں کیا کرو۔ ایمن نے جیسے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

ایشاء منہ بناتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی پیر پٹختی ہو ئی اور اپنی جگہ پر چلی گئی۔

☆......☆......☆

راحیل تم سے اک بات کرنی تھی۔ اگلے دن ایشاء نے یہ ساری باتیں راحیل سے کہنے کا سوچا۔

ہاں کہو۔ راحیل نے پوری توجہ ایشاء کی جانب کر دی۔

مجھے ایمن نے بتایا ہے کہ کوئی یہاں آفس میں میرے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے میرے کردار کے بارے میں۔ کیا یہ سچ ہے؟۔ کیا تم نے بھی ایسا کچھ سنا ہے۔

راحیل نے چونکہ یہ باتیں ایشاء کے بارے میں کہیں تھیں تو اسے ڈر ہوا کہ کہیں اس کا نام نہ آجائے۔ تمھیں اس نے نام نہیں بتایا اس کا جس نے تمھارے بارے میں ایسی بات کی ہے۔

نہیں نام نہیں بتایا۔ کہتی ہے کہ کوئی تماشا نہیں بنانا چاہتی۔

ارے جھوٹ بولتی ہے وہ میں نے تو ایسا کچھ نہیں سنا کوئی تمھیں کیوں بدنام کرے گا اور ویسے بھی

میرے ہوتے ہوئے کسی کی کیا جرات کے تمھارے بارے میں کچھ کہے میں منہ نہ توڑ دونگا اسکا۔

راحیل نے بہت چالا کی سے کام لیتے ہوئے اپنا بچاو کیا ساتھ اپنا اعتماد بھی قائم کر دیا۔

بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ایمن تم سے جلتی ہو کیونکہ اس آفس میں سب ہی تمہارے اخلاق کی وجہ سے تمہیں پسند کرتے ہیں کیونکہ تم اتنی خوش اخلاقی سے ہم سے اتنی اچھی دوستی ہوگئی سب کا خیال رکھتی ہو سب سے اچھی طرح باتیں کرتی ہو ہر کوئی تمھاری عزت کرتا ہے اسے کون پوچھتا ہے شاید اسی جلن میں وہ چاہتی ہو کہ تم بھی اس جیسی نک چڑھی بن جاو کوئی اس کی بد اخلاقی کی وجہ سے اس سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتا۔ وہ اک بہت شاطر قسم کا لڑکا تھا ایشاء کو ایمن سے بدظن کر کے وہ اب خوش تھا کہ اب ایشاء ایمن کی کوئی بات سنے گی ہی نہیں۔

ایشاء مطمئن ہوگئی اور اپنے روٹین کو جاری رکھا جب دوبارہ ایمن نے اسے ٹوکنے کی کوشش کی تو ایشاء نے ایمن کو بہت باتیں سنائیں۔

تم مجھ سے جلتی ہو ہر کوئی مجھ سے بات کرنا پسند کرتا ہے لوگ اتنی خوش دلی سے مجھ سے ملتے ہیں تمھیں اب تک کتنے لوگوں نے لنچ کی آفر کر دی تم سے تو لوگ ڈرتے ہیں کہتے ہیں کہ تم بہت مغرور ہو کسی سے بات کرنا پسند نہیں کرتیں جانے کس بات کا گھمنڈ ہے تم کو اور تم دیکھنا اک دن میں اپنی اسی خوش اخلاقی کہ وجہ سے تم سے کہیں آگے نکل جاوں گی۔ وہ ایشاء کی ساری باتیں سن کر خاموش ہوگئی اسے بہت دکھ ہوا لیکن آفس کا ماحول خراب نہ ہو اس لیے اس کی باتیں اگنور کر کے اپنا کام میں بزی ہوگئی۔

وقت ایسے ہی گزرتا گیا ایشاء روز کسی نہ کسی کو لیگ کے ساتھ لنچ کرتی اور راحیل کو ملا کر اس کا مذاق اڑاتی اس پر طنز کرتی ہوئی جاتی۔ لوگ تو اپنے غرور سے باہر ہی نہیں نکلتے جانے کس بات کا غرور ہے۔ وہ سنتی اور ان سنی کر دیتی۔ اس آفس میں موجود سب ہی لوگ ایمن کی بہت عزت کرتے اور بہت احترام سے بات کرتے تھے۔

کئی دن اور گزرے تو معلوم ہوا کہ ایشاء اچانک نوکری چھوڑ کر چلی گئی ہے ایمن کو بہت تعجب ہوا کہ اچانک یہ کیسے ہو گیا وہ ایشاء کے گھر گئی تو معلوم ہوا کہ اس کی حالت بہت خراب ہے شدید بخار سے نیم غنودگی کا شکار تھی ایمن اس سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن ایشاء اس حالت میں نہ تھی کہ کوئی بات کر پاتی۔

آفس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی بس ایشاء کی جگہ اک نئی لڑکی آ گئی تھی اور جو لوگ کبھی ایشاء کے گرد گھوما کرتے تھے آج اس لڑکی کے ارد گرد گھومتے نظر آتے تھے ایمن سوچتی ایشاء جیسی لڑکیاں جسے عزت کا نام دیتی ہیں کہ لوگ ان کے ساتھ لنچ کرتے ہیں ان سے خوش ہو کر قہقہے لگاتے ہیں در حقیقت اپنی عزت کا بھرم اور اپنی حیا کی چادر کو داغ دار کر کہ خود کو نقصان پہنچا رہی ہوتی ہیں یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہے ایک ہفتہ کے بعد جب ایمن اک بار پھر ایشاء کے گھر گئی تو ایشا کیسی ہو؟۔ ایمن نے اس کی خیریت دریافت کی۔

بس ٹھیک ہوں مگر تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں میں تمھیں بتا نا چاہتی ہوں کہ میں نے نوکری کیوں چھوڑی ہاں ہاں بتا و!۔ ایمن نے بھی اسرار کیا۔

ایمن اصل میں راحیل نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا اسی لیے میں کئی بار اس کے ساتھ آفس کے باہر لنچ کرنے بھی گئی اور اسے میرے کسی

رشتے دار نے ہمیں ایسے گھومتے ہوئے دیکھ لیا اور خاندان میں بات پھیلا دی جبکہ خاندان والے میری نوکری کے پہلے ہی مخالف تھے میری منگنی چونکہ خاندان میں ہی ہوئی تھی تو ان تک بھی یہ بات پہنچ گئی اور ان لوگوں نے مجھے بدکرداری کا طعنہ دیتے ہوئے منگنی بھی ختم کردی جب میں نے یہ بات راحیل کو بتائی تو کئی دن تک وہ مجھے اس بات پر خوش کرتا رہا کہ جو ہوا اچھا ہوا اب ہمیں شادی کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا لیکن جب 3 مہینے اور گزر گئے تو میں نے اسے رشتہ بھیجنے پر زور دینا شروع کردیا جسے وہ بہت خوبی سے ٹالتا رہا اور آخر میرے زیادہ زور دینے پر ہمارے درمیان لڑائی ہو گئی۔ اس کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ایمن نے اسے پانی پلایا اور چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ جس پر اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا غصے میں راحیل نے انتہائی حقارت سے مجھ سے کہا تمھارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا میں تم جیسی آوارہ لڑکی سے شادی کیوں کروں گا میں ایک شریف گھرانے کا لڑکا ہوں اور کسی شریف لڑکی سے ہی شادی کروں گا۔ تم جب میرے ساتھ یوں گھومتی پھرتی ہو تو کس کس کے ساتھ جانے کہاں کہاں گئی ہوگی میں تم جیسی لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا تم جیسی لڑکیاں تو صرف کھیلنے کے لیے ہوتی ہیں اور یہ بھی کہا کہ میں کسی گھریلو لڑکی سے شادی کروں گا یا پھر ایمن جیسی کسی لڑکی سے جو کسی لڑکے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں ہیں وہ یہ سب کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تم صحیح کہتیں تھیں مگر میں نے تمھاری اک نہ سنی میں تو سارے خاندان کی نظر میں اک بدکردار لڑکی بن گئی ہوں میری منگنی بھی ٹوٹ گئی اب کیا کروں سمجھ نہیں آرہا۔ ایشاء اس کا ہاتھ پکڑ کر اک بار پھر اپنے دل کا بوجھ اتار رہی تھی

جب کہ ایمن کے پاس سوائے تسلی دینے کے اور کوئی الفاظ نہ تھے وہ اسے یوں ہی روتا چھوڑ کر تسلی دیتے ہوئے بوجھل قدموں سے گھر واپس آگئی راستے بھر اس کے کانوں میں ماں کے الفاظ گونج رہے تھے۔

☆......☆......☆

لڑکی کی عزت اس شیشے کے محل کی طرح ہوتی ہے جس پر معاشرے کی سوچ سے اٹھنے والی گرد بھی آڑ کر پڑ جائے تو وہ شیشے کا محل اپنی آب و تاب اپنی شفافیت کھو دیتا ہے بھلے اس میں کوئی بال برابر بھی فرق نہ ہو یہ وہ مردوں کا معاشرہ ہے جہاں بد اچھا بدنام برا والی مثال رائج ہے جہاں بات کا بتنگڑ بنتے دیر نہیں لگتی اس لیے ایسے تمام معاملات میں محتاط رہنا کہ ہمارے پاس ہماری عزت ہی نایاب دولت ہے وہ سوچ جارہی تھی کہ یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ لڑکا کتنی ہی لڑکیوں سے دوستی کرتا رہے وہ پارسا ہی رہتا ہے جب کہ اگر کوئی لڑکی کسی سے ہنس کر بات بھی کرلے تو بدکرداری کی تہمت اس کے ماتھے پر سجادی جاتی ہے۔

یقیناً اسلام میں اسی لیے یہ حکم آیا ہوگا کہ بلا ضرورت کسی نامحرم مرد سے بات نہ کرو جب کہ بہت ضروری ہو تو اپنے لہجے کو اتنا سخت رکھو کہ کوئی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ یہ بھی نہیں کہ اسلام کوئی ایسا مذہب ہے جس میں عورت کو کام کرنے کی اجازت نہ ہو ایسا ہوتا تو بہت سی صحابیات اور نبی پاک ﷺ کی زوجہ محترمہ تجارت کا پیشہ نہ اپناتیں۔ اسلام ایک ایسا جامع مذہب ہے جو عورت کو نوکری کرنے سے منع نہیں کرتا لیکن اپنے حدود میں رہنے کی تلقین ضرور کرتا ہے۔

☆☆......☆☆

افسانہ

عقیلہ حق

پگلی، ریشماں اور عورت

کبھی کبھی تو اختر کو ایسا لگتا کہ جہاں وہ ریشماں کو چھوڑ کر گیا تھا ریشماں وہیں ایک سنگی مجسمہ کی طرح ایستادہ اس کا انتظار کر رہی ہے اختر کو گلابی رنگ پسند تھا۔ ریشماں گلاب جیسے بدن پر گلابی رنگ سجائے رکھتی کبھی کبھی اختر شرارت سے اس کو چھیڑتا۔ ریشم گلابی جوڑے......

میں تنہائی پہنتی ہوں خموشی میرا کہنا ہے
مایوسی آنکھ کا کاجل، محرومی اثاثہ ہے
تمناؤں کی قبریں، دل کے قبرستان کی رونق
کوئی زائر نہیں آتا کہ وہ کچھ پھول لے آئے
یہاں منظر بدلنے کو
میرے اندر ہے...... آہوں سسکیوں کا شور سابرپا
جسے سننے میں اتنی منہمک ہوں میں
کہ باہر کی ہر ایک صدا مفقود رہتی ہے
کوئی روزن نہیں باقی، جو باہر سے کرنِ امید لے کر آئے
مجھے اب خواب میں بھی محل منیارے نہیں آتے
مجھے شیریں نہیں لگتا پھل اب صبر کا بھی
کہ کڑوے سچ کی کڑواہٹ، حقیقت کی جو تلخی ہے
میرے اندر رچ بس گئی ہے
مجھے بے چین رکھتی ہے
مجھے پریشان کرتی ہے
میرے دل کو نوچتی ہے

☆......☆......☆

''دیکھ تو شیدے چاچی پگلی برسوں بعد نہر کی طرف جا رہی ہے۔ کمالے نے شیدے کو کہنی مارتے ہوئے...... مزے سے چائے پیتے ہوئے شیدے کی توجہ چاچی پگلی کی طرف مبذول کروائی۔

ارے شیدے تو پگلا ہے۔ وہ پگلی ہے۔ نہر کی طرف جائے، جنگل کی طرف جائے روڈ پر ناچے یا کسی کے پیٹ میں خنجر گھونپ دے مجھے اس سے کیا۔ میرا کیا دماغ خراب ہو گیا ہے جو اس پگلی کی حرکات کو دیکھتا پھروں۔

کمالے کے ٹھوکا مارنے سے شیدے کی چائے چھلک کر گر گئی تھی اور شیدا، جو چائے کا دیوانہ تھا اس کو کمالے کی حرکت پر غصہ سا آ گیا۔

ویسے کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی پاگل کسی کے پیٹ میں خنجر گھونپ دے......

شیدے کے چہرے پر بیزاری دیکھ کر کمانے اپنی پر تجسس عادت سے مجبور ہو کر چائے بنا کر بنا کر شیشے کے گلاسوں میں ڈالتے مصروف مجیدے سے پوچھا۔

کون! مجیدا اپنے ہی خیالوں میں محو تھا۔ کمالے کے سوال پر چونک کر پوچھنے لگا۔

کچھ نہیں یار آج برسوں بعد چاچی پگلی نہر کی طرف جا رہی تھی میں نے شیدے سے کہا تو وہ کہتا ہے وہ نہر کی طرف جائے یا کسی کے پیٹ میں خنجر گھونپے ہمیں کیا......

اس طرح تو نہیں کہنا چاہیے...... چاچی پگلی...... ہے تو گاؤں کی چاچی نا کمالے کیا کیا بول رہا تھا۔ مجیدے کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے جلدی سے میزیں صاف کرتے ہوئے لڑکے کو بلایا اس کو اپنی جگہ کھڑا کیا اور پھر تیزی سے نہر کی طرف جاتے راستے پر دوڑنے لگا وہ جانتا تھا کہ چاچی پگلی کیوں نہر کی طرف جا رہی ہے۔

وہ دوڑ رہا تھا اس کو اس بات کی قطعی پرواہ نہیں تھی کہ شیدا اور راستے میں ملنے والا ہر شخص اس کو بہت حیرت سے دیکھ رہا ہے۔

وہ چاچی پگلی کو روکنا چاہتا تھا۔

منع کرنا چاہتا تھا

لیکن کس بات سے......!"

☆......☆......☆

ریشم تو تو ایسی ریشم جیسی ہے تیرے لیے کوئی چیز بھی لے لوں وہ چیز تیرے لائق ہی نہیں لگتی۔

چھ فٹ سے نکلتا قد، کسرتی بدن، گندمی رنگت پر چمکتی محبت برساتی گہری براؤن آنکھیں سیاہ مونچھوں تلے مسکراتے، شرارتی ہونٹ ریشم نے ایک گہری نظر اپنے اوپر جاں نثار کرتے اپنے محبوب کو دیکھا۔

''اچھا...... پھر ایک ادا سے اس کے منہ سے نکلا۔

لیکن پھر بھی ریشم یہ میں تیرے لیے لایا ہوں، نہر کے کنارے لگے درختوں کے جھنڈ میں کھڑے اختر نے محبت سے ریشم کی سفید دودھیا کلائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس چوڑیاں ریشم نے سوال کیا۔

''نہیں نہیں پراندہ بھی ہے اور بالوں کے کلپ بھی۔

خوبصورت ریشم کے پھولوں سے سجا، سرخ دھاگوں سے بنا پراندہ اختر نے ہتھیلی سے نکال کر ریشماں کی آنکھوں کے آگے لہراتے ہوئے کہا۔

''ہائے ربا...... کتنا سوہنا ہے۔ ریشماں نے لپک کر پراندہ اختر کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

اور اختر اس ایک لمحہ میں کھو سا گیا۔

ریشم کبھی تو میرے ہاتھوں سے بھی چوڑیاں پہن، تیرے نرم نرم ہاتھوں کو پکڑنے کو ان کلائیوں میں چوڑیاں سجانے کو رب کی قسم میرا بڑا دل کرتا ہے۔

اختر نے ریشماں کو جلدی جلدی کلائیوں میں چوڑیاں، چڑھاتے دیکھ کر حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

ریشم کے چوڑیاں پہنتے ہاتھ ایک لمحے کو جیسے ساکت ہوگئے۔ اس کے خوبصورت چہرے پر شرم اور محبت کے ملے جلے تاثرات ایک حسین روپ میں نظر آنے لگے۔ اس کے یاقوتی ہونٹ...... کچھ کہتے کہتے رک سے گئے۔ اس نے گھنیری پلکیں اٹھا کر اختر کی طرف دیکھا۔

اختر کی محبت برساتی آنکھوں نے اس کو آنکھیں جھکانے پر مجبور کردیا اختر اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے مسکرایا۔

تو نے جواب نہیں دیا۔ اختر نے اس کو چھیڑا۔

ریشماں خاموش رہی۔

ریشم ...... کچھ تو بول اختر اس کے کان میں گنگنایا۔ عورت محبت کے لیے پیدا ہوتی ہے اور جب محبوب کی محبت ملتی ہے تو عورت ایک ملکہ بن جاتی ہے...... اور ریشماں بھی اپنے آپ کو ایک ملکہ ہی تصور کر رہی تھی۔ جس کے قدموں میں ایک مرد اپنا دل لیے بیٹھا تھا۔

واقعی عورت محبت کے لیے پیدا ہوتی ہے۔

محبت ایک کیفیت ہی تو ہے۔ محسوسات کی جھیل پہ دل ایک پھول کی طرح مہکتا ہے ادھر نظر اٹھی ہے ادھر حشر برپا ہو جاتا ہے۔

ادھر سانس سوال کرتی ہے ادھر نگاہ جواب دیتی ہے۔ چہرے کا ہر نقش محبتوں کے امین بن جاتا ہے اور یوں محبت محبوب کو حسین بنا دیتی ہے۔

تو نے جواب نہیں دیا ریشم ......اختر کی بے تابی ریشماں کو ہواؤں میں اڑا رہی تھی۔

نہیں ابھی نہیں، ریشماں نے دھڑکتے دل اور لرزتے وجود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

کیوں ابھی کیوں نہیں یہ مرد...... یہ مرد کتنے بے تاب ہوتے ہیں۔

''شادی کے بعد۔'' ریشماں کی آواز کپکپائی۔

کتنی عجیب سی بات ہے! عورت جب کسی مرد کی محبوبہ ہوتی ہے تو اس کی بیوی بن جانے کی آرزو واسے تڑپاتی رہتی ہے جب بیوی بن جاتی

ہے تو باقی ساری عمر محبوبہ بننے کی حسرت میں گزار دیتی ہے۔

اچھا...... تو بھیجوں پھر اماں کو تاریخ لینے کے لیے......

اختر بے ساختہ ہنسا۔

''بھابی سے بھی پوچھوں گی...... ریشماں کو آج اختر کی بے باک نگاہوں سے اپنے آپ کو چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔

تو بھابی کو ہماری ملاقاتوں کے بارے میں بتا دیتی ہے کیا؟ اختر حیران ہوا۔

تو اور کیا! میری بھابی صرف بھابی نہیں، میری بہن، میری دوست میری غم خوار...... میری ماں سب کچھ ہے اور ہماری منگنی کے لیے اس نے ہی تو بھیا کو راضی کیا تھا۔ ریشماں کے لہجے میں محبتوں پر فخر تھا۔

''اچھا اتنی محبت ہے بھابی سے اختر ہنسا۔''

اچھا یہ بتا زندگی میں اگر ایک طرف بھابی اور دوسری طرف میں ہوا تو کس کو چنے گی۔

اختر نے معصوم سی ریشماں کو دوراہے پر لا کھڑا کیا۔

چند لمحوں کے لیے ریشماں لاجواب رہی اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ ابھری...... اس نے اختر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

اور پھر بہت اطمینان سے کہا۔

بھابی...... اور اختر کو انگوٹھا دکھا کر ہنستی ہوئی بھاگ گئی اور اختر اس کی شرارت کو سمجھ کر بے ساختہ ہنستا چلا گیا۔ لیکن ریشماں نہیں جانتی تھی کہ یہ لمحہ۔ اس سے سوال کھڑا ہو جائے گا۔

☆......☆......☆

میرے خیال سے محبت ایک ایسا فلسفہ ہے جس کے کئی معنی ہوتے ہیں کئی لبادوں میں چھپا ہوتا ہے لفظ محبت، دو انسانوں کا آمنے سامنے آ جانا ٹکرا جانا اور پھر بچھڑے ہوئے پانی کی طرح ایک دوسرے میں سما جانے کی تمنا کرنا...... بھی ایک روپ ہے۔

انسان کا دل تمنا محبت سے کبھی خالی نہیں ہوتا۔

محبت ایک درد ہے ایک غم ہے ایک خلش ہے ایک بے چینی ہے ایک اضطراب ہے ایک چبھن ہے ایک گداز احساس ہے ایک روح کو چھو لینے والا احساس ہے۔

محبت کیا ہے!

درختوں کے جھنڈ میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے اس نے بکھری بالوں کو سمیٹتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔

☆......☆......☆

ریشماں اختر کی ریشم...... ریشم کے لچھے جیسی ہی تھی۔ نازک خوبصورت اور معصوم سی۔

ریشماں کے ماں باپ تو تھے ہی نہیں ایک ہی بھائی تھا جس میں اس کی جان تھی اور بھابی...... بھابی اس کی بچپن کی سگی سہیلی تھی ریشماں کے بھائی اور بھابی اس کو پھولوں کی طرح رکھتے تھے۔ ریشماں اپنے بھائی نعیم کی آنکھوں کی روشنی تھی تو بھابی سیما کے دل کی ٹھنڈک تھی۔

ریشماں اختر کی منگ تھی۔ محبت تھی...... زندگی تھی...... اختر اور ریشماں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے۔

اختر...... اختر تو ریشماں کا دیوانہ تھا وہ شہر میں کام کرتا تھا۔ گاؤں کا پہلا بی اے پاس مہذب لڑکا۔ کسی کمپنی میں کلرک تھا، پینٹ شرٹ پہنتا تھا بالوں میں جیل لگاتا اور اس کے کپڑوں سے کلون

کی خوشبو نکلتی گاؤں کی ہر لڑکی اس کی قسمت پر رشک کرتی تھی۔

ہر مہینے وہ دو دن کی چھٹی لے کر گاؤں چلا آتا وہاں نہر کے کنارے پیڑوں کے جھنڈ میں کھڑی ریشماں......اس کی راہ تک رہی ہوتی۔

یہ نہر کنارے لگے آم کے درختوں کا جھنڈ ان کی محبتوں کی بہت بے تابیوں بے ساختگیوں اور بے تکلفیوں کا گواہ تھا۔

یہاں کے خاموش درختوں نے بہت سارے عہدو پیماں ہوتے دیکھے تھے۔ بہت دفعہ شرماتی لجاتی ریشماں نے ان درختوں کے تنوں سے ٹیک لگا کر اپنے دیوانے کو کس گستاخی سے انکار کیا تھا۔

کبھی کبھی تو اختر کو ایسا لگتا کہ جہاں وہ ریشماں کو چھوڑ کر گیا تھا ریشماں وہیں ایک سنگی مجسمہ کی طرح ایستادہ اس کا انتظار کر رہی ہے اختر کو گلابی رنگ پسند تھا۔

ریشماں گلاب جیسے بدن پر گلابی رنگ سجائے رکھتی کبھی کبھی اختر شرارت سے اس کو چھیڑتا۔ ریشم گلابی جوڑے میں پتا ہی نہیں چلتا کہ کپڑا کہاں ہے اور تیرا بدن کہاں ہے......سب ہم رنگ ہے...... لا دکھا دیکھوں تو سہی میں کیسا کپڑا پہنے ہوئی ہے۔

اور ریشم جو اختر کی ایک ایک رگ سے واقف تھی جلدی سے کئی فٹ دور ہو جاتی اور پھر اس کی نیلی حسین آنکھیں اختر کو پیار سے گھورنے لگتیں اور اختر شادی کے دن گننے لگتا۔

کبھی کبھی ریشماں اس کو نیلی آنکھوں والی چابی کی گڑیا لگتی......

جس میں اختر کی محبت چابی بھر دیتی تو وہ ہنستی مسکراتی ناچتی گاتی......

وہ اختر کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور زندگی اور سانس لینے میں کیا فرق ہوتا ہے وہ اس بات سے نا آشنا تھی اور جب آشنا ہوئی تو۔

☆......☆......☆

رسوائی کا ڈر ہے وگرنہ خواہش ہے
تم میرے ہو بھی جگہ یہ خبر ٹھہرے
تیرا وجود ہے کہ کتنا عزیز کہ میں
رہوں کہیں بھی نظر تیری منتظر ٹھہرے

''مل آئی ساجن سے......!''

ریشماں جو پلنگ پر آنکھیں بند کیے لیٹی۔ اختر کے حصار محبت میں گم تھی۔ محبوب سے ملنے کے بعد محبوب کو محسوس کر رہی تھی۔ سوچ رہی تھی۔

بھابی سیما کی آواز پر آنکھیں کھول کر مسکرا دی۔

اس کی آنکھوں میں جلتی محبتوں کی قندیلیں دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے بھابی سیما حیران رہ گئی۔

عورت محبت کرتی ہے تو راز بن جاتی ہے لیکن ریشماں کی محبت تو جیسے اشتہار بن گئی ہے۔

بھیا ابھی تک نہیں آئے بھابی۔ ریشماں نے بھابی سیما کی ٹٹولتی کھوجتی ڈھونڈ لاتی سوال کرتی نظروں سے بچنے کے لیے موضوع بدلنا چاہا۔

ہاں کہہ رہے تھے آج فصلوں کو پانی لگانا ہے تھوڑی دیر ہو جائے گی...... خیر بات نہ ٹال...... یہ بتا کیا کیا باتیں ہوئیں کیا لایا تیرا مجنوں شہر سے تیرے لیے۔'' بھابی سیما نے اس کو گدگدایا۔

دیوانی تو میں ہوں اس کی...... محبت کیا ہوتی ہے؟ کوئی مجھ سے پوچھے اختر اور اختر کی محبت کے بغیر زندگی زندگی نہیں ہے بلکہ میں سوچتی ہوں لوگ محبت کے بغیر زندہ کیسے رہ پاتے ہیں۔ جس طرح کہانیوں میں جن کی جان طوطے میں ہوتی ہے اس طرح میری جان اختر میں ہے۔

جب تک وہ شہر میں ہوتا ہے......اس کا خیال

......اس کا تصور مجھے بے چین رکھتا ہے سونے نہیں دیتا...... مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا اور اس کے آتے ہی ایسا لگتا ہے جیسے بہار آ گئی ہو...... ہر چیز گنگنا رہی ہو۔

گرمی میں لو کے تھپڑ ے بھی ٹھنڈے پھواروں کی طرح لگتے ہیں میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں الحمد اللہ بھیا اور بھابی بن کہے میری ہر خواہش کو مقدم جانتے ہیں اور پورا بھی کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس پراندہ اور کانچ کی چوڑیوں میں میری جان ہے، ان چوڑیوں کی کھنک سے میرا دل دھڑکتا ہے اور اس ریشمی پراندہ میں میرا وجود سر سراتا ہے۔

جب اختر ان کانچ کی چوڑیوں کو میری کلائی میں محبت بھری آنکھوں سے سجا ہوا دیکھتا ہے اس کے چہرے پر مقید محبت میری کائنات ہے۔ اختر کی محبت میرے وجود میں خون بن کر دوڑتی ہے۔

ریشماں جواب نہیں دینا تو نہ دے گم صم کیوں ہوگئی بھابی سیما نے اس کو سوچوں کے سمندر میں غوطے کھاتے دیکھ کر مصنوعی ناراضگی سے کہا۔ اور ریشماں جو اپنے آپ سے باتیں کرنے میں اتنی مگن تھی کہ اس کے آس پاس کے ماحول سے بیگانہ ہوگئی تھی۔ جیسے حال میں واپس آ گئی۔

بھابی ناراض نہ ہو...... میں تو...... ریشماں نے محبت سے روٹھی روٹھی بھابی سیما کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

بس جی بنو، رہنے دو...... کہتے کہتے کیوں رک گئیں اختر کی یادوں میں کھوئی ہوئی تھیں نا...... بھابی ہنسیں اور ریشماں مسکرا دی۔ چل میں تیرے بھیا سے کہوں گی اب ریشماں کا دل گھر میں نہیں لگتا اب اس کو اختر کا گھر اور اختر زیادہ اچھے لگتے ہیں...... تیری شادی کر دیتے ہیں ......ٹھیک...... بھابی سیما نے اس کو چھیڑا اور وہ شرم سے دوہری ہوگئی۔

اختر کی سنگت کا احساس ہی کتنا خوش کن تھا۔ ''یا اللہ میری جیسی بھی نصیبوں والی ہوگی۔''

واقعی میں بڑی نصیبوں والی ہوں اس کے اندر بیٹھی ایک عورت فخر سے اترائی۔

لیکن......!

☆......☆......☆

گاؤں کی خوبصورت چمکیلی شام بہت جلد رات کے آنچل میں منہ چھپا لیتی ہے اور اس وقت بھی شام کے اوٹ میں چھپنے جا رہی تھی چاچی بگلی نہر کنارے تیز تیز آگے بڑھ رہی ہے۔ نہر کے کنارے موجود آم کے گھنے باغات ان باغات میں تو دن میں بھی اندھیرا رہتا تھا نا کہ رات کو۔

چلتے چلتے چاچی کو کچھ خیال آیا تو اس نے کمر کے پٹکے پر ہاتھ رکھ کر اپنی تسلی کی...... اطمینان ہو جانے کے بعد وہ پھر چلنے لگی...... اس کی ٹانگیں تھکن اور جذبات سے لرز رہی تھیں۔ کپکپا رہی تھیں لیکن اس کو پرواہ نہیں تھی عمر گزرتی دھائیوں نے اس باغ تک پہنچنا اس کے لیے بے حد مشکل بنا دیا تھا لیکن اس کے باوجود پھولتی ہوئی سانسیں لرزتی ہوئی ٹانگیں اس کو اس کے ارادے سے باز رکھنے سے قاصد تھیں۔

''اور اس کا ارادہ......''

☆......☆......☆

کیا ہوا نعیم اتنی دیر کر دی آج...... جیسے ہی بھائی نعیم گھر آیا بھابی سیما نے فکر مندی سے پوچھا۔ فکر مند تو ریشماں بھی تھی۔

نعیم نے کوئی جواب نہیں دیا، سیدھا اندر

کوٹھری میں چلا گیا سیما نے حیرت سے نعیم کو کوٹھری کی طرف جاتے ہوئے دیکھا، عموماً کوٹھری میں وہ لوگ سال بھر کی گندم رکھتے تھے نعیم عموماً شام ڈھلے ہی گھر آ جاتا تھا اس وقت عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ سیما نے بے حد فکر مندی سے کوٹھری میں داخل ہوتے ہوئے نعیم کو دیکھا اور خود بھی اس کے پیچھے کوٹھری میں داخل ہو گئی۔

چولہے میں دھکتی آگ بجھنے کو تھی آٹے کے بنے پیڑوں پر پپڑی سی آ گئی تھی ریشماں جو بھابی کے آنے پر روٹیاں پکانے کے لیے تیار بیٹھی تھی نے جلدی سے پھونکنی سے آگ کے بجھتے شعلوں کو دھکانا شروع کر دیا گھر کے سارے کام نمٹا کر وہ اپنے باپ جیسے بھائی کے لیے گرم روٹی خود ہی پکاتی تھی جو کبھی بھابی سیما منع بھی کر دیتیں تو وہ بہت لاڈ سے کہتی۔

بھابی تم نے تو ساری زندگی ہی بھیا کی روٹی پکانی ہے۔ میں کتنے دن کی ...... مجھے مت ٹوکو...... ریشماں کو اپنے بھائی سے بہت محبت تھی ...... وہ محبت کی دعویدار تھی۔

لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ محبت اکثر آزما لیتی ہے۔ بہت سی محبتوں کا تاوان زندگی دے کر ادا کرنا پڑتا ہے اور وہ تو بھائی بھابی کی محبت میں جان قربان کرنے پر تیار تھی اور جب محبت نے قربانی مانگی تو۔

☆......☆......☆

سفید لٹھے کے سوٹ میں ...... بڑی سی سفید چادر میں لپٹ کر دہلیز پار کرنے سے پہلے، چہرے پر پھیلتے آنسوؤں کو بے دردی سے رگڑتے ہوئے، اس نے پلٹ کر خاموش اداس کھڑے اپنے پیاروں کو دیکھا پھر گلاب کے پودے کی جڑ میں بنی اس تازہ قبر کو دیکھا۔

اس کی نظر اپنی کلائیوں پر جیسے ٹھہر سی گئی، کھلے دروازے سے نظر آتے ان گھنے درختوں کے درمیان اس کو کوئی سایہ لرزتا سا محسوس ہوا پھر کرخت چہرہ لیے اُن مرد اور عورتوں کو دیکھا جن کے ساتھ اس کو جانا تھا اور پھر دہلیز کے پار قدم رکھ دیا۔

☆......☆......☆

وہ جو سر جھکائے آٹے کے پیڑوں پر جمی پپڑی اتار کر جلدی جلدی روٹیاں توے پر سینک رہی تھی۔ اس کو معلوم نہیں تھا اس کے سیدھے سادھے شریف بے ضرر بھائی نے ایسا کیا کہا ہے کہ اس کی بھابی منہ پر ہاتھ رکھنے کے باوجود اپنی چیخ کو روک نہ سکی تھی۔

☆......☆......☆

لو آ گئی ڈائن ...... کمبخت ...... چڑیل ...... منحوس...... پچھل پیری قاتل کی بہن ...... میرا سہاگ چھین کر سہاگن بننے آئی ہے میں اس کو نہیں چھوڑوں گی اس کی بوٹی بوٹی کر کے چیل کوؤں کو کھلاؤں گی...... منحوس...... کتیا......

جیسے ہی اس نے نئی دہلیز پر قدم رکھا اندر سے ایک عورت دیوانہ وار بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے منہ پر پے در پے طمانچے مارتے ہوئے کہا کچھ اور عورتیں اور بچے بھی آ گئے وہ اس کو مار رہے تھے۔ نوچ رہے تھے اس کے بال ان کی مٹھیوں میں تھے وہ صحن میں گھسیٹ رہی تھی اس کی کلائیاں چھل گئی تھیں...... شدت ضبط نے اس کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔

اس کچے بڑے سے صحن میں بیٹھے، کھڑے سارے مرد اور عورتوں پر ایک جنون سوار تھا، ایک ماتمی اور انتقامی کیفیت ان پہ طاری تھی۔ کوئی اس کو گالیاں دے رہا تھا کوئی مار رہا تھا۔ کوئی اس

کے بال نوچ رہا تھا۔کوئی اس کے سر پر مٹی ڈال رہا تھا۔

وہ پیٹ رہی تھی وہ گالیاں، گھونسے اور لاتیں کھا رہی تھی اس کی آنکھیں خشک تھیں اس کے لب ایک دوسرے میں پیوست تھے وہ لوگ اس کو مار مار کر تھکنے لگے...... وہ دکھتے وجود کے ساتھ سر جھکائے زمیں پر بیٹھی رہی۔

اس کا خوش نصیبی کا دعویٰ رو رہا تھا۔

اور اس کا دل گلاب کے پودے کے پاس بنی قبر میں کہیں دفن ہو گیا تھا۔

تو نے قربانی دی...... تو فیصلہ سنا دیا۔ مجھ سے کیوں نہ پوچھا۔ کسی کا سوال اس کے اندر گونجا۔

اَخ تھو...... کسی نے اس کے منہ پر تھوکا اور وہ حقیقت میں واپس آگئی کہ اب کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔

اٹھ بدنصیب چڑیل کیا سیج پر جانے کا انتظار کر رہی ہے۔ کھڑی ہو تندور جلا سب کے لیے روٹی پکا ایک عورت نے اس کے پیٹ میں زوردار لات مارتے ہوئے اس کو اس گھر میں اس کی حیثیت ایک بار پھر یاد دلائی۔

چل بختاں میری بچی، اندر چل روٹی کھا اس عورت نے تھپڑوں سے استقبال کرنے والی بختاں کو پکارا اور اللہ دتہ تو کیوں بیٹھا ہے۔ چل اندر اس عورت نے ساٹھ سالہ مرد سے کہا جس کی نکاح کی ڈور میں بندھ کر وہ یہاں تک آئی تھی۔

☆......☆......☆

زندگی زندگی نہ رہی...... سانسوں کی آمدورفت کا نام زندگی تھا تو وہ زندہ تھی۔

اس گھر میں تین عورتیں ایک مرد تھا۔ بختاں کا میاں اس کے پیاروں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اور تاوان میں وہ آگئی۔ رشتے میں اب بختاں اس کی بہو لگتی تھی اس کا شوہر بختاں کا سسر تھا اور وہ اٹھارہ سالہ لڑکی بختاں کی ساس اور 60 سالہ اللہ دتہ کی بیوی بن گئی۔

اللہ دتہ کی پہلی بیوی بھی تھی...... سوکھی سڑی، ٹی بی کی مریضہ ہر وقت خون تھوکتی تھی۔

وہ سارا دن کولہو کے بیل کی طرح گھر کے کام کرتی بختاں کے بچوں کو سنبھالتی۔ ذلت سہتی گالیاں کھاتی، مار کھاتی اور رات کو اس کوٹھی میں جا سوتی جہاں سال بھر کا اناج رکھا ہوتا، جہاں گھر کا کاٹھ کباڑ رکھا تھا اور جہاں بڑے بڑے چوہے بھاگتے پھرتے...... وہ تاوان میں آئی ہوئی عورت تھی...... اور تاوان میں آئی ہوئی عورت کے پاس پیچھے دیکھنے کے لیے کچھ نہیں بچتا۔ اس کا ڈولہ اس کے گھر سے جنازہ کی طرح اٹھایا گیا اور جنازہ واپس گھروں کو نہیں جاتے اور وہ بھی پلٹ کر اپنے میکے نہیں گئی یا نہیں بھیجی گئی۔

کہتے ہیں جب مرد کو ضرورت پڑتی ہے تو وہ کچھ نہیں دیکھتا اور ایسے ہی کسی لمحے میں اللہ دتہ نے اس کی کوکھ میں اکبر ڈال دیا۔

اور پھر جیسے اس کی گھٹن زدہ زندگی میں سانس لینے کا جواز آگیا۔ وہ سارے دن کی تکلیفوں، ذلتوں اذیتوں اور شفقتوں کے بعد اکبر کی مسکراہٹوں میں سب کچھ بھول جاتی۔

اگر اس کو ہنسی آتی تو وہ اکبر کو بھی گدگداتی اور اگر اس کو رونا آتا تو وہ ننھے اکبر کے سینے میں منہ چھپا کر گھنٹوں آنسو بہاتی۔

ننھا اکبر جو تیزی سے عمر کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ اس کا سب کچھ تھا وہ اس کا دوست تھا ہمدرد تھا، بھائی تھا باپ تھا بیٹا تو تھا ہی۔

☆......☆......☆

رحم کریں چوہدری صاحب...... رحم کریں نعیم

پنچائیت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا تھا۔
کس بات کا رحم چوہدری...... جب میرے بیٹے کے پیٹ میں اس نے خنجر گھونپا تھا...... جب اس کو رحم نہیں آیا تھا...... نہیں اس گاؤں میں یہی ہوتا آیا ہے خون کے بدلے خون...... اس کو بھی مرنا ہوگا...... جس طرح میرا بیٹا مرا ہے پنچائیت کے بیچ اللہ دتہ کھڑا کسی بات کو سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔
دیکھ شبیرے کیوں الجھتا ہے میں اپنے کھیتوں کو اپنے حصے کا پانی دے رہا ہوں تو کیوں باتیں نکال رہا ہے نعیم نے جھنجھلا کر شیدے کو ٹوکا۔
آج اس کا فصل کو پانی دینے کا دن تھا اور بشیرا اس سے الجھ رہا تھا کہ وہ اس کے حصے کا پانی بھی استعمال کر رہا ہے...... بشیرا ایک بدمعاش فطرت مرد تھا اور نعیم سیدھا سادا اپنے کام سے کام رکھنے والا سیدھا دیہاتی تھا۔
شبیرے کو سب کو ڈرانا دھمکانا اچھا لگتا تھا، لیکن نعیم اس کے کسی معاملے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا، سو بشیرا اکثر اس کو تنگ کرتا تھا کبھی اس کے کھیتوں میں جانور چھوڑ دیتا کبھی رات کو اس کی فصل چرا لیتا، کبھی نہر میں شگاف ڈال لیتا۔ نعیم سب سمجھتا تھا لیکن خاموش رہتا وہ جانتا...... کہ بشیرا ایک بدنام زمانہ آدمی ہے۔
لیکن جب آج اس کو پانی دینے سے منع کیا تو نعیم خلاف معمول بگڑ گیا بشیرے کو امید نہیں تھی کہ نعیم اس سے الجھ سکتا ہے اس کو گالی دے سکتا ہے وہ غصے میں پاگل ہو گیا اور اس نے خنجر نکال کر نعیم پر حملہ کر دیا نعیم لاکھ شریف اور صلح جو تو تھا لیکن تھا تو مرد...... ایک مرد ایک صحتمند توانا مرد سو وہ بشیرے کے لیے آسان شکار ثابت نہ ہوا۔ اور اپنے آپ کو بچاتے بچاتے خنجر بشیرے کے پیٹ میں گھپ گیا اور ایک خنجر کو سیدھا دل پر لگا تھا بشیرے کو تڑپنے کا موقعہ بھی نہ ملا اور نعیم پھٹی پھٹی آنکھوں سے بشیرے کی تیزی سے ٹھنڈے ہوتے بدن کو دیکھتا رہ گیا۔
میں نے بشیرے کو نہیں مارا...... وہ اپنے آپ ہی وار سے مرا ہے میں تو صرف اپنے آپ کو بچا رہا تھا...... میں بے قصور ہوں آپ لوگ میری بات کیوں نہیں سن رہے۔ نعیم حال میں آتے ہی رو...... رو کر فریاد کرنے لگا۔
محمد نعیم کی آہ زاری اور اس کا کردار دیکھتے ہوئے پنچائیت کا یہ فیصلہ ہے کہ
اور جب پھر پنچائیت کے سرپنچ کے منہ سے نکلے الفاظوں نے جیسے نعیم اور اس کے خاندان کو زندہ دفن کر دیا۔
ہر چیز...... ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھر سی گئی۔

☆......☆......☆

ملجگے بال...... کسا کسا بدن اب ڈھیلا سا پڑ گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں ایسے ہو گئے تھے جیسے انگڑائی لینے کے بعد کوئی ڈھیلے چھوڑ دے لیکن اس کی آنکھیں...... ہاں اس کی آنکھیں ایسے ہی چمکتی تھیں کیونکہ ان آنکھوں میں...... اب اکبر تھا...... اکبر کی محبت تھی۔
جیون کے ایک جلد آنے والے موڑ پر اللہ دتہ بھی چلا گیا پھر اس کی سوکن بھی چلی گئی اور گھر خالی رہ گیا۔ ساری زندگی اس کے پاس کچھ نہیں رہا...... آنسو اور صرف آنسو جو رات کے اندھیرے میں اس کا تکیہ بھگوتے تھے جنہوں نے اس کے دل کو کھوکھلا کر دیا تھا لیکن اب اکبر کو شیر کی طرح جوان اور صحتمند دیکھ کر اس کے دل کو ایک عجیب سا اطمینان اور تقویت ملتی تھی۔

جب ریشماں نے اکبر کے کرتے کی جیب میں سرخ چوڑیاں دیکھیں تو اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی غم بھری ہنسی بکھر گئی۔

بہاریں آئیں پھر خزاں...... ہرے اور پیلے پتوں کی آنکھ مچولی صبح و شام کی طرح صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔

کبھی پیلی پوشاک ہری چادر میں لپٹی ہے تو کبھی سنہری شام سیاہ رات کی گود میں جا سوتی ہے۔

وہی بہار...... وہ ہی خزاں
وہی صبح...... وہ ہی شام
وہ ہی دن...... وہ ہی رات

زندگی کتنے روپ بدلتی ہے...... لیکن پیار...... اور پیار بھرے دل کبھی نہیں بدلتے۔

محبت کا پیغام دل ہے اور محبت اپنا مقام ڈھونڈ لیتی ہے۔ اور اب اکبر کا دل۔

زندگی کی ایک ضرورت یہ بھی ہے ریشماں کے لب پھڑ پھڑائے۔

اور پھر اس نے اکبر کی محبت کا مقام ڈھونڈ ہی لیا وہ اکبر کے دوست کی بہن تھی...... بتول...... سیدھی سادہ، سانولی سلونی سی بتول۔

ریشماں محبت کی کسک کو جانتی تھی۔

محبت کے گھاؤ کی طرح دل میں روز روتی ہے جس طرح عورت زندگی میں آنے والے سے پہلے مرد کو کبھی نہیں بھولتی اس طرح مرد بھی اپنی زندگی میں آنے والی پہلی عورت کو نہیں بھولتا بس پھر محبت کے ماروں کی پوری زندگی۔

مقابلوں اور موازنوں میں گزر جاتی تھی۔

اور ریشماں اس مقابلہ اور موازنہ والی زندگی سے اکبر کی زندگی کو داغ لگانا نہیں چاہتی تھی اور پھر وہ جھولی پھیلا کر بتول کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔

☆......☆......☆

گھر میں ایک عجیب سی یاسیت اور خاموشی طاری تھی لیکن ریشماں بہت خوش تھی خوشی اس کے انگ انگ سے چھلک رہی تھی وہ اپنے آپ سے باتیں کیے جا رہی تھی کبھی رو رہی تھی اور کبھی برسوں بعد بے ساختہ ہنس رہی تھی۔

کیسے منع کرتے ارے میرے اکبر جیسا کوئی شیر تو نکال دیں گاؤں بھر میں لمبا چوڑا سرخ سفید اور نام کا ہی اکبر نہیں ہے وہ اکبر ہے کون سا کام ہے جو وہ نہیں کرتا۔ گھر وہ سنبھالے، خط وہ پڑھے، فصل ایسی بھرپور اتارے۔

میرے بچے جیسا کوئی نہیں ...... بس جلدی سے گھر آ جائے تو اپنے ہاتھوں سے اس کا منہ میٹھا کروں۔

ریشماں بار بار دروازے پر جا کر جھانکتی اور پھر اپنے آپ سے باتیں کرتی پلٹ آتی۔

کتنا خوش تھی وہ...... ورنہ برسوں ہوئے وہ خوشی کا مفہوم تک بھول چکی تھی وہ خوش تھی کیونکہ برسوں بعد کسی کی محبت آباد ہونے جا رہی تھی...... وہ اکبر کے چہرے پر وہ خوشی دیکھنا چاہتی تھی جو اس کو نصیب میں نہ ہوئی تھی اور نصیب کس نے دیکھا ہے۔

☆......☆......☆

سنہری شام، گہری ہوئی۔ گہری شام رات میں ڈھلی، ہلکی سیاہ رات گہری رات میں بدلی اور گہری رات جب مزید گہری ہونے لگی تو وہ گھبرا گئی۔ پھر وہ مجیدے کے گھر چلی آئی...... ایک ہی تو دوست کا اس کے اکبر کا۔

اس نے بڑے سے صحن میں سوئے ہوئے مجیدے کو آوازیں دیں اور پھر جھنجھوڑ ڈالا۔

مجیدے نے کچھ بولنا چاہا لیکن اس کی زبان...... جیسے قوت گویائی سے محروم ہوگئی۔

اس نے بولنا چاہا لیکن لفظ اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔

ریشماں نے اس کو جھنجھوڑا اس کا گریبان پھاڑ ڈالا...... تو بولتا کیوں نہیں مجیدے میرا اکبر کہاں ہے میرا اکبر گھر کب آئے گا وہ چیخ رہی تھی۔

پھر مجیدے کے منہ سے نکلے لفظوں نے جیسے اس کو ایک دم بوڑھا کر دیا۔ اس کے کالے اور سفید بال روئی کی طرح سفید ہوگئے اس کی کمر جھک گئی اور اس کے ہاتھوں میں رعشہ آ گیا۔

☆......☆......☆

رات بھر وہ ایک سکتہ کی سی کیفیت میں رہی۔ اس کا اکبر بے وفا کیسے ہوسکتا ہے وہ تو اس سے محبت کرتا تھا۔

پھر اس کی نظر صحن میں بنے کچے باورچی خانے کے نعمت خانے میں رکھی اس چھری پر جم گئی جو گوشت کاٹنے کے کام آتی تھی۔

تارے ادھر ادھر ہوگئے ویسی ہی روشن صبح نمودار ہوئی جیسی اکبر کی پیدائش والے دن تھی رات بھر میں ریشماں ادھیڑ عمری کی دہلیز پار کر کے بوڑھی وہ گئی تھی۔

میں چین سے نہیں بیٹھوں گی وہ بڑبڑا رہی تھی اور باہر نکل گئی...... دن...... رات...... صبح شام کا چکر چلتا رہا بال مٹی میں اٹ گئے ایڑھیاں پھٹ گئیں۔ ہاتھ کھردرے ہوگئے وہ سیدھی مجیدے کے گھر گئی۔

وہ کہاں گیا تھا مجیدے...... اس کا وجود سراپا سوال تھا لوگ اس کی حالت دیکھ کر چہ مگوئیاں کر رہے تھے بتول زار وقطار رو رہی تھی کہ اکبر کو اگر شادی نہیں کرنی تھی تو مٹھائی کیوں بھیجی...... اور جو مٹھائی بھیجی تو اس رات کو شہر کیوں بھاگ گیا۔

ریشماں ہر ایک کا چہرہ پکڑ پکڑ کر غور سے دیکھتی...... ارے اکبر جیسا ہے لیکن اکبر تو نہیں۔

لوگ رحم کھا رہے تھے اکبر کو گالیاں دے رہے تھے۔

ماں نے زندگی بھر دکھ کی فصل کاٹی اور دیکھو پر نکلے تو اُڑ گیا۔

ریشماں کبھی بتول کو دیکھتی اور کبھی مجیدے کے پاس جا کر روتی لیکن گاؤں والوں کی بات کا جواب نہیں دیتی...... خاموش رہتی ریشماں سچ مچ دیوانی سی ہوگئی تھی...... لوگ اکبر کو کوستے۔

لیکن کس کو کیا معلوم تھا کہ ہر چہرہ میں وہ کس کا چہرہ کھوجتی تھی۔ وہ چہرہ......

☆......☆......☆

درختوں کی جھنڈ میں وہ چھپا کھڑا اس کو نظر آ ہی گیا اس کی سانسیں تیز ہوئیں اس نے جلدی سے کمر سے بندھا چاقو چیک کیا، کمر پر چاقو کی موجودگی نے اس کو اطمینان دلایا۔

چاچی وہ اب کبھی نہیں آئے گا چاچی وہ تو مر گیا۔ مجیدے...... اس کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

ہاں چاچی...... مجید الغیر رُکے' مشین کی طرح جذبات اور احساسات سے عاری زبان میں ایک خواب کی سی کیفیت میں بولے جا رہا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا حیدر کو یہ بات بہت بری لگی کہ اکبر نے اس کی بہن بتول سے محبت کی حیدر کو شکایت تھی کہ اکبر نے دوست ہو کر دوست کی بہن کو میلی نگاہ سے دیکھا۔

وہ اکبر کو مار رہا تھا۔ اکبر بار بار صفائی پیش کر رہا تھا کہ بتول...... ایک اچھی لڑکی ہے اور اس کی

اچھائی کی وجہ سے اس نے رشتہ بھیجا ہے لیکن حیدر ایک بات بھی سننے کو تیار نہیں تھا وہ اکبر کو مسلسل مار رہا تھا پھر اکبر بھی طیش میں آ گیا کبھی اکبر حیدر کو اٹھا کر پٹختا اور کبھی حیدر اکبر کو۔

میں جھاڑیوں میں چھپا سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن وہ دونوں اتنے غصے میں تھے کہ بیچ بچاؤ کراتے مجھے ڈر لگ رہا تھا میں بزدلوں کی طرح چپ چاپ سب دیکھتا رہا۔

پھر حیدر نے اکبر کے سر پر ڈنڈا دے مارا، اس کے سر سے خون کا فوارہ سا پھوٹ گیا اور پھر وہ چکرا کر گر گیا...... میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

اور پھر حیدر نے اکبر کو اٹھا کر ندی میں پھینک دیا میں نے دیکھا اکبر کی لاش ندی میں بہے جا رہی ہے لاش ڈوب رہی تھی کبھی ابھر رہی تھی اور پھر لاش غائب ہو گئی۔

چاچی اب اکبر کبھی نہیں آئے گا۔

میرا اکبر اب کبھی نہیں آئے گا ریشم کے سوکھے لب تھرتھرائے جس بیٹے کی جوانی دیکھنے کی آس میں اس نے جوانی بوڑھوں کی طرح گزار دی جو اس کی تکلیف دہ...... اکیلی دکھی زندگی کی واحد خوشی تھی وہ اکبر اب کبھی نہیں آئے گا۔

حیدر تو اس طرح کب تک چھپتا پھرے گا۔ ریلی مدھر دھیمی آواز سوچوں میں ڈوبتی آ اُبھرتی۔ ریشماں کو حقیقت میں کھینچ لائی اور پھر اس کی نظر حیدر کی چوڑی پشت سے ہوئی ہوئی 18 سالہ شہلا پر ٹک گئی۔

نازک پھولوں کی ڈالی کی طرح لچکتی۔ ریشم کی طرح نرم و نازک شہلا اس کی بچپن کی سہیلی فاطمہ کی چھوٹی بیٹی شہلا۔

☆......☆......☆

اختر...... اختر کا تو کچھ پتا ہی نہیں ہے پتا نہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا...... بس جس دن تیرے بھیا کا جنازہ اٹھا تھا اس دن لوگوں نے اس کو دیکھا تھا۔

بھیا مر گئے! ریشماں نے سسکی کو ہونٹوں میں دباتے ہوئے دھیمی لیکن رندھی ہوئی آواز میں ...... فاطمہ سے پوچھا۔

فاطمہ اس کی بچپن کی سہیلی اور اختر اور اس کی محبت کی رازدار اور گواہ تھی۔ تاوان میں بندھنے کے بعد ریشماں کبھی گاؤں واپس نہیں جا سکی لیکن فاطمہ بیاہ کر اس کے گاؤں میں چلی آئی۔ سو اس کو بھی تھوڑی سن گن اپنوں کی ملنے لگی اور آج ریشماں نے ہمت کر کے اختر کے بارے میں اس سے پوچھ ہی لیا۔

تیرا بھائی تو دو سال بعد ہی مر گیا تھا اس کو تیرا غم کھا گیا۔ ریشماں اختر بھی چارپائی پکڑ کر بہت رویا۔ وہ تو بس یہی کہتا جاتا تھا تجھے جلدی جانا تھا تو ہمیں کیوں زندہ درگور کیا۔ پھر اس کے دن کے بعد کبھی اختر نظر نہیں آیا۔

اس کو تیری محبت جونک کی طرح چمٹ گئی تھی۔ تیری محبت میں وہ دیوانہ تیری جدائی برداشت نہیں کر سکا۔ جب اس کی ماں نے اس پر بہت زور دیا کہ وہ شادی کر لے تو پھر سنا ہے ریل کی پٹری پر جا کر لیٹ گیا ہائے بدنصیب کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔

بھیا مر گیا...... اختر مر گیا...... میری زندگی ذلت کی ٹھوکروں میں گزری...... بوڑھا مرد ملا اور اس بوڑھے نے جوتی کی نوک پر رکھا...... نہ کبھی پیٹ بھر کر کھایا نہ کبھی نیند بھر کر سوئی...... جس گھر میں 25 سال گزار دیئے اس گھر میں پیر نہ پسار سکی۔

لفظ خوشی کیا ہوتا ہے
محبت اور اپنائیت کسے کہتے ہیں...... سب بھول گئی۔
تاوان میں دی گئی عورت ہمیشہ تاوان ہی ادا کرتی ہے۔ اور اکبر جو مجھے خیرات میں ملا تھا میری امید اور میری خوشی تھا اس کو اس نے مار ڈالا۔
میں اس کو ماردوں گی...... خیالات کی یلغار سے نکلتے ہوئے ریشماں نے کمر سے بندھا چاقو کھولا اور دبے پاؤں آگے بڑھی لیکن پھر ہوا میں اٹھا اس ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا۔
اور اس کا غصہ، اس کا جنون...... ان سرخ چوڑیوں اور ریشمی پراندے میں گم ہوگیا...... وہ سرخ چوڑیاں جو شہلا تیزی سے اپنی کلائیوں میں چڑھا رہی تھی حیدر محبت سے اس کو دیکھ رہا تھا۔
میں تمہاری کلائیوں میں کب چوڑیاں سجاؤں گا وہ سرگوشی میں پوچھ رہا تھا۔
شہلا نے ایک گہری نظر اس کی طرف دیکھا اس کے لبوں پر ایک مدھم مسکراہٹ رینگی اور اس نے شرماتے ہوئے کہا شادی کے بعد۔
اور پھر ریشماں کو ایسا لگا، ساری دنیا گھوم رہی ہو۔ وہ پھر سے ریشم بن گئی اس کے سفید بال سیاہ لمبے اور گھنیرے ہوگئے جسم تن گیا آنکھیں خمار آلود ہوگئیں۔
وہ بیس سال کی ریشم بن گئی۔ جس کی کلائیوں میں محبوب کی محبت کھنک رہی تھی اور جس کی آنکھوں میں محبت جگمگا رہی تھی اور اس کا دل کر رہا تھا......
یہیں سے ان ہی درختوں کے جھنڈ میں سے اختر کے سینے میں منہ چھپا کر کہے اختر بس شادی کرلے۔ جلدی ہی شادی کرلے۔ چاقو اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا حیدر پلٹا، اس کو دیکھا واس کی گھگھی بندھ گئی۔
سارا گاؤں ریشماں کو چاچی پگلی کہتا اور سمجھتا تھا لیکن حیدر تو جانتا تھا نہ وہ پگلی ہے اور نہ ہی اکبر اس کو چھوڑ کر شہر بھاگا ہے۔
ریشماں نے ایک نظر خوفزدہ کھڑے حیدر کو دیکھا اور دوسری نظر زمین پر پڑے چاقو کو دیکھا۔ جس کو روز دھار لگاتی تھی۔
پھر مستحکم لہجے میں بولی۔
محبت کے صدقے میں نے تجھے معاف کیا...... جا محبت کر...... شادی کر اس کی کلائیوں میں سرخ چوڑیاں سجا اور اس کے بالوں میں ریشم کے پھولوں والا پراندہ ڈال۔
اس کو ریشماں نہ بننے دینا کیونکہ اس صدی میں بس ایک ہی ریشماں ہوگی...... جا چلا جا...... اس نے چاقو دریا میں بہایا اور جاتے جاتے پلٹ کر بولی۔
اب کسی عورت کا دل نہیں ٹوٹنا چاہیے کیونکہ جب عورت کا دل ٹوٹتا ہے تو اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہتا وہ بے کفن لاش بن جاتی ہے۔ ایسی لاش جس کو کوئی دفناتا ہے...... کوئی جلاتا ہے اور کوئی گدھوں کے آگے ڈال دیتا ہے واپس جاتی پگلی کے اندر برسوں سے دفن ریشماں روتے ہوئے بولی۔
آج نفرت...... غصہ اور انتقام کی جنگ میں ایک عورت جیت گئی تھی۔ حیدر اور شہلا برستی آنکھوں اور پتھر بنے ہوئے وجود کے ساتھ وجود سے نقطہ بنتی اس عورت کو دیکھ رہے تھے جو واقعی عورت تھی جو عورت کہلائے جانے کے قابل عورت تھی۔

سچی کہانیاں ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

- ......پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے، جس کا گزشتہ اکتیس برس سے چار نسلیں مسلسل مطالعہ کررہی ہیں۔
- ......اِس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔
- ......اِس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔
- ......پوری دنیا میں پھیلے، اِس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔
- ......اِس لیے کہ سچی کہانیاں ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔
- ......جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔
- ......اِس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں، جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔
- ......آپ کی مصنوعات کے اشتہار با کفایت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔
- ......جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔

شعبہ اشتہارات: سچی کہانیاں

II 88-C ۔فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

خوبصورت جذبوں سے متعارف کراتی تحریر کی پہلی قسط

سورج کی تیز کرن چہرے سے ٹکرائی تو اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ درید عباس حسب معمول ونڈو سے پردہ ہٹا کر گیا تھا تاکہ سورج کی تیز شعاعیں جیسے ہی ونڈو سے اندر داخل ہوں تو وہ فوراً ہی جاگ جائے۔ یہ واحد طریقہ تھا اس کو جگانے کا......

کسلمندی سے اس نے خود پر سے کمبل ہٹایا تھا اور ذہنی طور پر خود کو بستر چھوڑنے کے لیے تیار کیا۔

بمشکل نیند چھوڑ کر انگڑائیاں لیتا وہ کھڑکی تک آیا تھا۔

روشن صبح مسکرا کر اسے ویلکم کہہ رہی تھی۔ مگر سویرے ہی دھوپ کی شدت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ آج سورج کا موڈ صبح سے ہی خاصا خراب ہے۔ مگر اس کے باوجود سڑک پر ہر طرف گہما گہمی تھی معمول کی زندگی روز کی طرح شروع ہوگئی چکی تھی۔ کھڑکی کے پردے برابر کرتا وہ واش روم میں گھس گیا۔

باتھ لے کر اس کی ساری سستی ہوا ہوگئی تھی اور وہ بہت فریش موڈ میں کمرے سے باہر نکلا۔ مگر یہاں صرف سناٹا تھا ویران پڑا ڈائننگ ٹیبل اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

تقریباً گھنٹہ پہلے یہاں کس قدر دھما چوکڑی مچی ہوگی، یہ سوچ کر خود بخود دھیمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھوگئی۔

گھر میں جب وہ سارے ہوں تو زندگی کتنی خوشگوار لگتی ہے۔ عبدل اور نہال ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ، بلال کا انہیں سمجھانا اور کبھی سخت جھنجھلا کر انہیں پیٹنا۔'' درید عباس کی ناشتے کے لیے بھاگ دوڑ، اور ٹیبل سجا کر اپنے مخصوص اسٹائل میں سب کو بریک فاسٹ کے لیے بلانا...... وہ چاروں صبح میں جلدی میں ہوتے تھے۔'' نہال اور طلال کو کالج کی اور درید کو اپنی جاب کی، بس وہ کاہلی مارا تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا آفس لیٹ ہی تھا۔ لیکن اگر وہ کبھی کبھار جلدی جاگ جاتا (غلطی سے) یا فجر کے بعد سوتا ہی نہیں تھا تو ان چاروں کی نظریں ہی اسے گاڑ دیتیں۔ حیرت سے مربعوں میں پھیلی آنکھیں دیکھ کر وہ خود پر ہزار بار لعنت بھیجتا کہ وہ جلدی اٹھ کر آیا ہی کیوں تھا۔

ناشتے کے نام پر چائے کی طلب نے اسے کچن کی طرف رُخ کرنے پر مجبور کیا تھا مگر پہلا قدم کچن میں رکھتے ہی اس کا دل گھبرانے لگا۔

''اف تو یہ آج درید پر کون سا جنون سوار تھا۔''

کچن کی ابتر حالت دیکھ کر اس کی نفاست پسند طبیعت بوجھل ہونے لگی۔ برتن یوں سارے کچن میں پھیلے ہوئے تھے گویا ان میں جنگ عظیم ہوئی ہو۔ چائے بنانے والا ساس پین چولہے پر یونہی کھلا پڑا تھا۔ مکھیوں کو خوب عیاشی کا موقعہ ملا تھا۔ یا انہیں یہ گولڈن چانس خود فراہم کیا گیا تھا۔ جو بھی ہو مگر اس کے لیے وہاں رکنا ناممکن ہوگیا تو وہ لاؤنج میں آ کر صوفے میں دھنس گیا۔ ٹیبل سے نیوز پیپر اٹھا کر دیکھنے لگا پھر کچھ دیر بعد اماں بی آ گئیں (کام والی ماسی) تو اسے چائے پینے کی کچھ امید نظر آئی تھی۔

''السلام وعلیکم اماں بی۔''

ان کی عمر کے باعث وہ سب انہیں احترام سے پکارتے تھے۔

''وعلیکم السلام پتر۔''

انہوں نے خوش دلی سے جواب دیا پھر بغور اس کا جائزہ لیا۔

''کی گل...... تھکا تھکا لگ رہا ہے۔''

''نہیں بس آج صبح کی چائے نہیں پی۔''

''میں بناداں پتر۔''

''اماں بی چائے تو میں بنالوں گا مگر پلیز آپ کچن سمیٹ دیں۔''

''اچھا...... فیر چائے بناداں۔''

''ہوں۔''

اس نے مختصر سا جواب دیا ایک تو وہ کم گو تھا دوسرا اماں بی بولنے کی شوقین تھیں۔ اماں بی نے اس کی توجہ اخبار پر دیکھی تو وہاں سے ہٹ گئیں۔

''ہوگئی تیری سویر۔''

درید عباس کی آواز پر وہ بے طرح چونکا۔ اخبار

چھوڑ کر اسے دیکھا جو قطعی رف حلیے میں اس کے سامنے سنگل صوفے پر آ کر گر سا گیا تھا۔

''تو گھر پر ہے۔''

اس کی آواز میں تازگی نہ تھی نہ چہرے پر روز والا فریش لک۔ بکھرے الجھے بے ترتیب سیاہ گھنے بال، ہلکا ہلکا سرخ ہوتا چہرہ، آنکھوں میں سرخی سی جھلک رہی تھی۔ سیلولیس ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں وہ بالکل ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔

''آر یو اوکے۔''

''ہاں بس رات سے ٹمپریچر ہے۔ صبح بیچارے بلال کو بھی اکیلے ہی سب ہینڈل کرنا پڑا ہوگا۔ اپنے بخار سے زیادہ فکر بلال کے ڈبل مشقت کی تھی اور بنا کسی رشتے کے وہ ایک محبت ہی تو اسے اٹریکٹ کرتی تھی...... بنا کسی تعلق کسی رشتے کہ وہ ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتے تھے اتنا خیال رکھتے تھے۔ اب تو وہ بھی ان میں شامل ہونے لگا تھا۔

''میڈیسن لی تو نے۔''

''رات لایا تو تھا، مگر ابھی تک خاص اثر نہ ہوا۔''

''میں اماں بی سے تمہارے لیے ناشتہ کا کہہ آؤں۔''

وہ اٹھ کر کچن میں گیا اور انہیں ناشتے کا کہہ کر آیا تو درید کے نقاہت سے بھرپور چہرے پہ نظر ڈالی تھی۔

''درید عباس موسم چینج ہو رہا ہے۔ اس میں لا پرواہی یوں ہی مہنگی پڑتی ہے۔ مانا کہ سردی نہیں رہی مگر گرمی بھی نہیں آئی کہ تم کپڑوں سے باہر ہو جاؤ۔'' اس نے درید کی ڈریسنگ پر تنقید کی تھی۔ درید مسکرا دیا۔

''بخار کی حدت اتنی زیادہ ہے کہ مجھے گرمی محسوس ہو رہی ہے۔''

''ہونے دو۔'' تم بریک فاسٹ کے بعد میڈیسن لو اور حلیہ درست کرو اپنا۔ درید اس کی نفاست پسند نیچر سے واقف تھا۔

''تیرے آنے سے کنوار پن کا احساس کم ہو گیا ہے۔''

بخار کے باوجود وہ باز نہ آیا اس پر حملہ کرنے سے جواباً اس نے گھورا تھا۔

''شٹ اپ......''

اس نے آنکھیں دکھائیں تو دل تھام کر تڑپنے کی بھرپور ایکٹنگ کرنے لگا۔

''جان من کیوں قتل کرنے کی ٹھانی ہے، ہم تو ویسے ہی مرمٹے ہیں ان سنہری کانچ سی آنکھوں پر۔''

اس نے دھائی دی تھی مگر وہ جانے کیوں لب بھینچ گیا۔ ''سنہری کانچ سی آنکھیں۔'' یہ بات اس کے کتنے ہی زخم ہرے کر گیا۔

☆......☆......☆

فلک تک چل ساتھ میرے
فلک تک چل ساتھ چل
یہ بادل کی چادر، یہ تاروں کے آنچل میں
چھپ جائیں ہم پل دو پل......!!
فلک تک......

''او کے یار...... چل جہاں لے جانا ہے لے چل ورنہ تو یوں ہی میرا سر کھائے گا۔''

نہال اٹھ کر پاؤں میں یوں چپل ڈالنے لگا جیسے واقعی طلال اس سے مخاطب ہو۔

''پر پہلے یہ بتا فلک کون ہے؟ تیری کوئی نئی ''غلط فرینڈ'' تو نہیں۔''

سارے جہاں کی معصومیت اپنے چہرے پر سجائے وہ طلال کے فیورٹ سانگ اور اس کے اچھے موڈ کا بیڑا غرق کر چکا تھا۔ جبکہ لیپ ٹاپ پہ

انگلیاں چلاتے درید نے بمشکل اپنے امڈنے والے قہقہے روکا تھا۔ بلال تو ناکام ہو کر منہ پھاڑ بیٹھا تھا۔

''واہ اب کیسے دانت دکھا رہے ہیں۔ جیسے کولگیٹ والوں نے آپ کو پیسے دے کر فرمائش کی ہو۔ اور اگر میں اسے کچھ کہہ دیتا تو آپ اپنا برسوں پرانا نو نمبر کا جوتا لے کر میرے پیچھے پڑ جاتے۔''

طلال نے بنا لحاظ رکھے لگی لپٹی رکھے بنا بلال کو پکڑا تھا۔

''یار وہ نا سمجھ ہے، چھوٹا ہے تجھ سے۔''

''نا سمجھ صرف آپ کی نظر میں ہے یہ، میرا تو کا دشمن بن بیٹھا ہے۔ مجال ہے جو کسی بھی لڑکی کو میری طرف متوجہ ہونے دے۔''

''معصوم اور پیارا جو وہ اتنا ہے۔''

''جانے کیوں جھوٹ بولنے والوں پر اللہ کا عذاب اسی وقت نازل نہیں ہوتا۔'' طلال تڑپ کر بولا تھا۔

''پیارا وپارا نہیں ہے یہ لڑکیاں دیکھ کر اکثے کمار کی طرح چھچھور پن پر اتر جاتا ہے۔''

''اور تو جیسے بہن جی بنا کر انہیں گھمانے لے جاتا ہے۔''

اس بار نہال نے خود جواب دیا تھا۔

''تو میرے منہ نہ لگ۔''

طلال نے اسے دھمکی دی۔

'میرا مرنے کا کوئی ارادہ ایسا ہے بھی نہیں کہ تیرے منہ لگوں جس پر دنیا کا ہر ماؤتھ واش ناکام ہو چکا ہے۔

نہال دو انگلیوں سے اپنی ناک دبا کر یوں منہ بنایا گویا ابھی مرے گا۔ بس یہاں طلال کی برداشت بھی جواب دے گئی اور اس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اٹھ کر نہال کی ''منڈی'' دبوچ لی اور اسے اچھی طرح دھو ہی ڈالا تھا۔ بلال اور درید اس اچانک حملے پر پہلے ہراساں ہوئے پھر بیچ بچاؤ کرنے لگے۔''

''قسم اللہ پاک کی میں روز کے ان جھگڑوں سے تنگ آ گیا ہوں۔''

انہیں بمشکل چھڑا کر بلال نے پھولی سانسوں سے دل تھام کر کہا۔

''اگر آپ انصاف سے کام لیں ہم دونوں میں تو یہ نوبت ہی نہ آئے مگر آپ نے ہمیشہ اسے بے جا سپورٹ کیا ہے۔''

صوفے پر بیٹھا طلال مڑے ہوئے مرغے کی طرح ناک پھلائے بولا تھا جبکہ نہال کو درید کمرے میں پھینک آیا تھا۔

''مجھے تجھ سے دشمنی جو ہے۔''

بلال نے کھا جانے والے انداز میں کہا۔

محض ایک سال چھوٹا ہے۔ وہ مجھ سے مگر آپ یوں ہی بی ہیو کرتے ہیں گویا وہ مجھ سے صدیوں چھوٹا ہو۔ ''کاکا'' بنا کے رکھا ہوا ہے۔''

طلال آج سارا حساب کلیئر کرنے کے موڈ میں تھا۔

''طلال بس کر دے یار۔ اس نے صرف مذاق ہی تو کیا تھا ناں۔' اور تم اس کی ٹکور بھی دل لگا کر کر دی پھر بھی تیرا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔'' اب بے وجہ ہی بڑے بھائی سے الجھ رہا ہے۔ چل دفعہ کر جا کے کر انجوائے اپنا میوزک، درید نے اس کے بکھرے جنگلی چوہے کی طرح کھڑے بال درست کیے تھے۔ طلال پیر پٹختا جلاتا باہر چلا گیا۔

''اب تم بھی اٹھ کر اپنے دھندے لگو۔ کیا آٹھ بچوں کی ماں کی طرح دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا ہے۔''

درید کی مثالیں ہمیشہ ہی نرالی ہوتی تھیں بلال سارا ذہنی دباؤ بھول کر اسے گھورنے لگا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ میرے نصیب میں اپنا ایک بچہ بھی ہوگا۔ دونوں مجھے کنوارہ ہی مار کر دم لیں گے۔''

''تو مجھ پر کاہے گھوریاں مار رہا ہے سارا قصور تمہارے ابا جی کی رومانٹک نیچر کا ہے۔''

درید کی بے غیرتی پر بلال اچھل پڑا تھا اور لاؤنج میں انٹر ہوتا اسفند چاہ کر بھی اپنی مسکراہٹ نہ روک پایا تھا۔

''کمینے، بے غیرت، بے شرم۔''

بلال نے صوفے پر دھرے سارے کشن ایک ایک کر کے اسے مارے تھے مگر وہ بھی ڈھیٹ تھا۔ دانت نکالتا رہا۔ بلال ہار کر دل ہلکا کر کے صوفے پر لیٹ گیا اور انگلیوں سے کنپٹی کو دبانے لگا۔

''بائی دے وے بلال میرے ذہن میں ایک انٹرسٹنگ خیال آیا ہے اگر کہے تو تجھ سے شیئر کروں۔''

تیرے گھٹیا ذہن میں صرف بے ہودہ خیال آ سکتے ہیں دفع کرو۔''

''درید بھیا بتائیں تو۔''

نہال کمرے سے نکل کر پھر سے وہیں آ بیٹھا تھا۔''

''اچھا اب تو اتنا کہہ رہا ہے تو خیال یہ تھا کہ اگر تمہارا ایک اور بھائی ہوتا تو اس کا نام کیا ہوتا۔ جمال، بلال، طلال، نہال کے بعد ایسا کوئی ہم قافیہ نام بچتا ہے۔''

آپ کے ذہن میں ہے!!''

''ہے تو۔!!''

بمشکل لب سے مسکراہٹ روک رکھی تھی

اسفند نے سر ہلایا کہ باز آ جاؤ۔

''کیا......!''

صرف نہال نہیں بلکہ انجان بنے بلال کا ذہن بھی ادھر ہی تھا۔

''وہاں احمد......''

اسفند اس بار اپنی ہنسی نہ روک سکا تھا جبکہ بلال خطرناک تیور لیے اٹھنے کو تیار تھا۔

''شکر کرو تمہارے ابا جی کا موڈ بدل گیا ورنہ......''

درید کو بات مکمل کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا بلال نے آ کر اس پر جو چڑھائی کی کہ اسفند بھی دنگ رہ گیا۔''

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ ہنسے یا بلال سے درید کو بچائے۔''

☆......☆......☆

آفس سے گھر لوٹا تو شدید سناٹے سے استقبال کیا تھا اس کا۔ پہلے وہ قدرے فکر مند ہوا مگر لاؤنج میں بیٹھ کر ذہن کو ریلیکس کیا تو یاد آیا کہ آج فرائی ڈے ہے اور ظاہر ہے وہ تینوں بھائی ویک اینڈ گزارنے گاؤں چلے گئے ہوں گے مگر درید...... وہ لگتا ہے آج اب تک نہیں لوٹا۔ اسفند نے خود ہی اندازہ لگایا تھا مگر گھر لاکڈ تو نہیں تھا!! اس کا مطلب درید گھر پر ہے وہ اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ فریش ہو کر فریج چیک کیا سوائے جوس کے اور کوئی قابل قبول چیز نہیں لگی۔ اس نے جگ نکالا اور دو گلاس اٹھا کر چھت پر آ گیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ درید وہیں ہوگا۔

''گڈ ایوننگ۔''

وہ درید کے ساتھ والی چیئر سنبھال کے بیٹھا تھا۔ گلاس اور جگ ساتھ رکھے ہوئے چھوٹے سے ٹیبل پر رکھ دیے۔ خلاف معمول درید بہت چپ تھا۔

''اینی پرابلم۔''

''ہوں۔''

وہ پہلے چونکا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ اسفند سمجھ گیا کہ آج پھر اس پر اداسی کا دورہ پڑا ہے۔ ریز روتو نہیں رہتا تھا ہاں کبھی کبھی اداس کا دورہ پڑتا تھا۔

''لے جوس پی لے۔''

گلاس بھر کے اس کے سامنے کیا اس نے خاموشی سے تھام لیا۔

''امی کا فون آیا تھا۔''

اکثر یہ خاموشی اسی دن ہوتی تھی جب اس کے گھر سے فون آتا تھا۔ درید نے محض سر ہلایا تھا۔''

بات تو عجیب تھی مگر سچ کہ درید عباس کے من میں محبت کا دکھ بہت گہرا تھا مگر اس نے اسفند کی طرح اپنی ذات گم نہیں کی تھی۔ بھرپور طریقے سے جیتا تھا لیکن کبھی کبھی دکھ شدت اختیار کر لیتا تو!!''

اس کے دکھ کو اسفند ضیاء نے دل کی تمام شدتوں سے محسوس کیا تھا۔ تبھی اس کا کندھا تھپک کر وہاں سے ہٹ گیا تھا۔''

وہ تمام کیفیات سب سے چھپا کر رکھتا تھا۔ یا شاید اس نے اپنا درد اکیلے سہنا سیکھ لیا تھا۔ اگلے دن درید کا موڈ ٹھیک ہو گیا مگر وہ بہت زیادہ چپ تھا۔ رات بھر وہ کس قدر بے چین رہتا تھا درید واقف تھا اس نے آج تک ایسی کوئی رات نہیں دیکھی تھی کہ جس میں اسفند نے سکون پایا ہو۔''

ہاں فجر کی نماز کے بعد کچھ دیر وہ سوتا تھا اور اس پر درید ٹوک دیتا تھا کہ یہ نحوست نہ پھیلایا کر۔''

وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اسفند کے اندر کیا ہے مگر دکھ یہ تو طے تھا کہ کوئی ایسا زخم ہے جو اس کے اندر ہرا ہے۔''

''کون سا روگ لگا بیٹھا ہے خود کو کہ زندگی یوں بوجھ کی طرح گزار رہا ہے۔''

وہ چپ نہ رہ سکا۔ حالانکہ کتنے ماہ ہو گئے تھے اسفند کو یہاں آئے اس نے اپنے اور ان سب کے درمیان ایک فاصلہ قائم رکھا ہوا تھا جسے وہ کبھی نہیں ختم کر پائے تھے۔'' مگر آج درید کو جانے کیا سوجھی تھی۔

''تجھے ہی لگتا ہے......ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''تیری چپ کے پیچھے راز ہے اسفند ضیاء''

ضروری ہے کہ خاموشی پر اسرار ہی ہو یہ میرے مزاج کا حصہ بھی تو ہو سکتی ہے۔''

''یو نو اسفند ضیاء میں تجھے بہت زیادہ تو نہیں جانتا ہاں یہ بات دعوئی سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ خاموشی تیرے مزاج کا حصہ نہیں جو تو نے خود پر طاری کر لی ہے۔''

''ایسا ہے بھی تو، کیا کرے گا جان کر۔''

''صرف تیرے من کے لگے قفل کھولنا چاہتا ہوں۔ تاکہ تم زندگی کو اللہ پاک کی خوبصورت نعمت سمجھ کر جیو۔'

'' کیوں چاہتا ہے تو ایسا، کیا رشتہ ہے تیرا میرا۔''

''رشتے تو من کے احساس سے بنتے ہیں تیرا دل مانے تو رشتہ بہت گہرا ہے اور نہ مانے تو کچھ بھی نہیں۔''

''میری تو اپنی ذات پر کچھ بھی نہیں کا لیبل ہے درید نہ کوئی میرا ہے اور نہ میں کسی کے لیے کچھ ہوں۔''

'' یہ تیری سوچ ہے اسفند، ورنہ ہم نے کبھی تجھے خود سے الگ نہیں جانا تبھی تو جاننا چاہتا ہوں کہ تیرے من کو کون سا روگ لگ گیا ہے۔'

''ایک بار پھر بکھر جاؤں گا، بہت مشکل سے سمیٹ پایا ہوں خود کو۔''

اس کی سنہری کانچ سی آنکھوں میں سرخی نمایاں ہونے لگی۔''

'' تجھے لگتا ہے کہ درید عباس تجھے بکھرنے دے گا۔''

اس نے اسفند کے چہرے پر نظریں جما کر کہا

تھا۔

حالانکہ وہ تو صرف اپنی ذات میں بند رہتا تھا
مگر آج درید کے سامنے ہار سا گیا۔"
منسوب تھے جو لوگ میری زندگی کے ساتھ
اکثر ملے وہ بھی بڑی بے رخی کے ساتھ
درید کی نگاہیں اس کے رنجیدہ چہرے پر گڑ کر رہ گئیں جس کی آنکھوں میں درد نمایاں ہونے لگا تھا۔ اور لب ہولے ہولے ہل رہے تھے۔

☆......☆......☆

اس کا تعلق بھی میڈیا سے تھا ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا فوٹوگرافر بھی تھا۔ اپنے پروفیشن کے باعث اس کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ جن میں میل فیمیلز سب ہی شامل تھے۔ یوں بھی یہ فیلڈ ایسی وسیع تھی کہ وہ قسم نہیں کھا سکتا تھا کہ اس کی کسی لڑکی سے دوستی نہیں ہے۔ اس کے فرینڈز میں لڑکیوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔

بائی نیچر وہ بہت فرینڈلی تھا۔ کچھ وجاہت بھی وہ کمال رکھتا تھا کہ لڑکیاں خود ہی اس کی طرف متوجہ ہو جاتیں تھیں۔ اس کے چہرے پر سنہرے کانچ سی شوخیاں اور ہر دم مسکراتی دوسروں کو اپنا گرویدہ کر لیتی تھیں۔ ہاں یہ بھی سچ تھا کہ فرینڈز بہت تھیں مگر گرل فرینڈ والا پورشن ابھی تک خالی تھا۔

اس نے تقریباً تنہا عمر گزاری تھی۔ ماں باپ سالوں پہلے چل بسے تھے اور بہن بھائی کوئی نہیں تھا۔ مگر اس نے اکیلے پن کو کبھی خود پر طاری نہیں کیا تھا اور لائف کو بہت مزے سے گزار رہا تھا۔

دن کا بیشتر حصہ وہ باہر سے گزارتا تھا۔ اور فارغ ہوتو فرینڈز کے ساتھ گیدرنگ میں ٹائم پاس کرتا۔ بہت من موجی سا بندہ تھا وہ کبھی اپنے کسی اپارٹمنٹ پر سب فرینڈز کو بلا لیتا۔ خوب ہلہ گلہ ہوتا اور خوب ڈرنک چلتی۔ اور بس اس کی خامیوں میں سب سے بڑی خامی یہ ہی تھی کہ وہ ڈرنک کرتا تھا۔ اس کے کسی فرینڈز کو اعتراض نہ تھا کیونکہ وہ خود اس کے ساتھ بیٹھ کر پیتے تھے مگر اس کا کلوز فرینڈ سعد رسول اسے اکثر ٹوکتا تھا۔ اور وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتا تھا کبھی کبھار فرینڈز کے ساتھ نائٹ کلب میں وہ ضرورت سے زیادہ ڈرنک کر لیتا تو سعد ہی اسے گھر چھوڑتا تھا۔

آج بھی اس کے دوست کی برتھ ڈے پارٹی تھی۔ اور اسی لیے وہ جلدی گھر آیا تھا ابھی وہ باتھ سے نکلا ہی تھا کہ اس کے سیل پر بیپ ہوئی وہ تولیے سے بال رگڑتا وہ موبائل اٹھا کر چیک کرنے لگا۔ اور ریس کا بٹن پش کر کے کان سے لگایا تھا۔

"ہیلو۔"

"گڈ ایوننگ ڈیئر کہاں تھے تم؟ کب سے کال کر رہی ہوں۔"

اس نے شدید حیرت سے موبائل کان سے ہٹا کر دیکھا۔ اس کی حیرت کی وجہ وہ دوسری طرف سے نسوانی آواز نہیں بلکہ قطعی انجانی آواز اس پر بے تکلف لہجہ تھا۔

"سوری میں آپ کو پہچان نہیں پایا۔"

"نیور مائنڈ۔"

دوسری طرف بے نیازی سے کھلکھلاتے لہجے میں کہا گیا تھا۔

"آپ کون ہیں......؟"

بے بی اس کا ذہن کام نہ کر رہا ہو اور وہ پہلے مل چکے ہوں تبھی اس نے لہجے میں سختی نہیں آنے دی۔

"مائی نیم از عینی۔ عینی کنول۔"

اس نے پوری طرح ذہن پر زور دیا تھا مگر اس کے حلقہ احباب میں یہ نام قطعی شامل نہیں تھا۔

"دس از رانگ نمبر ایم سوری۔"

''سو واٹ۔ رانگ نمبر کو رائٹ بننے میں کتنی دیر لگتی ہے مسٹر......''

''واٹ ڈو یو میں۔''

''سیدھا سا۔ فرینڈ شپ کرنا چاہتی ہوں تم سے۔''

''میڈم میں اتنا فارغ بندہ نہیں ہوں۔ کہیں اور ٹرائی کرو۔''

وہ چڑ سا گیا۔ اور لائن کاٹ کر تیاری کرنے لگا۔ کیونکہ اسے اپنے بالوں سے بہت پیار تھا اور وہ جانتا تھا کہ لیٹ ہونے پر اس کے فرینڈز نے گنجا کر دینا تھا اسے۔''

لیٹ نائٹ وہ گھر پہنچا تھا۔ کچھ ڈرنک بھی زیادہ ہی کر لی تھی۔ بیڈ پر گرتے ہی ہوش نہ رہا اور صبح دیر سے آنکھ کھلی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ اب ہر کام میں افراتفری کر رہا تھا۔ ناشتا بنا کر ٹیبل پر رکھا تھا اور فریج سے جوس لے کر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ سیل چیخنا شروع ہو گیا۔

اس نے بنا دیکھے مصروف انداز میں کال ریسو کی تھی۔

''گڈ مارننگ ڈیئر۔''

گاڈ۔ اس کے ذہن سے تو لہجہ اور رانگ نمبر سب محو ہو چکے تھے کہ سویرے ہی پھر۔''

''فار گاڈ سیک۔ آپ جو بھی ہیں میں قطعی آپ کے ٹائپ کا بندہ نہیں ہوں۔ مجھے تنگ کرنا بند کر دو۔''

''بٹ آئی تھنک آپ میرے لیے مسٹر رائٹ ہیں۔''

''یو آر میڈ۔''

''آف کورس بٹ صرف تمہارے لیے۔''

''او گاڈ......''

اس کا من چاہا سر پیٹ لے اپنا۔

''آئی تھنک یو آر بزی میں رات میں کال کروں گی بٹ آپ کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔''

کیا ڈھیٹ لڑکی تھی۔ اپنی کہہ کر فون بند کر گئی لیکن اس وقت اس کے پاس ٹائم نہیں تھا ان فضول باتوں کو سوچنے کا۔

☆......☆......☆

''کیا بات ہے جانِ من آج ان قاتل نگاہوں میں مسکراہٹ کی جگہ الجھن نظر آ رہی ہے۔'' خمار کی جگہ پریشانی دکھائی دے رہی ہے۔

اس نے سعد رسول کی بے وقت شاعری پر اسے گھورا تھا۔''

''سب کچھ نظر آ رہا ہے وہ نیند نہیں دکھائی دے رہی جو تیرے باعث پوری نہیں ہوئی۔''

''میرے باعث۔''

سعد نے حیرت سے دیکھا۔

''یوں کہے مسٹر اسٹیفن جوزف آپ کو شباب اور شراب نے مدہوش کر دیا تھا۔ ڈانس کرتے ہوئے وقت کا اندازہ نہ رہا۔''

سعد نے آئینہ دکھایا تو وہ آنکھ دبا کہ ہنس دیا۔

''ویسے بہت مزہ آیا تھا ناں......''

''ہاں جی جن کے آگے پیچھے دوشیزائیں مچھر مکھیوں کی طرح بھنبھناتی ہوں مزہ انہیں ہی آ سکتا ہے۔

''چچ چچ۔ تو تو جیسے تسبیح کے دانے گن رہا تھا وہاں۔ پتلی کمر پر تو میں پھسل رہا تھا ناں۔''

اسٹیفن نے رات کی چوری پکڑ لی تھی اس کی سعد منہ پھاڑ کے ہنس دیا۔

''بائی دے وے آج نشا سرمد سے میٹنگ تھی تیری۔''

سعد نے سنجیدہ ہوتے ہوئے یاد دلایا تو اس کے خوشگوار موڈ کا بیڑا غرق ہو گیا۔

''تو چلا جا...... یار مجھے بڑی چڑ آتی ہے اس

سے۔ چھپکلی کی طرح چپکنے کے چکر میں رہتی ہے یار۔
''آئی ڈونٹ کیئر اور یونو مجھے نفرت ہے اس طرح کی گرلز سے۔''
''یونو اسٹیفن اس وقت وہ بیسٹ ماڈل ہے پاکستان کی۔''
''سو واٹ سعد...... مجھے اپنا نام بنانے کے لیے ایسی سیڑھی کی ضرورت نہیں ہے۔''
نشا سرمد جتنا اس پر مرتی تھی وہ اتنا ہی دور بھاگتا تھا اس سے۔''
''اچھا تجھ سے کام تھا موڈ خراب نہ کر۔''
سعد نے اس کی پریشانی پر نمایاں ہوتے بل دیکھے۔
وہ بھی گہری سانس لے کر خود کو خواہ مخواہ کی بدمزگی سے نکالنے لگا۔ سعد کی باتوں میں الجھ کر اسے یاد نہیں رہا۔ ورنہ وہ سعد سے رانگ کال والی لڑکی کے بارے میں شیئر کرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اس کے من میں یہ بھی تھا کہ ہوسکتا ہے یہ اس کے کسی فرینڈ کی شرارت ہو۔ جو بھی تھا۔ ایک بار پھر وہ یہ بات فراموش کر گیا۔ مگر دوسری طرف وہ ہی مستقل مزاجی تھی اور بات کی اتنی پکی تھی کہ عین اس وقت کال کی جب وہ لائٹ آف کر کے سونے کی تیاری میں تھا۔ جی جان سے جل گیا تھا وہ اس کی آواز سن کر۔
''ڈسٹرب تو نہیں کیا میں نے۔''
''بی بی گھڑی کی سوئیاں دیکھو۔ اس وقت کسی بھی شریف آدمی کو کال کرو گی تو وہ ڈسٹرب ہی ہوگا۔
''ایم سوری مگر تمہاری آواز سنے بنا مجھے نیند نہ آتی۔ یونو بے شک تمہیں میری آواز سن کر غصہ آتا ہے۔ بٹ میرے لیے تم اور تمہاری آواز۔ دونوں بہت اسپیشل ہیں۔''

''لسن میڈم یہ ڈرامہ بند کرو اور سیدھے سے بتاؤ کہ تم کون ہو اور مجھے تنگ کر کے کیا ملتا ہے۔''
''میں صرف تمہیں چاہتی ہوں۔''
بے باک لہجہ اس کے تن بدن میں آگ لگا گیا۔
''جسٹ شٹ اپ۔'' بند کرو یہ بکواس اور مجھے سکون سے سونے دو۔''
''میرا سکون چھین کر تم کیسے سکون سے سو سکتے ہو۔''
''ٹیل می پلیز۔ آخر تم کون ہو؟''
''عینی کنول ہوں۔ آئی نو۔ تم مجھ سے تنگ ہو بٹ میں تم سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔''
''اور میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرے پاس اتنا فالتو ٹائم نہیں ہوتا۔''
''آئی پرامس یو میں کبھی تمہیں تنگ نہیں کروں گی بس تم جب تمام مصروفیات سے ایزی ہو جاؤ مجھے مس بیل کر دیا کرو۔
''پاگل ہوں میں یا میرے سر پر سینگ ہیں۔''
''پاگل تو میں ہو چکی ہوں تمہارے لیے بنا تمہیں دیکھے۔''
''اُف گاڈ...... یہ کیا بلا ہے؟''
مجال ہے جو کسی بات کا اثر ہوتا ہو۔ اگلے دن لنچ ٹائم میں وہ سعد سے یہ تمام صورتحال شیئر کر رہا تھا۔
''تمہاری چاہنے والیوں میں ایک اور کا اضافہ۔''
اس کے لہجے میں حسرت تھی۔
''اللہ میاں جی ہمارے نصیب بھی کھول دو۔''
''خبیث انسان میں جان چھڑوانے کے چکر میں ہوں اور تو!!''
''اسٹنی اس سے ملنے کا بول ناں دیکھتے تو ہیں کیا چیز ہے؟''
''آئی ول کل یو سعد رسول۔''
''ناؤ سیریس۔'' دیکھ اگر تجھے شک ہے کہ وہ

ہمارے کسی فرینڈ کی شرارت ہے تو تب بھی ایک بار ملنا تو پڑے گا ناں۔'' تو اسے فون کرناں۔''
''نیور۔''
وہ ماننے کو تیار نہ تھا۔
''ہاں اگر وہ خود کال کرے گی تو کہہ دوں گا۔''
سعد کے آنکھیں نکالنے پر اس نے بات مکمل کی۔ اور شام میں ہی اس کی کال آ گئی تھی اتفاق سے سعد اس کے ساتھ ہی تھا۔''
''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''
''رئیلی اس کا مطلب ہم دوست بن گئے۔''
''تو...... ملنے کے بعد ڈیسائیڈ ہوگا۔''
اس نے فوراً سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔
''او کے کب اور کہاں......''
وہ تو جیسے تیار بیٹھی تھی...... اسٹیفن نے اسے ٹائم اور جگہ کا بتا کر فون بند کر دیا تھا۔
''مل لینا جا کے اب۔''
''کیا مطلب؟؟''
سعد نے حیران انداز میں کہا۔
''اسے کیا پتا چلے گا اگر میری جگہ پر تم چلے جاؤ گے تمہاری حسرت بھی پوری ہو جائے گی۔''
''بڑا کمینہ ہے تو......!''
''یو نو آج میں بزی ہوں۔''
''کل کا ٹائم دے دیتا۔''
''سچ بتاؤں تو مجھے ملنا ہی نہیں تیری خواہش تھی اب مل لینا اور آ کے مجھے بھی بتا دینا۔''
''دس از ناٹ فیئر اسٹفی۔ تم خود جانا۔''
سعد نے صاف منع کر دیا۔
''اکیلا!!''
وہ یوں بولا جیسے وہ کوئی صنف نازک ہو۔''
''کھا جائے گی تجھے۔''
''کہاں پھنسا دیا تو نے۔'' تجھے ہیلپ کرنے کو کہا تھا، جان عذاب میں ڈالنے کو نہیں۔''
اس نے گردن جھٹکی مگر سعد نے کسی نہ کسی طرح اسے قائل کر لیا تھا اور وہ عین ٹائم پر کیفے پہنچ بھی گیا تھا۔
''میں اسے جانتا تک نہیں۔ یہاں تو سینکڑوں لڑکیاں ہیں۔'' کیسے پتا چلے گا ان میں عینی کنول کون ہے۔''
وہ جھنجلایا ہوا تھا۔ سید اس کے چہرے پر بیزاری جل کر رہ گیا۔
''اچھا شکل تو ٹھیک کر۔ جا ڈیٹ پر رہا ہے اور بارہ بج رہے ہیں۔''
''تھپڑ کھائے گا تو۔ ڈیٹ پر۔''
وہ دونوں چاروں طرف نگاہیں گھما رہے تھے۔
''وہ اکیلی لڑکی بیٹھی ہے بلیو ڈریس والی۔''
سعد نے آنکھ سے اشارہ کیا۔
''تو! ضروری ہے کہ وہ ہی ہو۔''
''پوچھنے میں کیا حرج ہے، جا دفعہ ہو۔ میں یہیں ویٹ کرتا ہوں سعد نے اسے آگے کی طرف دھکا دیا اور خود وہیں خالی ٹیبل کے گرد پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔
اچھا خاصا بندہ کس چکر میں پھنسا دیا تھا۔
''مس عینی کنول۔''
وہ عین اس کے سامنے آن رکا تھا اس کے سوال پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
''لیں!!''
عینی کنول کی نظریں اس کے چہرے پر جیسے جم کر رہ گئیں۔
''میڈم پلیز سٹ ڈاؤن۔''
بمشکل اس نے لہجہ نارمل رکھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے بھی کہا تھا وہ جیسے چونک کر مسکرا کر پھر سے بیٹھ گئی۔

اسے دیکھ کر یہ شک بھی دور ہوگیا تھا کہ اس کے کسی فرینڈ کی شرارت ہوگی مگر یہ طے تھا کہ وہ جو بھی تھی۔
حسن وخوبصورتی کا نمونہ تھی۔
نازک سا سراپہ کمر پر لہراتے براؤن بال سیاہ بڑی آنکھیں۔"
"اب ہم دوست بن سکتے ہیں۔"
وہ مسکرا کر بولی تو وہ لمحے بھر کو ساکت رہ گیا تھا۔
"کیا چاہتی ہو تم مجھ سے۔ میں تمہیں جانتا تک نہیں ہوں۔"
جان پہنچان بنانے کے لیے تو آئے ہیں ناں۔"
اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔
"نام جان سکتی ہوں تمہارا۔
"اسٹفین جوزف۔"
اس کے بولنے پر وہ لحہ بھر کو وہ خاموش سی ہوئی تھی مگر اگلے پل وہ ہی مسکراہٹ دوبارہ اس کے لبوں کا حصہ بن گئی جو جو پہلے بھی اس کے چہرے پر تھی۔
"یونو اسٹفین تمہارے لیے میں غیر اہم ہوں مگر تم میری دیوانگی بن گئے ہو۔ تمہیں دیکھے بنا چاہنے لگی ہوں میں اور آج تم سے ملنے والے کے بعد اس دیوانگی میں اضافہ ہوگیا ہے۔"
"لیکن میں یہاں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ پلیز کیوں اپنا اور میرا وقت برباد کر رہی ہو میں بہت مصروف بندہ ہوں۔"
"میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا اور آج بھی وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری مصروفیت میں کبھی تنگ نہیں کروں گی بٹ پلیز یہ مت کہنا کہ مجھے کال کرنا چھوڑ دو۔"
"وائے۔" وہ اکتا گیا تھا۔
"میں تمہیں مجبور نہیں کرتی کہ تم بھی مجھے چاہو۔ مگر تم میری چاہت ہو اور تم سے بات کرنا میری مجبوری ہے۔" "پلیز۔"
وہ صاف انکار کرنا چاہتا تھا مگر اس کی آنکھوں میں التجا نے اس کی زبان روک لی۔ اور وہ سر ہلا بیٹھا تھا۔
یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ مگر پھر روز رات میں عینی کنول سے بات کرنا اس کی روٹین میں شامل ہوگیا۔"
پہلے پہل وہ صرف اس کی سنتا تھا اور ہوں ہاں میں جواب دے دیتا۔ مگر دھیرے دھیرے جب بے تکلفی ہوئی تو وہ خود بھی عینی کنول سے اچھی خاصی گپ شپ کرنے لگا۔ اور محض ایک ماہ میں وہ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں تمام باتیں جان چکے تھے۔"
عینی کنول ایک امیر باپ کی اکلوتی اولاد تھی ماں باپ دونوں ہی بزنس میں انوالو رہتے تھے اور تنہائی دور کرنے کے لیے اس نے فون پر دوستیاں بنانے کا مشغلہ اپنایا تھا۔
اسٹفین کے علاوہ بھی اس کے بہت سے دوست تھے جن سے فرینڈ شپ اس کی فون پر ہوئی تھی۔ یہ اس کا شوق بن گیا تھا۔ مگر اسٹفین دوست سے بڑھ کر تھا اس کے لیے۔
اب ان کی دوستی محض فون تک محدود نہیں تھی وہ اکثر ملتے تھے، کبھی باہر کبھی ڈنر کر لیا اور کبھی وہ اسٹفین کے اپارٹمنٹ پر آجاتی۔ کبھی اسے فون کر کے پوچھ لیتی کہ وہ کب تک بزی ہوگا...... اور وہیں سے اسے پک کر لیتی۔
"اسٹفی...... خیریت ہے ناں کچھ خاص اہمیت دینے لگے ہو عینی کو۔"
سعد رسول نے جو نوٹس کیا کہہ دیا۔
"ہاں...... بی کوز وہ ہے ہی اسپیشل۔"
اس نے کھل کر مسکراتے ہوئے کہا۔
"دھیان سے نشا سرمد کو علم ہوگیا کہ تم کسی کی زلف کے اسیر ہو چکے ہو تو بہت برا ہوگا۔

''میری پرسنل لائف میں انٹرفیئر کرنے کا حق کس نے دیا ہے اسے۔''

''اچھا تو جا موڈ خراب نہ کر۔''

وہ جانتا تھا کہ عینی نے اسے فون کیا ہے۔

''سعد پتا نہیں مگر عینی بہت اہم ہوگئی ہے میرے لیے۔''

''اچھی بات ہے ناں، تنہا زندگی گزر نہیں سکتی۔ اور لائف پارٹنر بھی ٹائم پر تلاش کر لینا چاہیے۔''

''لائف پارٹنر۔''

اس نے زیر لب دہرایا تھا مگر مزید کچھ کہا نہیں اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ عینی کنول کے سامنے بیٹھا تھا۔''

''اچھے لگ رہے ہو۔''

اسکائی بلیو شرٹ اور بلیک پینٹ میں اس کی وجاہت نمایاں ہو رہی تھی وہ مسکرایا یہ حقیقت تھی کہ اسے عینی کی پرشدت چاہت نے اسے اپنی طرف کھینچا تھا۔ وہ اتنی محبت کرتی تھی تو بھلا کیسے وہ خود کو محبت کی اس آگ سے بچا سکتا تھا۔ تبھی وہ عینی کنول کو اس کی شدتوں سے بڑھ کر چاہنے لگا تھا۔

''پتا نہیں عینی کنول اس محبت کا انجام کیا ہے۔''

اس کی سنہرے کانچ سی آنکھوں میں بے چینیاں جھلک رہی تھیں۔

''کیوں ہو تم بے یقین۔'' میں تمہارے لیے جان دے سکتی ہوں مگر تمہیں چھوڑ نہیں سکتی۔''

''میں اتنا جانتا ہوں عینی کہ!!'' میں ادھورا ہوں تمہارے بنا۔ تمہارے وجود سے میری ذات مکمل ہو سکتی ہے۔

''آئی نو۔''

اس نے اسٹفین کی آنکھوں میں جھانکا تو ان کے سحر میں ہی کھو گئی۔

☆......☆......☆

''آئی ایم فائن سعد رسول۔''

سینکڑوں بار کہنے کے باوجود بھی سعد نے اسے گھر لا کر ہی چھوڑا تھا۔

''تجھے وہم ہو گیا ہے میں نے نارمل ہی پی ہے۔''

''اندازہ ہے مجھے۔''

اس کے لڑکھڑاتے لہجے پر وہ تپ کر بولا تھا۔

''تم یہ چھوڑ نہیں سکتے۔''

''تجھے کیا پرابلم ہے۔''

''یہ اچھی چیز نہیں ہے اور جب اس سے سختی سے منع کیا گیا ہے تو......''

''تمہارے مذہب میں منع ہے!! اور اس کے باوجود تم سب لوگ پیتے ہو سر عام پیتے ہو۔ مجھ پر پابندی کیوں؟؟''

وہ کبھی کبھی ایسی تلخ بات کہہ جاتا اور سعد سہہ جاتا کیونکہ بات تلخ ضرور ہوتی تھی مگر حقیقت بھی تھی کہ مسلمان ہونے کے باوجود یہ برائی عام تھی ہمارے معاشرے میں۔ ''میں تو نہیں پیتا۔ اسی لیے تمہیں اپنا سمجھ کر منع کر دیتا ہوں۔ مگر آج کے بعد نہیں کروں گا......سو جاؤ گڈ نائٹ۔''

''سعد لسن۔ ایم سوری میں تجھے ہرٹ کرنا نہیں چاہتا تھا۔''

''میں ہرٹ نہیں ہوا۔''

وہ سعد کو روکنے لے لیے اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ سعد نے سہولت سے اس کا ہاتھ ہٹایا تھا اور بہت دھیمے سلجھے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔''

''ایک بات کہوں؟ مذہب کوئی بھی ہو برائی سب کے لیے برائی ہی ہے۔ یہ محض انسان کی اپنی سوچ کا فرق ہوتا ہے۔''

لمحہ بھر کو وہ رسان سے بولا تھا۔

''ناراض ہو گیا ہے ناں۔''

''نہیں بس نیند آ رہی ہے۔''
''تو...... یہیں سو جا اس وقت گھر جائے گا انکل آنٹی ڈسٹرب ہوں گے میں فون کر دیتا ہوں۔
زبردستی کھینچ کر اسے واپس لے آیا۔
''ایم سوری سعد پلیز۔'' اتنا وہ سمجھ گیا تھا کہ سعد ہرٹ ہوا ہے۔
''آئی تھنک مجھے عینی کنول سے بات کرنی ہوگی۔ تم اس کی بات کبھی نہیں ٹالو گے۔''
سعد بھی ناراضگی بھول کر بولا تھا وہ ہنس دیا۔
''لو کچھ اور مانگ لیتے ادھر نام لیا ادھر اس کا فون آ گیا۔
اس کے موبائل پر صرف عینی کی ہی کال آ سکتی تھی۔
اس نے بنا اٹینڈ کیے سیل سعد کی طرف بڑھا دیا تھا۔
''تو میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا خود بات کرو۔ اس سے تم نے بات کرنی ہے۔'' وہ سر ہلایا ہوا دور جا بیٹھا تھا۔
''وہ تو ہر وقت صرف مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔ یو نو سعد شی از کریزی اور اس نے مجھے بھی دیوانہ بنا دیا ہے۔ اب تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے بن سانس بھی نہیں لے سکوں گا۔''
اسے الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی سعد اس کی دیوانگی کے عالم سے بخوبی واقف تھا۔
''اوکے، بٹ ابھی کال اٹینڈ کرو۔''
ایک بار بند ہو کر پھر سے موبائل بجنے لگا تھا۔
''ہیلو ڈیئر......
لہجے میں کچھ شراب کا خمار تھا اور کچھ اس کے پیار کا۔
''سو گئے تھے۔''
''اوں ہوں...... ابھی آیا تھا گھر۔ یوں بھی تم سے بات کیے بنا سو سکتا ہوں۔''
''یہ ہی تو پرابلم ہے اسٹیفن جوزف ورنہ رات کے اس پہر انسان سو چکا ہوتا ہے۔'' وہ مسکراتے لہجے میں بولی تھی۔
''میں تو ہر رات تمہارے وجود کو محسوس کر کے سونا چاہتا ہوں۔ کب مٹاؤ گی یہ دوریاں، کب ختم ہوگی میری بے قراریاں۔''
وہ بہکے بہکے انداز میں بولا تھا سعد نے بمشکل اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی کیونکہ اس کے خیال میں اسٹیفن۔
''آئی تھنک تم نے آج پھر ڈرنک کی ہے۔''
عینی بھی سمجھ گئی۔
''تمہارے پیار سے زیادہ نشہ نہیں ہے شراب میں۔''
''بٹ اس وقت صرف شراب کا نشہ ہے تمہارے لہجے میں...... تم پلیز سو جاؤ۔
گڈ نائٹ......
''گڈ نائٹ لو یو ڈیئر۔''
''آئی لو یو ٹو......''
عینی کی خوبصورت آواز بند ہونے کے بعد بھی کانوں میں اتری ہوئی تھی۔
''بہتر ہوگا جتنا جلدی ممکن ہو سکے تم شادی کر لو ورنہ تمہاری یہ بے قراریاں کہیں کچھ اور......''
سعد نے شرارت سے جملہ ادھورا چھوڑا۔
''سو واٹ، بدنام گر نہ ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ محبت میں انتہا سے گزر جانا ہی دیوانگی ہے۔''
''اچھا دیوانے صاحب مجھے تو نیند آ رہی ہے۔ تم کھوئے رہو خیالوں میں مجھے سونے دو۔''
سعد نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

☆......☆......☆

اکثر ہی وہ اس سے ملنے اس کے فلیٹ پر آ جاتی تھی جیسے آج اچانک آ کر اس نے سرپرائز دیا تھا۔ کیونکہ آج وہ گھر پر تھا۔

''سرپرائز برا تو نہیں لگا۔''

''وائے۔'' اس کی سارے جہاں سے خوبصورت آنکھوں والی مسکراہٹیں تھیں جو عینی کنول کو دیکھ کر گہری ہو جاتی تھیں۔

''یہ گھر بھی تمہارا ہے اور میں بھی جب بھی آؤ گی تمہیں منتظر ملیں گے۔''

''اور ئیلی۔''

''میرے پیار کی سچائی میری آنکھوں میں نظر نہیں آتی جانِ من۔''

''ان آنکھوں میں جو نظر آتا ہے وہ میرے وجود کو پگھلا دیتا ہے۔ دیوانگی دونوں طرف برابر تھی۔

''کیا لو گی۔'' اس نے ماحول پر چھائے اثر کو زائل کرنا چاہا۔

''آج میں بناؤں گی اور تم چپ کر کے پی لو گے۔''

''کیا......!''

''بلیک کافی......!''

''اوکے۔'' اس نے کندھے اچکائے عینی کچن کی طرف چل دی وہ وہیں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگا تھا۔

''اسٹفین تمہیں نہیں لگتا یہ فلیٹ چھوٹا ہے۔''

کافی کا مگ اس کے سامنے رکھ کر بولی تھی۔ اپنا مگ ہاتھ میں لیے وہ وہیں کھڑے کو کر تمام جائزہ لینے لگی۔

اسٹفین نے گردن موڑ کے اسے دیکھا جو عین اس کے پیچھے کھڑی تھی۔

''میرے خیال میں ہم دونوں کے لیے کافی ہے۔''

عینی اس کی شوخ سی بات پہ کھل کر مسکرائی تھی اور بالکل اس کی پشت کے پاس آ کر بانہیں اس کے شانوں پر پھیلا دیں۔ چہرہ اس کے سیاہ بالوں پر رکھ دیا۔

''تمہارا ساتھ چاہیے اسٹفین جوزف اور کچھ نہیں جو کہو گے مان لوں گی جہاں رکھو گے رہ لوں گی۔''

اس کے لفظوں میں آنچ تھی جو اسٹفین کے دل کو چھو گئی اس نے عینی کا بازو تھام کر اسے اپنے پیچھے سے اپنے سامنے بالکل قریب بٹھایا تھا اور اس کے نازک وجود کو بانہوں کی پناہوں میں لے لیا۔

اس پر سحر طاری ہونے لگا تھا۔

''ہاں مگر وعدہ کرو یہ دیوانگی صرف میرے لیے ہوگی اور عمر بھر کم نہ ہوگی۔''

اس کی محبت کا خمار عینی کنول کو بھی مدہوش کر رہا تھا۔ اسٹفین جوزف اس وقت کمزور لمحوں کی گرفت میں تھا اس نے لبوں سے عینی کا چہرہ چھوا تھا۔ عینی کی قربت اسے بہکا رہی تھی۔ اس کا تنفس تیز ہونے لگا تھا۔

اس سے پہلے کہ اس کی مدہوشی حد سے گزرتی۔ یکدم اسے ہوش آیا تھا اور اس نے عینی کو جھٹکے سے دور کیا تھا خود سے اور فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''او گاڈ۔'' ''دس از رانگ۔''

دونوں ہاتھوں سے سر تھامے وہ نفی میں سر سلا رہا تھا عینی دنگ سی اس کی حالت دیکھ رہی تھی۔

جس ماحول میں دن رات وہ رہتا تھا وہاں صحیح غلط کا اندازہ بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے اور اس کے اندر یہ احساس تھا تبھی وہ شرمندہ تھا۔

''یہ کیا کرنے لگا تھا میں۔''

''اوکے جسٹ ریلیکس شاید دیوانگی اسی کا نام ہے۔''

''بٹ دس از رانگ۔ مجھے لمٹس کراس نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ایم سوری عینی پلیز۔''

''اٹس اوکے۔''

اس نے اسٹفین کا ہاتھ تھام کر اسے صوفے پر

بٹھایا پانی دیا۔
''تم میرا جنون بن گئی ہو میں نہیں رہ سکتا اب مزید تمہارے بنا پلیز عینی۔
بلیوی۔''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔(وہ بولی)
''مشکل کیا ہے؟ اسٹفین کی آنکھیں اس کے جواب پر حیرت سے پھٹ گئیں۔
''تم جانتے ہو اسٹفین کہ تمہارے اور میرے بیچ کیا رکاوٹ ہے۔''
''یومین کہ تم مسلمان ہو اور میں !!''
عینی اسے خاموش کرا گئی۔
''تمہارے لیے یہ میری محبت سے زیادہ اہم ہے ہزاروں شادیاں ہوتی ہیں ایسے دنیا میں۔''
''ہوتی ہوں گی مگر میں تم سے ایسے شادی نہیں کرسکتی۔''
''یعنی یہ شرط ہے تمہاری۔
''ایسا نہیں ہے اسٹفین مگر میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتی جو ہمارے معاشرے میں غلط سمجھا جاتا ہے۔''
''معاشرے کی اتنی فکر ہے تمہیں۔ اور عینی تم اس وقت میرے گھر پر میرے ساتھ موجود ہو۔ یہ معاشرے کے لیے صحیح ہے دن رات مجھے فون کرتی ہو۔
''وہ میری محبت ہے کہ میں نہیں رہ سکتی۔ لیکن کیا تم میرے لیے یہ نہیں کر سکتے۔''
''کیا......!!'' یہ ہی کہ تم اسلام قبول کرلو۔
کئی لمحے ان دونوں کے بیچ خاموشی رہی۔
''تم مجھ سے میری سانسیں بھی مانگ لو تو عینی کنول میں انکار نہیں کرسکتا۔ تم جیسا چاہتی ہو میں تیار ہوں صرف تمہیں پانے کے لیے۔''
''ریئلی اسٹفین۔''
بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ اسٹفین نے سر ہلا دیا۔
اس کے خیال میں تو صرف عینی کنول کی محبت اہم تھی اب جو وہ چاہتی تھی۔
اس نے حامی بھرلی تھی۔
''میں کل صبح تمہیں لینے آؤں گی۔ قاری صاحب کے پاس چلیں گے۔''
''جہاں لے جاؤ گی چل پڑوں گا۔ مجھے صرف تمہیں پانا ہے اور بس اس نے اقرار کی مہر لگادی۔''
سعد رسول کو اس نے یہ نیوز دی تھی وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو چکا ہے۔ تو سعد نے بہت خوشی سے اسے گلے لگایا تھا بہت خوش ہوا تھا۔
''محبت ہو یا دوستی یہ کبھی کسی مذہب یا ذات کے فرق کو نہیں تسلیم کرتی۔ میرا ایمان میری محبت ہے اور میری محبت کی یہ خواہش تھی جس کا میں نے احترام کیا۔''
سعد رسول کے چہرے پر یکدم خوشی کے تاثرات ختم ہو گئے تھے۔
''تم جانتے ہو تم نے جو دین اپنایا ہے اس کے لیے دل کی رضامندی اور دل سے ایمان لانا سب سے اہم ہے۔''
''دیکھو سعد میں نے دل و دماغ کی رضامندی سے ہی یہ فیصلہ لیا ہے۔'' اس نے سعد کا چہرہ دیکھا۔
''مگر اس فیصلے میں تمہارا مرکز اللہ کی ذات نہیں عینی کی خوشی اہم ہے۔ تم نے عینی کو پانے کے لیے یہ دین قبول کیا ہے۔ اللہ کی رضا کو پانے کے لیے نہیں۔''
''تم کیوں مجھ سے اب یہ بحث کرنا چاہتے ہو۔ تمہارے لیے میری خوشی اہم نہیں۔''
''ہے اور میں تمہارے لیے بہت خوش بھی ہوں۔ اللہ پاک تمہیں سارے جہاں کی خوشیاں عطا کرے۔''
اس نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا تھا۔ اور مسکراتے ہوئے اسے گڈ لک کہہ کر چلا گیا۔ ہاں

اسے اپنے بیسٹ فرینڈ کے اسلام قبول کرنے کی جو خوشی ہوئی تھی وہ اب نہیں رہی تھی۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا سعد رسول نے۔"

اور اب وہ تھا اور عینی اور ان کی دیوانی محبت۔

"عینی اب کس بات کے انتظار میں ہو۔ تم اپنے پیرنٹس سے بات کرو ناں۔"

"اسفند ضیاء میں نے ان سے بات کی ہے پلیز کچھ ویٹ کرو۔

ڈیڈ سنڈے کو فارغ ہوں گے میں تمہیں ان سے ملواؤں گی۔"

وہ ساحل سمندر پر بیٹھے تھے اور آج اسفند بہت سنجیدہ تھا اس ٹاپک کو لے کر اب عینی کیوں دیر کر رہی ہے۔ جبکہ عینی نے جو کہا اس نے آنکھیں بند کر کے مانا تھا۔

کیونکہ اس نے پوری سچائی اور دل کی تمام شدتوں سے عینی کو چاہا تھا۔

"تمہارا موڈ کیوں آف ہے۔"

وہ اپنے موبائل پر آنے والے ایس ایم ایس کو چیک کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"سیدھی سی بات ہے اب ایک پل بھی تم بن نہیں گزرتا۔"

"او گاڈ یو آر کریزی اسفند ضیاء۔"

یہ نام بھی عینی کی پسند تھا ورنہ قاری صاحب نے اسے احمد ضیاء کا نام تجویز کیا تھا مگر اس نے تو وہ ہی کرنا تھا جو عینی کی چاہت تھی۔

"ہاں ہوں۔"

اس نے قدرے غصے سے کہا تو وہ ہنس دی۔ تبھی اس کے موبائل پر بیپ ہوئی تھی اس نے فوراً کال اٹینڈ کی۔

"ہائے تابش۔ سوری یار میں بزی تھی۔"

حالانکہ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ اس کے ساتھ ہوتے ہوئے عینی کے پاس کوئی کال آئی تھی اکثر ہی اس کی کالز آتی تھیں کیونکہ فون پر دوستی کرنا اس کی ہابی تھی۔

مگر آج پہلی بار اسے برا لگا تھا۔ وہ کتنا سیریس تھا شادی کے ٹاپک کو لے کر جبکہ عینی کو فکر ہی نہیں تھی۔ وہ غصے میں وہاں سے اٹھ گیا۔

جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ اب عینی کی دیوانگی سرد پڑنے لگی ہے یا شاید وہ واقعی اس کے لیے کریزی ہو رہا ہے۔"

"یہ کیا حرکت ہے کیوں اٹھ آئے تم۔"

"تمہیں فرق فرق پڑتا ہے میرے ہونے یا نہ ہونے سے۔"

"اسفند تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے۔"

"میرے ساتھ ہوتے ہوئے تم کسی اور سے بات کرو مجھے اچھا نہیں لگتا۔" اس نے صاف گوئی سے دل کی بات کہہ دی۔

"وہ میرا دوست ہے اور یو نو ویری ویل یہ فرینڈ شپ کرنا میری ہابی ہے۔" یہ میں نہیں چھوڑ سکتی۔

اسفند ضیاء اس وقت خاموش ہو گیا مگر اب اکثر ہی ان میں یہ بحث شدت اختیار کرنے لگی تھی۔ اسفند کے چہرے کا اضطراب ان دنوں چھپائے نہیں چھپتا تھا۔ تبھی سعد کو پوچھنا پڑا۔ حالانکہ اس نے اسفند کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

"کیوں بے چینیاں جھلک رہی ہیں ان سنہری آنکھوں میں۔"

"تھنگ......!!"

وہ سعد کو کیا بتاتا کہ عینی کے سرد پڑتے جذبات نے بے چین کر دیا تھا۔ وہ جتنا اس کے لیے پاگل تھی اب لاپرواہ ہو رہی تھی۔

"اتنے فاصلے نہیں ہوئے ابھی ہم میں کہ تیری آنکھیں مجھ سے دل کا حال کہنا چھوڑ دیں۔

"دل ہی تو احمق ہے کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔"

"عینی سے جھگڑا ہوا ہے۔"

"وہ ملتی کب ہے اب کال کرو تو نمبر بزی ہوتا ہے۔ پورا ویک ہوگیا ہے سعد جانے کیوں میرا دل وہموں کا شکار ہو رہا ہے۔ سعد اس کے بغیر نہیں جی سکتا۔ مر جاؤں گا۔"

"اللہ پر بھروسہ رکھو۔ انشاء اللہ جو ہوگا بہتر ہوگا۔ شاید اس کی کوئی مصروفیت ہو۔"

"کچھ بتائے تو سہی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا وہ اپنے پیرینٹس سے بات کر چکی ہے اور اتوار کو اس نے مجھے اپنے ڈیڈ سے ملوانا تھا۔ بٹ اس نے مجھ سے کوئی کانٹیکٹ نہیں کیا۔"

"ہوسکتا ہے اسی بات کو لے کر ان کے گھر میں کوئی پرابلم ہو اور وہ تمہیں پریشان نہ کرنا چاہتی ہو۔"

"سعد اس کے پیرنٹس اچھے خاصے لبرل ہیں۔" عینی ان کی اکلوتی اولاد ہے مجھے نہیں لگتا کہ وہ اس چیز کو ایشو بنائیں گے۔"

"پھر تجھے کیا بے چینی ہے؟"

"عینی کا بدلتا رویہ۔" اس نے دل کا خدشہ ظاہر کیا۔

"او کے میں عینی سے بات کروں گا تو کیوں اتنا ٹینس ہو رہا ہے۔ سعد نے اسے تسلی دی تھی اور محض تسلی نہیں تھی اس نے عینی سے کانٹیکٹ بھی کیا تھا۔

"اسفند بہت اپ سیٹ ہے تم سے ملنا ہے۔"

"او کے۔" عینی نے کہا تھا اور وہ سعد نے جہاں بلایا آئی بھی تھی۔"

"یو نو ویری ویل کہ تم اس کے لیے کیا ہو۔ اس کے پاس دنیا میں تمہارے علاوہ اور کوئی بھی رشتہ نہیں بچا ہے۔ وہ وسوسوں کا شکار ہے۔"

سعد کی بات کے جواب میں وہ خاموش ہو رہی تھی۔

"میں اس سے خود بات کرلوں گی۔"

اس کا لہجہ کسی بھی تاثر سے خالی تھا۔ سعد نے اسے دیکھا۔

"کب......!!" میں آج کل بزی ہوں فرصت ملتے ہی۔"

"جبکہ تم جانتی ہو کہ وہ کتنا فکرمند ہے۔"

"دس از ناٹ مائی پرابلم......اسے سمجھا دو۔"

"عینی بات کیا ہے؟ تم سے ملنے کے بعد مجھے بھی اندازہ ہوا کہ اسفند سچ ہی پریشان ہے تمہارا لہجہ بہت بدلا بدلا سا ہے۔"

"یہ میرا پرسنل میٹر ہے۔" میں تم سے ڈسکس نہیں کرسکتی۔

"او کے، بٹ ریمیمبر میرے دوست کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

سعد جانے کیوں جذباتی ہوگیا۔

"اوہ تو ٹھیک ہے جا کے سنبھالو اپنے دوست کو کیونکہ میں شادی کررہی ہوں تابش سے اور کل ہمارا نکاح ہے۔"

وہ سعد کو شاک کی کیفیت میں چھوڑ کر اپنی بات مکمل کر کے چلی گئی۔

☆......☆......☆

بہت کوشش کی اس نے کہ اسفند کو بتادے مگر وہ یہ ہمت خود میں پیدا نہ کرسکا۔ دو دن کشمکش میں گزر گئے۔ مگر اس کی حالت دیکھ کر کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی وہ اپنے کمرے میں بے سدھ پڑا تھا۔ کمرے میں سگریٹ اور شراب کی بو اس قدر پھیلی ہوئی تھی کہ سانس لینا محال تھا۔ مگر ساکت پڑے اسفند کو دیکھ کر وہ اس کی طرف لپکا۔

"اسفند۔" اس نے اسفند کو دونوں بازوؤں سے تھام کر اٹھایا اور اس کا گال تھپکا تھا مگر وہ قطعی ہوش میں

نہ تھا پھر اسے ایمرجنسی میں اٹھا کر وہ ہاسپٹل لایا تھا۔ جہاں اسے فوری ٹریٹ منٹ دی گئی تھی۔

''ضرورت سے زیادہ ڈرنک کے باعث ان کی یہ کنڈیشن ہوئی ہے۔''

یہ ڈاکٹر کی رائے تھی۔

''یہ روٹین میں ڈرنک کرتے ہیں۔''

''اتنی زیادہ نہیں کرتا کبھی کبھی بس فرینڈز کے ساتھ۔''

''آپ کو اندازہ ہے کہ اتنی زیادہ ڈرنک ان کی کڈنیز کے لیے بھی پرابلم بن سکتی ہے۔

اب وہ کیا سمجھائے ڈاکٹر کو کہ صدمے اور دکھ کے باعث اس نے زیادہ پی لی ہے ورنہ وہ کبھی حواس نہیں کھوتا تھا۔

دو دن کی ٹریٹ منٹ کے بعد وہ کچھ بہتر ہوا تھا مگر سعد کی گود میں سر دھرے جب وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دیا تو سعد کی آنکھیں بھی نم کر گیا......!!

وہ کیسے اسے حوصلہ دیتا۔ وہ تو خود شاک میں تھا۔

''کیوں سعد کیوں؟؟ ایسا کیوں کیا اس نے میرے ساتھ۔''

''شاید وہ تیرے قابل ہی تھی۔ اللہ پاک نے تیرے لیے یقیناً اس سے کہیں بہتر لڑکی منتخب کی ہوگی۔

''سب کچھ چھین کر اب کیا دے گا وہ مجھے۔''

''استغفراللہ......ایسے الفاظ ادا نہیں کرتے اسفند...... وہ ہمیں ستر ماؤں سے زیادہ چاہتا ہے اسی لیے ہمیں وہ عطا کرتا ہے جو وہ ہمارے لیے چاہتا ہے اور جو وہ چاہتا ہے اسی میں ہماری بھلائی ہے۔'' وہ کافی دیر اسے سمجھاتا رہا۔

اسفند کی ذہنی حالت بہت ابتر تھی۔ ایک ہفتہ مکمل ہو چکا تھا مگر وہ سنبھل نہ سکا۔ اور پھر جب کچھ حوصلہ ہوا تو عینی کنول پھر اس کے سامنے آ گئی۔ وہ اور سعد بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔

''تم واقعی میری دیوانگی بن گئے تھے مگر جب تابش سے میری دوستی ہوئی اور دھیرے دھیرے ہم قریب آئے تو مجھے محسوس ہوا کہ تم سے محبت محض میری جذباتیت تھی محبت تو مجھے تابش سے ہے اور اتنی شدید کہ اس کے بن اِک پل بھی سانس لینا مجھ پر بھاری گزرتا ہے۔''

اسفند ضیاء کا دل ماتم کرنے لگا کہ جس لڑکی کو اس نے دیوانگی کی تمام حدوں سے چاہا وہ......

''میں تمہاری محبت کی قدر کرتی ہوں اسفند، ہم ہمیشہ اچھے دوست رہیں گے۔''

''تمہیں لگتا ہے عینی کنول کہ اب مجھے تمہاری شکل بھی دیکھنی چاہیے۔''

''تمہیں تو میرا احسان مند ہونا چاہیے اسفند ضیاء تم غیر مسلم تھے اور تمہیں دائرہ اسلام میں داخل کرنے کا کریڈٹ مجھے جاتا ہے۔''

''اور اگر تم ایسا سمجھتی ہو کہ تمہیں اس کا ثواب ملے گا تو تم غلط ہو عینی کنول تم ایک دھوکے باز عورت ہو۔ تم جس طرح میرے دوست کی زندگی برباد کی ہے اس کا دل توڑا ہے۔ وہ آہ عمر بھر تمہارا پیچھا کرے گی۔'' سعد مزید چپ نہ رہ سکا۔

میں جا کے تمہارے شوہر کو تمہاری حقیقت بتاؤں گا کہ تم کس قدر گری ہوئی ہو۔''

''اچھا! کوشش کر کے دیکھ لینا۔''

وہ تلخ مسکراہٹ اچھالتی چلی گئی۔ اور اسفند ضیاء سعد رسول کی باہوں میں ڈھے گیا تھا۔

'' میرے سچے جذبوں کے ساتھ اتنا بڑا مذاق۔''

''اللہ تو دیکھ رہا ہے ناں۔''

سعد نے اسے خود سے بھینچ لیا۔

دوسرا حصہ اگلے ماہ پڑھنا نہ بھولیے

ایم اے راحت کے قلم سے تخلیق پانے والا ایک لافانی سلسلہ

ہم شکل

ایک نوجوان کی سرگزشت، جسے بچپن کی ایک بات یاد تھی

جب اُس کی دادی اماں نے کہا تھا۔

''اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر انسان کے سات ہم شکل بنائے ہیں......''

''کہاں ہیں وہ......؟''

''لو...... یہ تو اللہ ہی جانے بیٹا۔''

''ٹھیک ہے...... میں انہیں تلاش کروں گا۔''

کیا یہ روایت دُرست ہے؟

اسی روایت کی کھوج میں نکلے اُس نوجوان کی کتھا......

جب ایک ڈاکٹر نے اُس کے جذبۂ جستجو کو ہوا دی

ڈاکٹر نے کہا

''تمہیں برین کینسر ہے...... تمہاری عمر مختصر ہے......''

''نہیں ڈاکٹر...... مجھے کینسر نہیں ہے...... اور اگر ہے تو بھی میں نہیں مروں گا...... میں بہت لمبی عمر جیوں گا......''

موت سے پنجہ کش ایک سرکش نوجوان کی ناقابلِ فراموش داستان

کیا اُسے ساتوں ہم شکل ملے؟

کیا اُس نے موت سے جنگ کی؟

ایک انوکھی داستان...... جو سچی کہانیاں کے صفحات پر آپ کی منتظر ہے

افسانہ

سعدیہ عزیز آفریدی

اترن

اس کی شادی کی پہلی سالگرہ تھی جب اس کی ساس نے عزت کی خاطر ایک مہنگا سا سوٹ لنڈا سے خریدا وہ اسے استری کر رہی تھی جب اس کا شوہر جس سے راتوں کو دیر سے آنے پر اس کی بات چیت بند تھی اس کے پاس آگیا۔ ایک سادہ سا کاٹن کا......

اس کا خیال تھا۔ سب لوگ اسے نگی کہہ کر بلائیں۔ اور یہ خیال اسے بس اچانک ہی ہوا تھا۔ اس کا نام تو نگہت تھا لیکن اپنی سہیلیوں میں اسے نگی کہلوانا پسند تھا۔ ایک ہی بھابھی اور بھائی تھا ان دونوں کا خیال تھا انٹر کے بعد بھی پڑھانے کا فیصلہ اس کے چوکیدار ابا کا سب سے غلط فیصلہ تھا لیکن اسے لگتا تھا پڑھنے سے ایک نئی دنیا ایک نیا جہان تھا جو اس پر کسی راز کی طرح آن کھلا تھا۔ پورا کا پورا۔ نہ ایک انچ ادھر نہ ایک انچ ادھر۔ گھر میں اگر کسی کو اس کی باتیں سمجھ آتی تھیں تو وہ اس کی ماں تھی۔ ابا بس اس کے ساتھ اتنا تھا جتنا اسے اپنے فیصلے کو ٹھیک ثابت کرنے کی ضرورت ہونے تک ہی میں اس کا ساتھ دینا تھا اس کی ماں نے اسے جو نصیحتیں کبھی نہ کی تھیں ابا ان نصیحتوں کو اپنے ساتھ لئے پھرتا دوپٹہ ایسے اوڑھ سر جھکا کے چلا کر گلی میں۔ کوئی ایک کہہ تو تو دو مت سنانے بیٹھ جایا کر۔ سر جھکا اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا کر رہی اس کی ماں تو اسے بس یہ فکر ہوتی اس نے کھانا کھایا کے نہیں رات میں مچھر تو نہیں کرتے نیند پوری ہوئی کے نہیں۔ جاتے ہوئے ناشتہ کیا کہ نہیں۔ جب وہ کالج جا رہی ہوتی اس کی ماں اس کی چوٹی میں اپنا پورا کا پورا پیار لپیٹ دیتی۔ ایک ایک بال میں اس کی ماں کی انگلیوں کی نرماہٹ ہوتی جو دیر تک اسے مسرور کیئے رکھتی اس کی ماں اس کے گھر سے نکلتے ہوئے بس ایک جملہ کہتی ''جا پتر تجھے اللہ سوہنے کو سونپا''

کہنے کو یہ ایک جملہ تھا لیکن اسے لگتا اس کی ماں نے واقعی اللہ سوہنے کو اس کے ساتھ کر دیا ہے کبھی کوئی شرارت کرنے کو دل چاہتا کسی کی طرف دیکھنے کو نگاہ اکساتی بھی جو کے اس کی عمر کا تقاضہ تھا وہ ایسے نظر بچا کے چلتی جیسے کوئی اس کی من و عن شکایت لگا دے گا۔ ماں کو دکھ ہوگا۔ یہ سوچ کر اس نے کبھی اپنی عمر میں کیئے جانے والے شغل کیئے نہ کلاسیں بنک کر کے کوئی فلم دیکھی نا گھومنے گئی نہ کسی کو چوری چوری آنکھوں

کوئی پیغام دیا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن اچانک صفدر اس کی زندگی میں چلا آیا اس کی فرینڈ گوری کا بھائی۔ جو بہت کم کسی کی طرف متوجہ ہوتا گوری کا اب اس کے لئے نظر بھی بدل گئی تھی اور نظریہ بھی۔اب گوری اس سے کترا تی گزر جاتی اس کو اپنی باتوں مین چوکیدار کی بیٹی کا طعنہ دیتی اور وہ ایسے طعنہ پر اترا جاتی '[جبران کہتا ہے جو ہاتھ کانٹوں کا تاج بنا سکتے وہ ان ہاتھوں سے بہتر ہیں جو کچھ نہیں کرتے']

تمہارے کہنے کا مطلب ہے صرف تمہارے ابا کام کرتے ہیں باقی ہم سب کے باپ بے کار ہیں''

اس جملے کے حلق سے نکلتے ہی جیسے خلق نے سن لیا اس پر کمیونسٹ ہونے کا الزام تک لگا دیا

گیا حالنکے وہ تو نہ لینن کو جانتی نہ کیمونزم کو وہ تو ایک چھوٹے سے ویڑے میں رہنے والی لگی تھی جسے تھوڑی سی الگ زندگی جینے کی عادت تھی

وہ تو صرف یہ چاہتی تھی عام لوگوں کی طرح پیدا ہونے جینے اور مر جانے کے ایک سرکل کا حصہ نہ ہو بلکہ سرکل میں مرکزے کی حیثیت سے زندگی کا ایک نیا ڈ، این اے خود دریافت کرے۔لوگ اسے اس کے چلے جانے کے بعد بھی یاد کریں۔

لیکن صفدر اس کے اس راستے کا سب سے بڑا پتھر بنتا جا رہا تھا وہ اسے پیغام بھیجے جاتا جو کبھی آنکھوں آنکھوں ہوتے کبھی گوری کے رویہ میں چھپے ہوتے جس دن گوری اس سے بے تحاشہ کڑک بات کرتی اس کی سر سے لے کر پیر سے لے کر اس کی آنکھ کے تل میں بھی کوئی نہ کوئی خامی

تلاش کرنے میں جتی ہوتی اسے پتہ چل جاتا رات پھر اس کو لے کر گوری اور صفدر میں دھواں دھار ہوئی ہے۔ وہ اس موقعوں سے بچ کر چلتی جیسے کوئی رندوں میں پارسا اپنا دامن بچا کر چلتا ہو۔ لیکن وہ جب اس دائرے سے نکلتی تو آنکھ کے لشکارے محبت کے خوساختہ چھینٹے اس کے دامن کو داغدار کئے ہوتے۔ صفدر ہر روز آ جاتا اور ایک ہی بات کرتا ''مجھے تم سے محبت ہے مجھے ٹھکراؤ مت۔ وہ بھی انسان تھی کب تک ایک دیوار کی طرح ایکٹ کرتی رہتی۔ اس کے دل میں صفدر کے نام کی سیندھ لگ گئی تو وہ تو مرد تھا ایک معمولی جگہ سے حق جتاتا اس کے اندر گھستا چلا آیا اس نے اس سے ملنے کے لئے پہلی بار اپنے ساتھ کئے اللہ سوہنے کو جھوٹ لگایا اور صفدر کے ساتھ لنچ پہ گئی ماں کو جھوٹ لگایا کے پیپر کی کڑی تپسیاں مین جتی تھی۔ ماں سیدھی مان گئی لیکن اس کا دل ماں کا حمایتی نکلا دوسری بار ہی بول پڑا

''اگر واقعی چاہتے ہو تو رشتہ لے کر گھر آؤ۔ گھر والے نہ مانے تو تمہارے ساتھ بھاگ بھی سکتی ہوں'']

صفدر نے مونچھوں کو تاؤ دیا ''سوچ لو بہت بڑا قول دے رہی ہو']

نگی ایسی ہے دل کی درویش جو قول دیا سو دیا ۔ لے آؤ اپنے اماں باوا کو''

صفدر گیا پھر دوسرے دن گوری نے پیغام دیا اماں پہلے اکیلے میں ملنا چاہتی ہیں۔

اس نے اس کی بات مان گئی اور ماں کا جھوٹ لگا کر گوری کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی ۔اف وہ گھر تھا۔ ایسے گھر تو اس نے انگلش فلموں کے فیری ٹیل میں دیکھے تھے یا کلینڈرز پر اور ایسی ٹھنڈی سانس بھری کے جیسے چپکے سے اس منظر کو اپنی ٹھنڈی سانس سے حنوط کرنا چاہتی ہو۔ اس کے پاؤں کارپٹ میں دھنسے جا رہے تھے جب وہ صفدر کی امی کے سامنے پہنچی صفدر اپنی پسند پر اترا تے ہوئے ماں کو دیکھتا کبھی اسے۔ اس نے اماں کے سکھائے سارے سبق رٹی کال کئے اور جھک کر صفدر کی امی کو کورنش بجالائی صفدر کی امی کھل کھلا کے ہنسیں ان کے دانت بڑے ہی چمکیلے تھے کوئی اور وقت ہوتا تو وہ تعریف کئے بغیر نہ رہتیں۔ لیکن نگی کو لگا وہ اس پر ہنس رہی ہیں

''یہ لڑکی ہے جس پر اتنا اتراتے پھر رہے تھے۔ جو کر لگتی جو کر اس سے اچھی تو ہماری نوکرانی ہیں''

اس نے بہت کہا آنکھوں کو ''نہیں تو نے قسم ہے جو آنسو نکالے لیکن پھر بھی آنسو نکل ہی آئے۔ صفدر کی امی نے گوری کو حکم دیا وہ اس کا حلیہ بدلیں شاید انہیں وہ زاویہ نظر دکھائی دے جائے جس نے ان کے لاڈلے بیٹے صفدر کو گھائل کر دیا تھا وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن صفدر کی التجا بھری نگاہ نے اس کے پیروں میں ایسی زنجیریں ڈال دی کے وہ جا نہیں سکی۔ گوری نے اسے تیار کروانے کے لئے اسے میڈ کے حوالے کر دیا وہ آئینے کے سامنے کسی باربی ڈول کی طرح تیار ہو رہی تھی جب ایک ملازمہ نے شور مچا دیا

''یہ لباس بیگم صاحب نے مجھے دیا تھا اس لڑکی کو کس نے پہنایا۔

نگی خالی آنکھوں سے اس ملازمہ کی طرف دیکھنے لگی

یہ لباس اس کا تھا تو مجھے کیوں؟

ادھورا سوال ادھورے لہجے تک آتے آتے تھک گیا۔ ملازمہ تنک کر بولی ''تمہیں کیا لگتا ہیوہ تمہارے لئے لاکھوں کا کوئی لباس خراب کرتیں۔ اترن پہنا دی یہی بڑے پن کی نشانی

ہے۔ذرا بھی عزت نفس ہے تو پھر شکل مت دکھانا۔اگر کم وقت میں زیادہ کمانا چاہو تو یہ رشتہ بھی کافی ہے۔ڈرسنگ روم میں گئی اور اپنے کپڑے پہن کر باہر آگئی پھر صفدر کافی مرتبہ آیا وہ ملی نہیں پھر ایک دن مجبور ہو کر ملی تو وہ حیرت ذدہ رہ گیا'' بس اتنی سی بات۔میں سمجھا پتہ نہیں کیا ہو گیا۔

وہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔میں دلوادوں گا تمہیں ایک سے ایک کپڑے۔تم میرے ساتھ چلو مجھے نہیں جانا تمہارے ساتھ۔وہ میرا مذاق اڑاتی رہیں تم انہیں نہیں روک سکے انہوں نے مجھے اترن پہنا کر میری عزت نفس کو اپنے پیروں تلے کچلا تم کچھ نہیں بولے۔میں کیا توقع رکھوں اور کیوں توقع رکھوں

وہ گھر آگئی اس نے کالج چھوڑ دیا ان ہی دنوں اس کے ابا نے اس کا ایک رشتہ طے کر دیا بھابھی اپنے شوہر سے چی ماگوئیاں کرنے لگیں

''جتنے اچھے کھانے پہننے کی عادت ہے وہ وہاں جا کر گزارہ کر ہی نہ لے''

'میری بیٹی بڑی سمجھدار ہے اس نے اماں کے اس قول کو سچ مان کر رضا سے شادی کر لی اس کی شادی کی پہلی سالگرہ تھی جب اس کی ساس نے عزت کی خاطر ایک مہنگا سا سوٹ لنڈا سے خریدا وہ اسے استری کر رہی تھی جب اس کا شوہر جس سے راتوں کو دیر سے آنے پر اس کی بات چیت بند تھی اس کے پاس آگیا۔ایک سادہ سا کاٹن کا سوٹ نگی نے رضا کو دیکھا'' یہ کہاں سے آیا؟

''اس س وٹ کو خریدنے کے لئے تو پیسے جمع کر رہا تھا۔آج پیسے پورے ہوئے تو لے آیا۔اماں نے کہا آج تو ہماری شادی کی سالگرہ ہے

وہ اس کے قریب آیا' [تجھ سے کبھی نہیں کہا لیکن دل مین ٹھان لیا تھا بھلے سال مُن ایک سوٹ

خانہ کعبہ

☆...... دنیا کی سب سے پہلی عمارت ہے۔

☆...... دنیا کی سب سے منفرد اور پاک عبادت گاہ ہے۔

☆...... دنیا کی سب سے بڑی مسجد مسجد الحرام ہے۔

☆...... دنیا کی واحد عمارت ہے جس کو غلاف سے ڈھانپا جاتا ہے۔

☆...... دنیا کی واحد عمارت ہے جو ساری دنیا کے وسط میں ہے۔

حسنِ انتخاب: افشاں۔لندن

ہی دوں گا تجھے لیکن اترن نہیں پہنے گی میری نگی۔

اس کے نگیہ کہنے سے نگی کو لگا اس سال کی ساری تکلیفیں کسمپری سب ٹھنڈی ہوا میں بدل گئے ہوں۔وہ رضا کے کندھے سے سر ٹکائے بس روئے جاتی تھی اسے بس اس پل اچانک الہام ہوا تھا رضا سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔کیوں کے رضا نے اسے محبت تو کی ساتھ عزت نفس کی بھی بڑی پاسداری کی۔

جلدی سے تیار ہو جا تیرے ابا جی اور بیپے آنے والی ہوگی۔شاید بھرجائی بھی آئیں

وہ مسکراتی سوٹ لئے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا سے اپنا آپ ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔شاید محبت انسان کو ایسے ہی ہلکا لیکن۔سحر انگیز کر دیتی ہے۔جیسے کی وہ۔

اس نے پلٹ کے دیکھا رضا اسی کی طرف دیکھے جا رہا تھا اس کے دیکھنے سے جز بز ہوا پھر خود بھی ہنسنے لگا۔اس کی بیوی تھی جیسے مرضی آئے دیکھے۔

☆☆......☆☆

جب لوگوں کو پتا چلا کہ بریانی ان کی بیٹی سے شادی کرنے والا ہے تو کئی بھی خوابوں نے کہا بھی کہ وہ ایک ایسے شخص سے اپنی بیٹی کیوں بیاہ رہے ہیں کہ جس کی وجہ سے وہ اعصابی تناؤ کا شکار ہو گئے تھے۔ ایسے خوفناک شخص کے سائے سے بھی بچنا چاہیے کجا یہ کہ اس سے......

مشہور و معروف ادیب محترم شفیق الرحمٰن (مرحوم) کے بارے میں ایک پاکستانی ڈائجسٹ نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "شفیق الرحمٰن کو کون نہیں جانتا، شاید وہ نہ جانتے ہوں، جو ہنسنا نہیں جانتے۔" پروفیسر بریانی کے متعلق میری ماہرانہ رائے کو تھوڑے سے لفظی ردوبدل کے ساتھ کچھ یوں ہے کہ پروفیسر بریانی کو کون نہیں جانتا۔ شاید وہ نہ جانتے ہوں جو گھبرانا نہیں جانتے۔ چند ایک استثناء کے ساتھ اس روئے زمین پر کوئی ایسا ذی نفس پیدا نہیں ہوا جو کبھی نہ کبھی گھبرایا نہ ہو۔ اس مستثنیٰ لوگوں میں ہٹلر، چنگیز خان اور خود پروفیسر بریانی شامل ہیں کہ جو خود کبھی نہیں گھبرائے البتہ دوسروں کی گھبراہٹ کا موجب ضرور بنے۔ فی زمانہ ہر شخص کی اصل گھبراہٹ کا سبب غیر یقینی حالات، معاشرے میں انارکی کا رجحان، عالمی کساد بازاری، امریکا کی چوہدراہٹ کے علاوہ پروفیسر بریانی کی ذات ہے۔ اس فہرست میں اول نمبر پر بریانی صاحب آتے ہیں۔

مشہور فنکار قاضی واجد جیسی شکل اور بہروز سبزواری کے ایک کردار "قباچہ" جیسی عقل والا ایک شخص جو بیہودہ طریقے سے ڈبل پتی والا پان چباتے ہوتے نظر آتا ہے اور جسے دیکھ کر اس کے دوست احباب مارے گھبراہٹ کے پسینے پسینے ہو جاتے ہیں اور دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد کرنے لگتے ہیں وہ شخص بھلا پروفیسر بریانی کے سوا اور کون ہوسکتا ہے۔ جہاں تک شکل اور عقل کا تعلق ہے تو معاملہ برعکس بھی ہوسکتا ہے مگر اس سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ بریانی تو ہر حال میں بریانی ہی ہے۔ گھبراہٹ پیدا کرنے والی آٹو میٹک مشین۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بیگم بریانی چھٹی والے دن صبح ہی صبح دھکے مار انہیں گھر سے باہر نکال دیتی ہیں کہ انہیں جتنی گھبراہٹ پھیلانی ہے باہر پھیلائیں گھر کے اندر نہ پھیلائیں۔

ممکن ہے بیگم بریانی کا یہ عمل خود ان کی ذات کے لیے سود مند ہو دیگر لوگوں کے لیے نقصان دہ

ہی ثابت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بریانی صاحب کا ہر ملنے والا جب گھر سے نکلتا ہے تو یہی دعا کرتا ہوا گھر سے چلتا ہے کہ اسے بریانی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔

پروفیسر بریانی نہ کسی کالج کے پروفیسر ہیں اور نہ ہی کوئی عامل کہ جو اپنے آپ کو پروفیسر کہلواتے ہیں۔ اصل میں پروفیسر بریانی کو اخبارات پڑھنے کی بلکہ انہیں چاٹنے کی عادت ہے صبح سے لے کر شام تک وہ دفتر میں کرسی پر پاؤں پسارے دنیا جہاں کے اخبارات چاٹتے رہتے ہیں پھر یہ سب خبریں، پروپیگنڈے افواہیں جو انہوں نے صبح سے لے کر شام تک نگلی ہوتی ہیں انہیں اگلنے کے لیے شام سے لے کر رات تک شکار کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں جو بدنصیب مل جائے اسے یہ ساری خبریں افواہیں اور بے پر کی سنا ڈالتے ہیں۔ کچھ نمک مرچ اپنی طرف بھی لگا دیتے ہیں اگر وہ صرف اچھی اور مزے دار خبریں سنانے کے عادی ہوتے تو شاید لوگ ان کا بے چینی سے انتظار کرتے رہتے مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ صرف بری خبریں اور خطرناک قسم کی افواہیں سناتے ہیں جنہیں سن کر اچھے بھلے ہنستے ہوئے شخص کا دل دہل اٹھتا ہے اور وہ بے چارہ ٹینشن کا شکار ہو جاتا ہے ایک محتاط اندازے کے مطابق اخبارات اور ٹیلی ویژن کے مختلف چینلز جتنا ڈپریشن معاشرے میں پھیلا رہے ہیں اس سے کئی گناہ زیادہ ڈپریشن ایک اکیلے پروفیسر بریانی پھیلا رہے ہیں۔

کئی لوگوں کی رائے یہ ہے کہ انہیں گرفتار کر کے نقص امن کے جرم میں یا تو قید کر دیا جائے یا پھر امریکہ بھجوا دیا جائے تا کہ وہ وہاں جا کر یہ کام کریں اور دہشت گردی میں اپنا نام کمائیں کہ جتنی دہشت نائین الیون کے واقعے نے پھیلائی تھی اس سے کہیں زیادہ دہشت ایک تنہا پروفیسر بریانی کی ذات پھیلا سکتی ہے۔

خبریں، افواہیں اور ان پر تبصرے۔ پروفیسر بریانی کی اسی صفت کی وجہ سے یار لوگوں نے انہیں پروفیسر کا خطاب دیا ہے۔ بریانی ان کا نام نہیں چڑ ہے۔ موصوف اب اپنے اصل نام سے زیادہ پروفیسر بریانی کے نام سے ہی نہ صرف جانے جاتے ہیں بلکہ ان کا نام خوف و دہشت کی علامت بن گیا ہے۔ فلمی ڈائیلاگ کی مثل۔ ''جب تین تین کوس دور تک بچے راتوں کو روتے ہیں اور سوتے نہیں تو مائیں اپنے بچوں کو ڈراتی ہیں کہ بیٹا سو جا ورنہ ابھی پروفیسر بریانی آ جائے گا۔'' یعنی پروفیسر بریانی نہ ہوا گبر سنگھ ہو گیا۔ فلم 'شعلے' کے گبر سنگھ کو تو دو دوستوں نے مل کر تباہ و برباد کر دیا تھا، پروفیسر بریانی کو تباہ کرنے میں صرف اور صرف ان کے سسر کا کمال ہے۔

ہوایوں کہ بریانی ہر روز شام کو اپنے دور کے چچا کے پاس جا کر بیٹھا کرتے تھے اور انہیں دن بھر کی خوفناک خبریں اور خطرناک افواہیں سنایا کرتے جس کی وجہ سے بے چارے اعصابی تناؤ کا شکار ہو گئے۔ آخر ان کا علاج کرایا گیا۔ ماہر نفسیات کے پاس لے جایا گیا۔

ان کے معالج نے انہیں جب یہ بتایا کہ یہ اعصابی تھکن بری بری خبریں اور بے ہودہ افواہیں سننے کی وجہ سے ہوئی ہے تو انہوں نے فوراً انتقام لینے کی قسم کھالی۔ ٹھیک ہونے کے بعد انہوں نے کچھ ایسا چکر چلایا کہ بریانی ان کی بیٹی سے عقد کے لیے تیار ہو گئے۔

جب لوگوں کو پتا چلا کہ بریانی ان کی بیٹی سے شادی کرنے والا ہے تو کئی بہی خوابوں نے کہا بھی

کہ وہ ایک ایسے شخص سے اپنی بیٹی کیوں بیاہ رہے ہیں کہ جس کی وجہ سے وہ اعصابی تناؤ کا شکار ہوگئے تھے۔ ایسے خوفناک شخص کے سائے سے بھی بچنا چاہیے کجا یہ کہ اس سے رشتے داری قائم کر دی جائے۔

وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ''بھئی یہ تو میں بریانی سے انتقام لینے کے لیے کر رہا ہوں۔''

لوگوں نے پوچھا۔ ''انتقام! وہ بھلا کیسے؟''

مسکراتے ہوئے بولے۔ ''میں تو ایک بار اعصابی تناؤ کا شکار ہوا اور علاج معالجے سے ٹھیک ہوگیا۔ اب یہ کم بخت بریانی ساری عمر اعصابی تناؤ کا شکار رہے گا۔''

پھر حقیقتاً یہی ہوا۔ شادی کے بعد بریانی واقعی ہمہ وقتی اعصابی تناؤ کا شکار رہنے لگے۔ کیوں کہ ان کی بیگم ہر وقت انہیں جھاڑ پلاتی رہتی ہیں اور ان پر طنز و طعنے کے تیروں کی بارش کرتی رہتی ہیں ویسے بھی جب بریانی اپنی بیگم کو لے کر کہیں جاتے ہیں تو اجنبی لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ماں اور بیٹا آ رہے ہیں۔ چونکہ بریانی کو گھر میں سکون حاصل نہیں اس لیے وہ زیادہ تر وقت گھر سے باہر صرف کرتے ہیں اور معصوم لوگوں کو پکڑ کر انہیں خوف ناک اور دل دہلا دینے والی افواہیں اور خبریں سناتے رہتے ہیں۔ بعض مظلوم تو ان سے ملاقات کے فوری بعد بازار کا رُخ کرتے ہیں اور دو چار مہینوں کا راشن بھر لیتے ہیں کہ بریانی کی وحشت انگیز باتیں سن کر انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ عنقریب شہر میں زبردست خون ریزی ہونے والی ہے اور کم از کم دو چار مہینے کا کرفیو نافذ ہونے والا ہے۔

خبری اور افواہیں سنانے کے علاوہ پروفیسر بریانی کو پیشن گوئیاں کرنے کی بھی عادت قبیحہ ہے چنانچہ اکثر الٹی سیدھی پیشن گوئیاں کرتے ہیں جس میں سے ننانوے فیصد غلط ثابت ہوتی ہیں۔ بقیہ ایک فیصد جو سچ ہوتی ہیں کچھ اس قبیل کی ہوتی ہیں کہ اس سال جمعتہ الوداع رمضان کے آخری جمعے کو ہوگا یا عاشورہ اس برس بھی دس محرم کو منایا جائے گا یہ کہ یوم مئی اس سال بھی مئی کے پہلی تاریخ کو ہوگا وغیرہ۔

ایک بار کہنے لگے۔ ''یار اس سال دو دفعہ سورج گرہن ہوگا۔

میں نے یونہی از راہ تمسخر پوچھ لیا۔ یہ تو بتاؤ کہ دونوں بار دن میں ہوگا یا ایک بار دن میں اور ایک بار رات میں ہوگا۔

دیر تک سر کھجاتے رہے پھر بولے۔ ''یار پتا تو نہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ ایک سال میں دو دو سورج گرہن ہونا اچھی بات نہیں اگر سورج اتنی جلدی جلدی گہنانے لگے گا تو بہت جلد بجھ جائے گا۔''

ایک بار بے حد گھبرائے ہوئے آئے اور کہنے لگے۔ یار تمہیں پتا ہے سو سال بعد پانی اس قدر آلودہ ہو جائے گا کہ اس پانی کو پینے سے طرح طرح کی بیماریاں پھوٹ نکلیں گی۔''

میں نے کہا۔ ''سو سال بعد کیوں بھائی پانی تو اب بھی ایسا ہی سپلائی ہو رہا ہے۔''

کہنے لگے۔ ''نہیں تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ سو سال بعد پانی بے حد زہریلا ہو جائے گا، تمام آبِ حیات ختم ہو جائے گی، پیتے ہی منہ میں آبلے پڑ جائیں گے، بدن جھلسنے لگے گا اور لوگ دھڑا دھڑ مرنے لگیں گے یار سوچو اس وقت ہمارا کیا بنے گا۔ ہم پانی کیسے پئیں گے؟''

مجھے یقین تھا وہ کسی اخبار میں دل دہلا دینے والی رپورٹ پڑھ کر آئے ہیں کہ ایسی بھیانک

رپورٹس اکثر منظر عام پر آتی رہتی ہیں کہ ''آئندہ دس سال میں دنیا کی آبادی دگنی ہو جائے گی۔ آئندہ بیس سال میں اناج کا قحط پڑ جائے گا۔

آئندہ تیس سال میں لوگ خود بخود پاگل ہو جائیں گے۔

کچھ عرصے کے بعد کوئی بہت بڑا شہاب ثاقب زمین سے ٹکرا جائے گا۔

فلاں تاریخ کو قیامت آجائے گی اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ روئے زمین پر صرف عورتوں کی آبادی رہ جائے گی۔ مرد نسل ختم ہو جائے گی وغیرہ۔ بریانی اکثر اسی قسم کی رپورٹس پڑھ کر حواس باختہ ہو جاتے تھے۔ اور اپنی بد حواسی دوسروں میں منتقل کرتے تھے مجھے چونکہ ان کی بد حواسی کی اصل وجہ پتا ہے اور تجربے نے مجھے سکھا دیا ہے۔ لہٰذا بجائے میں ہوش کھونے کے معاملے کو ہنسی میں اڑا دیتا ہوں اس لیے میں نے اس سے کہا۔ ''یار اگر پانی سو سال بعد اتنا خراب ہو جائے گا تو کیا فکر ہے میرے پاس اس کا بہترین حل موجود ہے۔''

حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر بولے۔ ''اچھا، تمہارے پاس اس کا توڑ ہے۔ کیا حل ہے یار مجھے بھی تو بتاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''مسئلہ کچھ بھی نہیں اگر پانی خراب آنے لگے تو ہم صرف اتنا کریں گے کہ پانی دھو دھو کر پیا کریں گے۔

خوشی سے بولے۔ ''ارے یار واقعی یہ تو بہت سیدھی سی بات ہے۔ حیرت ہے اتنی سیدھی سی بات میری سمجھ میں پہلے کیوں نہ آئی۔''

''اس کی وجہ بالکل صاف ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تم سیدھی باتوں پر کبھی غور ہی نہیں کرتے۔ ہمیشہ آڑی ترچھی اور مشکل باتوں پر غور کرتے ہو۔''

''ہاں یہ تو مسئلہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟''

''اس کی بھی سیدھی سی وجہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور وہ یہ کہ تم پیدائشی طور پر انٹلکچوئل ہو۔''

کہنے لگے۔ ''یار یہ انٹلکچوئل کیا ہوتا ہے؟''

''ارے تم نہیں جانتے یہ کیا ہوتا ہے؟'' میں نے مصنوعی حیرت سے پوچھا، پھر کہا۔ ''یار یہ وہ ہوتا ہے کہ جس کی باتیں کسی کی سمجھ میں نہیں آئیں حتیٰ کہ خود اس کی بھی۔''

''اچھا، اگر ایسا ہے تو پھر میری بیگم بھی شاید یہی ہیں۔ ان کی بھی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔

بریانی معصومیت سے بولے۔

''مثلاً۔'' میں نے لقمہ لیا۔

''مثلاً! یہ کہ...... یہ کہ......'' بریانی تھوڑی دیر سوچتے رہے اور پھر بولے ''ہاں مثلاً کہ یہ میں روزانہ دفتر جاتے ہوئے اپنی بیگم سے یہ کہتا تھا کہ اچھا خدا حافظ چار بچوں کی ماں۔ بیگم بیگم یہ سن کر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتی تھی، مگر بے چاری منہ سے کچھ نہ کہہ سکتی تھی کہ وہ واقعی میرے چار بچوں کی ماں ہے۔ لیکن ایک دن پتا نہیں کیا ہوا کہ جب میں اس سے یہ کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ اچھا خدا حافظ تین بچوں کے باپ۔''

بریانی کی زبانی یہ سن کر میرا جی چاہا کہ میں ایک زوردار قہقہہ لگاؤں مگر میں نے ضبط سے کام لیا اور اپنے اس قہقہے کو بالکل اسی طرح دفن کر دیا جیسے لوگ اپنے پیدا ہونے والے بچوں کو سبز ستارہ کے طفیل دفن کر دیتے ہیں۔

بریانی بولے۔ ''یار میری سمجھ میں نہیں آیا کہ

اس کا مطلب کیا ہوا۔؟''

''مطلب صاف ظاہر ہے۔''میں نے کہا۔

''اصل میں تم اس قدر نوجوان دکھتے ہو کہ کسی بھی طرح چار بچوں کے باپ نہیں لگتے۔

تمہاری بیگم نے تو ایک طرح سے تمہاری تعریف کی ہے اور اس بات کا اقرار کیا ہے کہ تمہارے مقابلے میں وہ بڑی عمر کی نظر آتی ہیں۔''

''اوہ! یہ مطلب تھا یار میں اب سمجھا۔ بریانی خوش ہو کر بولے۔

نازیوں کا وتیرا تھا کہ وہ اس قدر جھوٹ بولا کرتے تھے اور بار بار بولا کرتے تھے کہ لوگ اسے سچ سمجھنے لگیں۔ پروفیسر بریانی کی عادت ہے کہ وہ سچ بھی کچھ اس طرح بولتے ہیں کہ لوگ جھوٹ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ انہیں بی بی سی کہتے ہیں۔ ان کی مثال اس گڈریے کی طرح ہے کو جھوٹ موٹ شیر آنے کی دہائیاں دیا کرتا تھا اور پھر جب ایک بار سچ مچ شیر آیا تو لوگ یہی سمجھتے تھے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ چنانچہ جب پچھلے سال ان کی کمر میں چک پڑ گئی تو سب سمجھے کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ اس لیے کوئی ایک شخص بھی اتنا احمق نہیں کہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالے۔ پروفیسر بریانی کی عیادت کو جائے اور ان کی باتیں سن کر مفت میں اعصابی کھنچاؤ کا شکار ہو کر گھر لوٹے۔ سنا ہے جتنے عرصے میں وہ صاحب فراش رہے ان کے دوست احباب ہی عرصے سے ذہنی دباؤ سے آزاد رہے۔ بلکہ کئی لوگوں نے تو باقاعدہ منت مان کر ان کی درازئی تکلیفیں کی دعائیں تک مانگیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کوئی بیس برس پہلے جب ایک وکیل دوست کے توسط سے میری پروفیسر بریانی سے پہلی ملاقات ہوئی تو میں ان سے بے حد متاثر ہوا۔ ان کی سیاسی معلومات اور حالات حاضرہ پر گہری نظر اور مستقبل کے بارے میں ان کی پیشن گوئیاں مجھے وہ شکل چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا لگا۔ جب میں نے اپنے وکیل دوست سے ان کے بارے میں یہ کہا کہ یہ شخص معلومات کا خزانہ ہے اور اس سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے تو میرے وکیل دوست نے مسکرا کر جواب دیا۔

''صرف آپ کو ہی نہیں، پہلی ملاقات کے بعد ہر شخص کو بریانی سے مل کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔''

شروع ہی کی ملاقاتوں میں انہوں نے میرے کان بھرنے شروع کر دیے۔ شہر کے حالات پر تبصرہ کر کے دور کو کوڑی لاتے اور کہتے۔''یہ سب سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا جا رہا ہے۔ یہ سب سی آئی اے کا پلان ہے۔ عنقریب برطانیہ کو ہانگ کانگ خالی کرنا پڑے گا اس لیے منصوبہ یہ ہے کہ کراچی کو ہانگ کانگ بنا دیا جائے۔

ابتدا میں تو خوش ہوا کرتا کہ چلو کراچی کی قسمت کھل جائے گی۔ یہاں کاروباری ترقی ہوگی، بڑی بڑی عمارتیں بنیں گی، ......صنعت و حرفت پروان چڑھے گی، بیرونی سرمایہ کاری بڑھے گی۔ دور دراز سے لوگ بغرض سیاحت یہاں آنے لگیں گے، لوگوں کا روزگار بڑھے گا۔ شہر ترقی کرے گا، سڑکیں بنیں گی، پینے کو صاف پانی ملے گا، سیوریج کا بوسیدہ نظام ترقی یافتہ ہو جائے گا، مگر جب چار برسوں میں بھی ہانگ کانگ اپنی جگہ بدل کر کراچی نہیں آیا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ ادھر بریانی بھی تو کوئی کچے کھلاڑی نہیں تھے۔ انہوں نے فوراً اس تبدیلی شہر کی تاریخ میں اضافہ

کردیا۔

پھر تو ایسا لگا جیسے یہ کیس داخل عدالت کر دیا گیا ہو۔ ہر بار تاریخ بڑھا دی جاتی اور فیصلے کا وقت آگے کھسک جاتا۔ تاریخیں بڑھتی گئیں حتی کہ پندرہ سال گزر گئے برطانیہ اور چین کے مابین ہانگ کانگ کا مسئلہ بھی بہ حسن بخوبی نمٹ گیا اور میں کراچی میں بیٹھا ہانگ کانگ کا انتظار کرتا رہا۔

اس لیے جب ایک بار پروفیسر بریانی یہ دل دہلا دینے والی خبر لے کر آئے کہ عنقریب کراچی بیروت بن جائے گا تو میں نے انہیں خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کی ہانگ کانگ والی تھیوری کے پرخچے اڑا دیے کہ ہانگ کانگ کا معاملہ برطانیہ اور چین کے مابین تھا، امریکی سی آئی اے کے پیٹ میں کون سا درد تھا کہ وہ اتنی لمبی منصوبہ سازی کرتی اور کراچی کو ہانگ کانگ بنواتی۔ اب جو یہ کراچی کو بیروت بنانے والی بات ہے تو یہ بھی بس کسی بیوقوف کی خیال آرائی ہے جسے میں صرف ہوائی سمجھتا ہوں۔ زندگی میں پہلی بار پروفیسر بریانی ٹپٹا گئے۔ ان کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوگا کہ میرے جیسا صابر سامع بھی یوں بدک سکتا ہے بہر حال وہ آئندہ کے لیے محتاط ہو گئے۔ ادھر میں نے بھی یہ کیا کہ ان کی ہر خبر، ہر افواہ کا فی الفور پوسٹ مارٹم کرنا شروع کر دیا۔

لیکن مجھے حیرت اپنے اس وکیل دوست پر ہے کہ جن کے توسط سے بریانی نے مجھ تک رسائی پائی تھی۔ پیشے کے اعتبار سے وکیل ہونے کے باوجود وہ بریانی کے جال میں پھنس گئے تھے۔

حالانکہ وکیلوں کے متعلق یہ مشہور ہے کہ جو ایک بار ان کے شکنجے میں آجائے جیتے جی بچ کر نہیں نکل سکتا۔ سیدھے سادے سے مقدمے کو بھی اتنا پیچیدہ کر دیتے ہیں کہ موکل بے چارہ یا تو مقدمہ واپس لے لیتا ہے یا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اور جنت میں کسی معاملے میں کسی جنتی کو اپنے دوسرے ساتھی پر مقدمہ کرنا پڑا تو وہ مقدمہ یوں نہ چل سکے گا کہ دونوں کو مقدمہ لڑنے کے لیے کوئی وکیل دستیاب نہ ہو سکے گا۔ کہتے ہیں ایک بار کوؤں کا عالمی کنونشن منعقد ہوا۔ جس میں اتفاق رائے سے یہ قرارداد منظور کی گئی کہ کوے تو خیر سیانے ہوتے ہیں لیکن اگر کوے سے بھی زیادہ سیانا ہوتا ہے تو وہ وکیل ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وکیل صاحبان بھی کالا کوٹ پہنتے ہیں۔

اس قدر سیانا ہونے کے باوجود وکیل صاحب کا پروفیسر بریانی کے جال میں پھنس جانا جہاں حیرت کا سبب ہو سکتا ہے۔ وہیں پروفیسر بریانی کی چابکدستی کا بھی بین ثبوت ہے۔ مسلسل کئی ہفتوں تک بلا ناغہ بریانی سے ملتے رہنے کا نتیجہ کچھ یوں برآمد ہوا کہ وکیل صاحب نے پہلے تو کام پر جانا چھوڑ دیا، اس کے بعد گھر میں ہی مقید ہو کر رہ گئے۔ ہمہ وقت انجانے خوف اور وسوسوں کا شکار رہنے لگے۔ انہیں ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا کہ عنقریب شہر میں فرقہ ورانہ فسادات پھوٹ پڑیں گے۔ شہر کی سڑکوں پر خون کی ندیاں بہنے لگیں گی۔ ہر شخص دوسرے شخص کو جان سے مارنے کے درپے ہوگا جگہ جگہ بم دھماکے ہوں گے۔

کچھ تو شہر کے حالات واقعی کشیدہ تھے اوپر سے بریانی نے مستقبل کا ایسا خوفناک سماں باندھا کہ وکیل صاحب شدید قسم کے ذہنی خلفشار میں مبتلا ہو گئے۔ جب مرض بڑھ گیا تو ایک ماہر نفسیات سے ان کا علاج کروایا گیا۔ کچھ ہی عرصے میں وہ ٹھیک ہو گئے مگر اب وکیل صاحب

کے بنگلے کے گیٹ پر ایک بڑا سا بورڈ آویزاں ہے۔ ''بریانی کا داخلہ ممنوع ہے۔''

پروفیسر بریانی تو ایک طرف وکیل صاحب کے بنگلے میں اب سچ مچ کی بریانی بھی نہیں جا سکتی۔ بورڈ لگنے کے باوجود بریانی نے ایک دو بار وکیل صاحب سے ملنے کی کوشش کی مگر چوکیدار کے جارحانہ رویے کے بعد وہ اس طرف جانے سے احتراز کرنے لگے ہیں۔ ادھر وکیل صاحب کی دیکھا دیکھی بریانی کے کچھ اور شکاروں نے بھی اسی طرز کے بورڈ بنوا کر اپنے اپنے دروازوں پر لگوا دیے ہیں۔

کہتے ہیں کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ باپ کی میراث اولاد میں ضرور منتقل ہوتی ہے۔ کچھ یہی حال بریانی کے صاحب زادے کا بھی ہے۔

ایک تقریب میں بریانی صاحب اپنے ہونہار صاحب زادے کے ساتھ تشریف لائے۔ ہم باتیں کر رہے تھے۔ بریانی حسب عادت ڈبل پتی والا پان چبا رہے تھے ان کا فرزند بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے میٹھا پان چڑ چڑ کر کے کھا رہا تھا۔ وہ بھی انے باپ کی طرح عجیب بیہودہ سی آوازیں نکال کر پان چبا رہے تھے۔ بریانی صاحب حسب توفیق افواہیں پھیلانے میں مصروف تھے۔ بیٹا قریب کھڑا تھا۔ اس کی چڑ چڑ کی آوازیں بریانی کو ڈسٹرب کر رہی تھیں۔ غصے میں آ کر انہوں نے بچے کو دھکا مار کر کہا۔ ''ابے کیا جانوروں کی طرح پان چبا رہا ہے، ذرا دور ہٹ۔''

میں نے کہا۔ ''یار بریانی خواہ مخواہ بچے کو ڈانٹ دیا۔ دیکھو کیسا ڈر گیا۔

بریانی بولے۔ ''یار تم دیکھتے نہیں کیسا بے ہودہ ہے۔ کان میں آوازیں نکال رہا ہے پان کھانے کی بھی تمیز نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''یار تو اس کے باپ کو کون سی تمیز ہے، ویسے بھی تو ایسے ہی پان چباتا ہے۔''

ناراض ہو کر بولے۔ ''یار میں کب ایسے بے ڈھنگے پن سے پان کھاتا ہوں۔''

میں نے کہا یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ یہ میری سفید قمیض پر جو لال رنگ کے چھینٹے نظر آ رہے ہیں یہ گل کاری آپ ہی کی مرہونِ منت ہے۔''

بریانی یہ سن کر چپ ہو رہے اور مجھ سے ذرا دور ہو کر بیٹھ گئے۔ مگر ان کی افواہ سازی کی فیکٹری بدستور کام کر رہی تھی۔ اچانک ان کا بیٹا درمیان میں بول پڑا۔ ''ابوابو اس جمعہ کو ہڑتال ہوگی۔''

میں نے چونک کر بچے کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''بیٹا یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔''

بچہ بولا! کل ہمارے محلے میں فائرنگ ہوئی تھی اور دو سیاسی کارکن زخمی ہو گئے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''بیٹا زخمی ہونے پر ہڑتال کب ہوتی ہے۔''

بچہ کہنے لگا۔ ''ان میں ایک کی حالت خراب ہے اگر وہ مر گیا تو جمعہ والے روز ہڑتال ضرور ہوگی۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔ مجھے ہنستا دیکھ کر بریانی نہ سمجھنے والے انداز میں میری طرف دیکھنے لگے۔

میں نے کہا۔ ''واہ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ ہم تو سمجھے تھے کہ بریانی ہی ٹینشن پھیلا سکتا ہے۔ آج پتا چلا ہے کہ زردہ بھی کچھ کم نہیں۔''

حاضرین محفل میری بات پر ہنس پڑے۔ اب جب بھی بریانی اپنے بیٹے کے ساتھ کہیں جاتے ہیں تو لوگ یہی کہتے ہیں کہ لو جی بریانی کے ساتھ زردہ بھی آ گیا۔ خدا خیر کرے۔''

☆☆......☆☆

نئے لہجے نئی آوازیں

انزا کا نذرانہ عقیدت اپنے بھائی کے لیے

اپنے سقا (موسیٰ رضا) کو یوں عباسؑ لا رہے ہوں گے
رضائے رب پہ جو سر کو جھکا رہے ہوں گے
فرشتے خلد میں مسند لگا رہے ہوں گے
نبی کے ساتھ بہشت میں وہ جا رہے ہوں گے
علیؑ کے سایہ دامن میں آ رہے ہوں گے
دعائیں وہ درز ہرا سے پا رہے ہوں گے
حسنؑ بھی جام یوں کوثر کے لا رہے ہوں گے
حسینؑ بڑھ کر گلے سے لگا رہے ہوں گے

شاعرہ: سوگوار انزا النقوی۔ کراچی

دلاسہ

تم سے بچھڑ کر مجھے یقین ہو چلا ہے کہ......
واقعی کسی سے بچھڑ کر کوئی مر تو نہیں جاتا
ہاں، بس ذرا جینے کے انداز بدل جاتے ہیں
کسی کو کھو کر ماہتاب سی نیندیں بچھڑ جائیں
تو کیا ہوا کسی کو پا کر بھی تو رت جگے مقدر بن جاتے ہیں

شاعرہ: روبینہ ناز روبی۔ فیصل آباد

غزل

تمہار کہانی کہاں سنی جائے گی
خود غرضوں سے کبھی اپنی کتھا نہ کہو
اس طرح ٹوٹ کے بکھرنے سے کیا حاصل
جینا ہے تو پھر بڑی شان سے جیو
نہ سوچو تم نے درد بانٹا تھا اسکا
اپنے دکھ کو صبر کے گھونٹ سے پیو
کتنے سلسلے تھے ماضی میں تیرے ساتھ جڑے
بات اب یہیں رہنے دو بس اپنی کہو
ہم نے تو یہ کہا تھا تم سے جاتے سے

گر بچھڑ جائیں تو پھر خوابوں میں ملو
ہم صرف حرف نہیں پڑھ لیں گے
تم لفظ بن کر ہمیں کتابوں میں ملو

شاعرہ: صائمہ بشیر

غزل

درد سینے میں صنم کرو
ابھی جگہ ہے اور ستم کرو
یہ کس نے کہا تم سے......
میری بربادی کا ماتم کرو
تم ہی نے فاصلے بڑھائے تھے
تمہی یہ فاصلے کم کرو
اشکوں کے دیے جلے ہیں
لو چراغوں کی مدھم کرو
مجھے بلانے سے پہلے ذرا تم
بیتے دنوں کا ماتم کرو
شب غم منتظر ہے آؤ
دل توڑنے کی رسم کرو
ساتھ رہنے کا جو وعدہ تھا
اک بار پھر میرے صنم کرو

شاعرہ: فصیحہ آصف خان۔ ملتان

عجب سانحہ

حقیقتوں میں تلخیاں رقص کرتی ہیں
سوچوں میں میری
خاموشیاں شور کرتی ہیں
عجب سانحہ ہے عاشا
صحرا آنکھوں سے آنسو نہیں رکتے

ادراک میں میری محبت
محبت نہیں رہتی
تم خود ہی بتاؤ
میں مسکراؤں تو کیسے؟
شاعرہ: عائشہ نورعاشا۔شادیوال، گجرات

گھٹن رہی ہے سدا کاش اب تو ایسا ہو
حیات جرم نہ ہو زندگی وبال نہ ہو
شگفتہ سنگ تیرے یونہی مسکراتی رہے
خزاں چھائے ایسا کوئی بھی سال نہ ہو
شاعرہ: شگفتہ شفیق

وہ کون تھی؟

اک سرمئی شام میں
اجنبی راہوں میں
پریشان حال کھڑی
میری نظریں پڑیں
اک لمحے کو بھول گیا سب
چہرے پہ اس کے شبنمی قطرے
موتی بن کر چمک رہے تھے
ماتھے پہ اٹھلاتی ہوئی لٹ
حسن پہ جیسے پہرہ دار ہو
سارا قرار لوٹ کر
جانے کہاں سے آئی تھی
اور کہاں گئی وہ
بس اک سوال رہ گیا
وہ لڑکی کون تھی
شاعرہ: شبانہ نسیم۔کراچی

غزل

تمہاری یاد کا سر پہ یہ آنچل کیوں نہیں رہتا
بہت ہی دیر تک آنکھوں میں یہ بادل کیوں نہیں رہتا
میں ہنستی ہوں تو مری آنکھوں سے انسو چھلکتے ہیں
میری آنکھوں کی جھیلوں میں یہ کاجل کیوں نہیں رہتا
میرے ویران کوچے میں ٹھہرتا ہی نہیں لیکن
وہ میرے پاس بھی آ کر مسلسل کیوں نہیں رہتا
وہ میری زندگانی کا اثاثہ بن گیا پھر بھی
وہ میری زندگانی میں مکمل کیوں نہیں رہتا
بہت دن سے میں تمثیلہ اسی کو یاد کرتی ہوں
میری ویران گلیوں میں وہ پاگل کیوں نہیں رہتا
شاعرہ: تمثیلہ لطیف۔ پسرور

غزل

تم سامنے رہو اور کوئی سوال نہ ہو
میری حیات میں ایسا ماہ و سال نہ ہو
تو سر جھکائے جو لوٹا تو دل نے یہی کہا
خدا کرے تیری اُلفت کو اب زوال نہ ہو
ہم ساتھ ساتھ چلیں دم قدم ہمیشہ یونہی
دور دور تلک بھی کوئی مثال نہ ہو
محبتوں میں کبھی ایسا وقت نہ دیکھوں
جدائی پر بھی تیری یہ دل پُر ملال نہ ہو

غزل

کچھ خود بھی تھے افسردہ سے
کچھ لوگ بھی ہم سے روٹھ گئے
کچھ خود ہی زخم کے عادی تھے
کچھ شیشے ہاتھ سے ٹوٹ گئے
کچھ خود بھی تھے حساس بہت
کچھ اپنے مقدر روٹھ گئے
کچھ آپ کو سچ سے نفرت تھی
کچھ ہم سے نہ بولے جھوٹ گئے
کچھ خود بھی ہم محتاط نہ تھے
کچھ لوگ بھی ہم کو لوٹ گئے
کچھ تلخ حقیقتیں تھی اتنی
کچھ خواب ہی سارے ٹوٹ گئے
شاعرہ: رضوانہ کوثر

اسماء اعوان

حمد

نام بھی تیرا عقیدت سے لیے جاتا ہوں
ہر قدم پر سجدے بھی کیے جاتا ہوں
کوئی دنیا میں میرا مونس و غم خوار نہیں
تیری رحمت کے سہارے پہ جیے جاتا ہوں
اس بھروسے پہ خطائیں بھی کیے جاتا ہوں
تیرے اوصاف میں ایک وصف خطا پوشی ہے
آزمائش کا محل ہو کہ مسرت کا مقام
سجدہ شکر بہر حال کیے جاتا ہوں
شاعر: اقبال عظیم۔ انتخاب: نگہت غفار۔ کراچی

حضرت علی کی سنہری باتیں

☆) جب بھی خدا سے دعا مانگو تو نصیب مانگو عقل نہ مانگو کیونکہ میں نے بہت سے عقل والوں کو نصیب والوں کے پاس غلامی کرتے دیکھا ہے۔ (حضرت علی)

☆) کبھی بھی کامیابی کو دماغ میں اور ناکامی کو دل میں جگہ نہ دینا کیونکہ کامیابی دماغ میں تکبر اور ناکامی دل میں مایوسی پیدا کر دیتی ہے۔

☆) جو تمہاری خاموشی سے تمہاری تکلیف کا اندازہ نہ کر سکے، اس کے سامنے زبان سے اظہار کرنا صرف لفظ کو ضائع کرنا ہے۔

☆) جس سے حد سے زیادہ محبت ہو اس سے اتنی ہی نفرت بھی ہو سکتی ہے کیونکہ خوبصورت شیشہ جب ٹوٹتا ہے تو خطرناک ہتھیار بن جاتا ہے۔

مرسلہ: معصومہ رضا۔ گلستان جوہر۔ کراچی

اے اللہ

اشفاق احمد کہتے ہیں کہ میں نے اپنے بابا جی سے پوچھا۔
یہ بے چینی کیوں ہے کیوں اتنی پریشانی ہے؟
کیوں ہم سکون قلب اور اطمینان کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے؟؟
تو انہوں نے کہا۔
دیکھو تم اپنی پریشانی کی پوٹلیاں اپنے سامنے نہ رکھا کرو۔ انہیں خود زور لگا کر حل کرنے کی کوشش نہ کیا کرو۔ بلکہ انہیں اللہ کے پاس لے جایا کرو اور کہو۔
اے اللہ یہ بڑی مشکلات ہیں یہ مجھ سے حل نہیں ہوتیں یہ میں تیرے حضور لایا ہوں تو انہیں حل کر دے اور پھر بے فکر ہو جا۔ اللہ انہیں حل کر دے گا بس ایمان اور یقین کامل ہونا چاہیے۔

مرسلہ: انزا نقوی۔ گلستان جوہر۔ کراچی

جشن

بیوی (شوہر سے) سامنے اس شرابی کو دیکھ رہے ہو۔ دس سال پہلے میں نے اس سے شادی سے انکار کیا تھا آج تک پی رہا ہے۔

شوہر (رشک سے) واہ بھئی واہ اتنا لمبا جشن۔

مرسلہ:

شدت

یہ ہی بہت ہے کہ دل اس کو ڈھونڈ لایا ہے
کسی کے ساتھ سہی وہ نظر تو آیا ہے
کروں شکایتیں تکتا رہوں کہ پیار کروں
گئی بہار کی صورت وہ لوٹ آیا ہے
وہ سامنے تھا مگر یہ یقین نہ آتا تھا
وہ آپ ہے کہ میری خواہشوں کا سایہ ہے

انتخاب: ڈاکٹر شہیلا کاظمی۔ کراچی

کنبہ

ایک آفیسر جیل کا معائنہ کرنے کے لیے دوران ایک قیدی سے ازراہ ہمدردی پوچھنے لگا۔ ''کیوں بھئی تمہیں اپنے گھر سے خیریت کا خط تو آتا ہوگا۔

''جی نہیں۔'' قیدی نے کہا

''کیوں وہ تمہیں خط نہیں لکھتے۔ آفیسر نے پوچھا۔

''جی بات ہی کچھ ایسی ہے کہ خط لکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔'' آپ کی دعا سے میرا سارا کنبہ یہیں ہے۔

مرسلہ: شاہ زیب انصاری۔ جہلم

دانتوں کی چمک دمک کے نسخے

☆ لیموں کے چھلکے سکھا کر پیس لیں ان میں نمک ملا لیں ۔روزانہ دانت اس سے صاف کرنے سے دانتوں کا میل دور ہو جائے گا۔

☆ ایک چمچہ کھانے والا میٹھا سوڈا نمک اور سہاگہ لے کر کسی بوتل میں رکھ لیں۔ روزانہ اس سے دانت صاف کریں۔ دانتوں کی پیلاہٹ دور ہو جائے گی۔

☆ سرسوں کے تیل میں ایک چائے کا چمچہ نمک ملا کر دانتوں پہ لگانے سے دانت سفید ہو جاتے ہیں۔

مرسلہ: مسز شہزاد زیدی۔ میر پور خاص

نفرت

بیوی: مجھے اس فقیر سے شدید نفرت ہے۔
شوہر: لیکن کیوں۔
بیوی: کل میں نے اسے کھانے کے لیے سالن دیا تھا اور آج اس کمبخت نے مجھے کھانا پکانے والی کتاب گفٹ کر دی۔

مرسلہ: احسن رضا۔ اسلام آباد

یقین

اگر تم......
مجسم دیکھ لو خود کو
تو مجھے پورا یقیں ہے کہ
تمہیں میری محبت سے
بلا کا عشق ہو جائے

شاعرہ: سعدیہ عزیز آفریدی۔ کراچی

حاضر جواب

ٹیچر نے بچے کے باپ سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔ میں نے کل آپ کے بچے سے پوچھا کہ اگر میں تین انڈے رمیز کو چار انڈے اور چھ انڈے تمہیں دوں تو بتاؤ میں نے کتنے انڈے دیے اور اس نے جواب دینے کے بجائے شرماتے ہوئے جواب دیا۔ نہیں سر آپ انڈے نہیں دے سکتے۔

مرسلہ: عیحانہ مجاہد۔ کراچی

شیطان

اس دنیا کا پورا نظام شیطان کی وجہ سے چل رہا ہے۔ اگر شیطان نہ رہے تو کوئی انسان نہ رہے سب شیطان ہو جائیں۔ وہ نہ ہوتا تو مولویوں کے بچے بھوکے مر جائیں کہ یہ ہی تو ان کا ذریعہ روزگار ہے شیطان نہ ہو تو وہ کس کے خلاف

تقریریں کریں۔ یہ ساری رقص موسیقی کی محفلیں اس کے دم قدم سے تو ہیں یہ ہی نہیں عبادت گاہیں بھی اس سے پناہ مانگنے کے لیے ہیں۔ اور دنیا میں تو عورت کا تو کوئی کام ہی نہیں رہ جاتا۔ شیطان پہلے سب سے اچھا فرشتہ تھا مگر راتب بنا جب بول پڑا۔ اسی لیے پیدا ہونے والے بچے فرشتے ہوتے ہیں کیونکہ انہیں بولنا نہیں آتا اور جونہی بولنے لگتے ہیں والدین کہتے ہیں یہ شیطان ہوگئے ہیں۔

ڈاکٹر: یونس بٹ کے مضمون سے اقتباس

مرسلہ: راحیل عباس۔ ساہیوال

شوگر کا یقینی علاج

پیارے قارئین اگر آپ میں سے کسی کو شوگر ہے تو انشاء اللہ اس کے استعمال کے بعد اس مرض کا خاتمہ ہوجائے گا۔

100 بادام (کوئی کڑوا نہ ہو)

100 کالی مرچ (ثابت دانے)

100 سبز الائچی (چھلکے والی)

100 نیم کے پتے دھو کر خشک کرلیں۔

ایک پاؤ کالے چنے بھنے ہوئے (چھلکے سمیت)

یہ ساری چیزیں پیس لیں اور دن میں کسی بھی وقت آدھا چائے کا چمچہ استعمال کریں۔

دعاؤں کی طالب: شہناز ہاشمی۔ سیالکوٹ

ڈر

کبھی کبھی جو تیرے قرب میں گزارے تھے
اب ان دنوں کا تصور بھی میرے پاس نہیں
مجھے یہ ڈر ہے کہ تیری آرزو نہ مٹ جائے
بہت دنوں سے طبیعت میری اداس نہیں

انتخاب: ماہین خاور۔ سیالکوٹ

ترقی

جج: مجھے یاد ہے کہ تم کو پچھلے بیس سال سے مسلسل اس عدالت میں مجرم کی حیثیت سے دیکھتا آرہا ہوں۔

مجرم: جناب اس میں میرا کیا قصور ہے کہ آپ کو پچھلے بیس سال سے کوئی ترقی نہیں ملی ہے۔

مرسلہ: انیلا رمضان۔ نوشہرہ

ماں

اس زمانے میں بچے نوکر نہیں پالتے تھے مائیں پالتی تھیں۔ غریب مائیں، امیر مائیں بھونڈی اور پھوہڑ مائیں بیمار اور اپاہج مائیں ہی اپنے بچے خود پالتی تھیں۔ اس کے پاس بچے پالنے کا بڑا آسان پر طریقہ تھا کہ وہ گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ بچے اپنی اپنی اماں سے چالیس پینتالیس گز کے ریڈیئس میں نہیں بھی ہوتے ان کو اچھی طرح سے معلوم ہوتا تھا کہ مشکل وقت میں ایک کی پکار پر ماں بجلی کی طرح جھپٹ کر مدد کے لیے آموجود ہوگی۔ بچوں کے پاس یقین کی ایک ہی دولت ہوتی تھی کہ ماں گھر پر موجود ہے اور وہ ہر جگہ سے ہماری آواز سن سکتی ہے۔ جس طرح پکے پکے خدا پرست کو پورا یقین ہوتا ہے کہ اللہ اس کے حلقے میں ہر وقت موجود ہے اور وہ جب اسے پکارے گا۔ رگ جاں سے بھی قریب پائے گا اسی طرح بچے کو بھی اپنے پکار اور ماں کے جواب پر مکمل بھروسہ ہوتا تھا۔

اشفاق احمد کی تحریر اماں سردار بیگم سے اقتباس)

مرسلہ: ندیا معسود۔ کراچی

مصرعہ

ایک مشاعرے میں شاعر اس مصرعے کو بار بار دہرا رہا تھا......"اس چمن سے یہ جھانکے، اس چمن سے وہ جھانکے۔ لوگ اسے بار بار سن کر پریشان ہوگئے۔ ایک آدمی نے تنگ آکر اس مصرعے کے بعد یہ مصرعہ لگایا۔

"جلادو اس چمن کو نہ یہ جھانکے نہ وہ جھانکے۔"

مرسلہ: زرین زبیر کوٹھاری۔ کراچی

سوچتا ہوں

میں تجھے چاہتا نہیں ہوں لیکن
پھر بھی شب کی طویل خلوت میں
تیرے اوقات میں سوچتا ہوں
تیری ہر بات سوچتا ہوں
کون سے پھول تجھ کو بھاتے ہیں
رنگ کیا کیا پسند آتے ہیں
کھوسا جاتا ہوں تیری جنت میں
میں تجھے چاہتا نہیں ہوں لیکن
پھر بھی احساس سے نجات نہیں
سوچتا ہوں تو رنج ہوتا ہے
دل کو جیسے کوئی ڈبوتا ہے
جس کو اتنا سراہتا ہوں
اس میں تیری سی کوئی بات نہیں

شاعر: جاں نثار اختر۔ پسند: صبوحی کاظمی۔ کراچی

یاد رکھنے کی باتیں

1) بے وقوف آدمی کی دوستی سے بچو۔ کیونکہ کوئلہ اگر گرم ہو تو ہاتھ جلا دیتا ہے اور اگر ٹھنڈا ہو تو ہاتھ کالے کر دیتا ہے۔
2) بے شک بہت دیر تک سوچو لیکن سوچنے کے بعد تمہارا فیصلہ اٹل ہونا چاہیے۔
3) مذہب دل میں ہوتا ہے سجدوں میں نہیں۔
4) جو غم گزر چکا ہے اس پر رنجیدہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ ہم ایک نئے غم کو دعوت دے رہے ہیں۔
5) کبھی کبھی مظلوم کا آنسو ظالم کی تلوار سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔

مرسلہ: مجاہد عباس نقوی۔ کراچی

دہری خوشی

پٹھان (ایرہوسٹس سے) تمہاری شکل ہماری بیوی سے بہت ملتا ہے۔
ایرہوسٹس (غصے سے) بکواس بند کرو۔
پٹھان (خوش ہوکر) ماشاءاللہ زبان بھی ملتا ہے۔

قومی ترانہ

پاکستان کا قومی ترانہ ہمارے ملک کے شاعر جناب حفیظ جالندھری نے لکھا ہے۔ اس میں کل 15 مصرعے ہیں اور اسے 7 اگست 1953 کو مرتب کیا گیا۔ اس کی تخلیق میں 38 ساز استعمال ہوئے ہیں اور اس کے لیے احمد رشدی کوکب جہاں نسیمہ شاہین، اختر عباس، غلام دستگیر، اختر وصی علی نے اپنی آوازوں کے جادو جگائے۔ اس کی موسیقی احمد چھاگلہ نے مرتب کی۔ اس کو بجانے میں کل ایک منٹ 20 سیکنڈ لگتے ہیں اسے پہلی مرتبہ 13 اگست 1954 کو نشر کیا گیا۔

مرسلہ: رضوانہ کوثر۔ کراچی

چندہ

ایک مولوی نے وینا ملک سے مسجد کے لیے چندہ مانگا۔ وینا ملک نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ تو کہتے ہیں میرے پیسے حرام ہیں۔
مولوی نے جواب دیا ان پیسوں سے مسجد کا باتھ روم بنوالوں گا۔

مرسلہ: شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

کب تک

کب تک آخر ہم سے اپنے دل کا بھید چھپاؤ گی
تمہیں راہ پر ایک دن آنا ہے تم راہ پر آہی جاؤ گی
کیوں چہرہ اُترا اُترا ہے کیوں بجھی بجھی سی ہیں آنکھیں
سنو عشق تو ایک حقیقت ہے، اسے کب تک تم جھٹلاؤ گی
سب رنگ تمہارے جانتا ہوں، میں خوب تمہیں پہچانتا ہوں
کہو کب پاس نہ آؤ گی کب تک آنکھ چراؤ گی

شاعر: عبیداللہ علیم۔ پسند: رُقیہ یوسف۔ ڈسکہ

☆☆......☆☆

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

ڈاکٹر معید پیرزادہ

ڈاکٹر معید پیرزادہ جو کرنٹ افیئر کے شوز کے اینکر ہیں پچھلے کچھ دنوں دبئی کے ہسپتال میں

اپنے بے ہوش والد کے انگوٹھوں کے نشانات لیتے ہوئے ہسپتال کے کلوز سرکٹ کیمرے میں پکڑے گئے...... ان کا کہنا تھا کہ وہ کسی بدنیتی کے تحت والد کے انگوٹھوں کے نشانات نہیں لے رہے تھے...... بہر حال اب وہ واپس پاکستان آ چکے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اپنے پروگرام میں جھوٹ اور دھوکا جو سیاست دان ہمیں دیتے ہیں اس کا پردہ کیسے چاک کرتے ہیں۔

امیتابھ بچن کا نیا ٹی وی شو

امیتابھ بچن 72 سال کے ہونے کے باوجود ابھی تک اپنے فینز کے دلوں کی دھڑکن بنے

ہوئے ہیں۔ تب ہی تو فلموں کے علاوہ ٹی وی چینلز پر بھی ان کا نام کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق بہت جلد وہ ایک نئے ٹی وی شو 'آج کی رات ہے زندگی' میں بطور مہمان اپنے مداحوں کو ایک خوبصورت سرپرائز دینے والے ہیں اس ٹی وی شو کے لیے انہوں

نے ایک چینل سے معاہدہ کر لیا ہے اور ان کے مداح نومبر میں اس شو سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔

احمد شہزاد کی شادی خانہ آبادی

احمد شہزاد 10 ستمبر کو رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے لاہور کے ایک مقامی ہوٹل میں اپنے بچپن

کی دوست ثنا مراد کی ہمراہی میں بہت مگن تھے سبز رنگ کی شیروانی اور سفید پاجامہ زیب تن کیے اپنی دلہن جنہوں نے سرخ رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا بہت مسرور دکھائی دے رہے تھے۔ ہماری دعا ہے کہ وہ اس طرح شاد و آباد رہیں۔

شاہد کپور

شاہد کپور اپنی نئی نولی دلہن کو وہ وقت نہیں دے پا

رہے تھے جتنا انہیں دینا چاہیے اور اس کی وجہ ان کی بے پناہ مصروفیات تھیں اپنی آنے والی فلم کے 'شاندار' کے پروموشن میں بزی ہونے کے ساتھ ساتھ جھلک دکھلا جا۔ میں بطور سیلیبریٹی جج نے انہیں مزید مصروف کر دیا تھا لیکن پھر جب خوش قسمتی سے شاندار کا ایک پروموشن جب لندن میں ارینج کیا گیا تو شاہد نے موقعے کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنی دلہنیا کو بھی اپنے ساتھ لندن لے گئے اور یوں اب یہ نیا نویلا جوڑا وہاں کی پرکیف ٹھنڈی فضاؤں میں بہت خوبصورت وقت گزار رہا ہے۔

ایشوریہ رائے کا جذبہ

سابق ملکہ حسن مشہور فلمسٹار اور بچن خاندان کی اکلوتی بہو 41 سالہ ایشوریہ رائے آج کل اپنی

نئے آنے والی فلم جذبہ کے لیے بہت پرجوش دکھائی دے رہی ہیں۔ وہ پانچ سال بعد اس فلم کے ذریعے واپس آ رہی ہیں۔ عرفان خان، ان کے کو اسٹار ہیں۔ حالانکہ انڈسٹری میں ایکٹنگ کے معاملے میں عرفان خان کے سامنے بڑے بڑے آرٹسٹ اپنی ہار مانتے نظر آتے ہیں لیکن جزبہ میں ایکٹنگ کرتے ہوئے عرفان خان ایش سے کافی امپریس نظر آئے۔

نادیہ طارق

اس بار ہم اپنے ''کچن کارنر'' میں کچھ ایسی اشیاء کی تراکیب دے رہے ہیں جن کی بدولت آپ اپنے دوستوں اور عزیزوں کی ایک اچھی دعوت کر سکتے ہیں۔ ہمیں ضرور بتایئے گا کہ یہ اہتمام آپ کو کیسا لگا؟

مزیدار چکن کڑھی

اشیاء:

مرغی......	1/2 کلو
بیسن......	1/4 کلو
دہی......	1/4 کلو
لہسن (پسا ہوا)......	2 کھانے کے چمچے
ادرک (پسا ہوا)......	1 کھانے کا چمچہ
گرم مسالہ......	1/2 کھانے کا چمچہ
پسی ہوئی مرچ......	2 کھانے کے چمچے
ہلدی......	1/2 کھانے کا چمچہ
نمک......	حسب ذائقہ
کارن فلور......	3 کھانے کے چمچے
سفید زیرہ......	1/2 کھانے کا چمچہ
ثابت لال مرچیں......	6-8 عدد
پیاز......	ایک عدد بڑی
ہری مرچیں......	باریک کٹی ہوئیں
ہرا دھنیا......	باریک کٹا ہوا

ترکیب:

پہلے چکن کو دھو کر چھوٹی چھوٹی بوٹیوں کی صورت میں کاٹ لیں۔ پسا ہوا لہسن ادرک' مرچیں' گرم مسالہ اور نمک مرغی پر اچھی طرح لگا کر رکھ دیں۔ ایک دیگچی میں ایک کپ تیل ڈال کر باریک کٹی ہوئی پیاز کو گولڈن براؤن کرلیں۔ اب مسالے لگی چکن پر کارن فلاور چھڑک کر تیزی سے فرائی کریں اور دس سے پندہ منٹ تک گلنے کے لیے چھوڑ دیں۔

اب کڑھی تیار کرنے کے لیے ایک علیحدہ دیگچی میں دہی پھینٹ لیں' پھر اس میں باقی پسا ہوا مسالہ اور بیسن شامل کرلیں اور دو سے تین کپ پانی شامل کرکے پتلا آمیزہ بنالیں اور تیز آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ لکڑی کے چمچے سے مستقل ہلاتی رہیں تاکہ گٹھلیاں نہ پڑیں۔

ابال آنے پر مزید پندرہ منٹ تک چولہے پر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ ہرا دھنیا' ہری مرچیں باریک کاٹ کے رکھ لیں

بگھار کے لیے فرائی پان میں آدھا کپ تیل گرم کرکے اس میں پیاز تل لیں پھر اس میں کری پتا' سفید زیرہ اور ثابت لال مرچ ڈال دیں۔

اب ایک ڈش میں چکن ڈالیں اوپر سے کڑھی ڈالیں اور پھر بگھار ڈال دیں' ساتھ ہی ہری مرچ اور دھنیا بھی چھڑک کر گرم نان یا چاول کے ساتھ سرو کریں۔

بریڈ دہی بڑے

اشیاء:

بریڈ سلائس......	12 عدد
دودھ......	1/2 لیٹر

دہی ...... 1/2 لیٹر
نمک ...... حسب ضرورت
کٹے ہوئے کاجو ...... 2 کھانے کے چمچے
کشمش ...... 2 کھانے کے چمچے
ادرک کٹی ہوئی ...... 1 چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا ...... 2 کھانے کے چمچے
ہری مرچ ...... 2 کھانے کے چمچے
زیرہ بھنا ہوا ...... 1 کھانے کا چمچہ
کوکنگ آئل ...... تلنے کے لیے

ترکیب:

بریڈ سلائس کے کنارے کاٹ لیں' ایک پیالے میں کاجو' کشمش' ادرک' باریک کٹی ہوئی ہری مرچ' باریک کٹا ہوا ہرا دھنیا اور زیرہ پاؤڈر ڈال کر آمیزہ بنا لیں۔ دودھ میں نمک ڈالیں اور ہر سلائس کو اس میں بھگو کر ہاتھ سے دبائیں تاکہ اضافی دودھ نکل جائے۔ آمیزہ ان ٹکڑوں کے دونوں طرف سے لگا کر تیز گرم آئل میں فرائی کر کے نکالتی جائیں۔ (یاد رہے گولڈن براؤن کر کے) اب ڈش میں نکالیں اوپر سے دہی میں ہلکا سا نمک ملا کر اس پھینٹے ہوئے دہی کو سلائس کے اوپر ڈال دیں اوپر سے چاٹ مسالہ اور ہری چٹنی سے گارنش کریں۔ موسم گرما میں یہ ڈش یقیناً آپ کو پسند آئے گی۔

کرسپی بینگن

اشیاء:

بینگن ...... 2 عدد
نمک ...... حسب ذائقہ
چاول پسے ہوئے ...... 2 چائے کے چمچے
آٹا ...... 2 کھانے کے چمچے
سرخ مرچ پاؤڈر ...... 1/2 چائے کا چمچہ
تھائم ...... 1/2 چائے کا چمچہ
چاٹ مسالہ ...... حسب ذائقہ
تیل ...... فرائی کرنے کے لیے

ترکیب:

بینگن کو گول سلائس کی شکل میں کاٹ لیں اور نمک لگا کر ایک طرف رکھ دیں۔
تمام اشیاء کو آپس میں مکس کر لیں اور تھوڑا سا پانی ڈال کر آمیزہ سا بنا لیں۔
ایک فرائی پان میں تیل گرم کریں اور بینگن کے سلائس کو آمیزے میں اچھی طرح ڈبو کر فرائی کریں یہاں تک کہ گولڈن براؤن ہو جائیں۔
چاٹ مسالہ چھڑک کر سرو کریں یقیناً پسند کیا جائے گا۔

پوٹیٹو چکن

اشیاء:

مرغی ...... ایک کلو
آلو ...... ایک کلو
انڈے ...... تین عدد
گھی یا تیل ...... حسب ضرورت
ادرک ...... پچیس گرام
ڈبل روٹی کا چورا ...... حسب ضرورت
سرخ مرچ ...... حسب خواہش
لہسن ...... دس گرام
نمک ...... حسب خواہش
سیاہ مرچ ...... حسب ضرورت

ترکیب:

لہسن ادرک باریک پیس لیں۔ آلو الگ برتن میں ابال لیں۔ آلو چھیل کر اس میں سیاہ مرچ' نمک' ادرک' لہسن ڈال کر مکس کر لیں اور یہ آمیزہ الگ رکھ لیں۔ اب مرغی کے ٹکڑے دھو کر ان پر لہسن' نمک مرچ اور ادرک لہسن کا پیسٹ خوب اچھی طرح مل کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔
اب ایک گھنٹے کے بعد مرغی کے ٹکڑوں پر آلو کا آمیزہ اچھی طرح سے لگائیں۔ انڈے پھینٹ کر ٹکڑے اس میں ڈبوئیں۔ پھر ڈبل روٹی کے چورے میں لپیٹ کر فرائی پان میں تیل گرم کر کے فرائی کریں۔ سنہری ہو جانے پر اتار لیں۔ گرم گرم چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

☆☆......☆☆